سالنامہ مبارک

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

January
2018



☆ ...... دو سلسلے وار ناول ’ریشم کے دھاگے‘ اور ’املتاس‘

☆ ...... ’مسئلہ یہ ہے‘ قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

فون:35893122-35893121-021 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی مٹی پریس 7-OB تالپور روڈ۔ کراچی
زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 65، ایشیا یورپ 55 امریکی ڈالر، رقم بذریعہ منی آرڈر، ٹیلی گرافک منی ٹرانسفر یا بینک ڈرافٹ ارسال کریں



"خبر تو بنتی ہے"

ایسی غیر معمولی اور اہم باتیں جن کا انسانی زندگیوں پر گہرا اثر پڑتا ہو اُن کو خبر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے معمولی اور غیر اہم، باتوں پر کوئی توجہ کیوں دے؟ جیسے کراچی کا موسم بھی آج کل بہت اچھا ہو رہا ہے۔ بادل، بارش، اور ژالہ باری نے اندر اور باہر دونوں موسموں کو دلفریب بنا دیا ہے۔ اب یہ تو خبر بنتی ہے کیونکہ کراچی میں بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، لہٰذا ہر چینل پر سب سے اہم خبر یہی تھی کہ کراچی میں جل تھل، اسی خوشی کے ماحول میں ایک اور بہت حیرت انگیز خبر نظروں سے گزری، امریکہ میں ٹرین پٹری سے اتر گئی، میں حیران ہوں کہ اب اس میں ایسی خاص بات کیا تھی ہمارے ہاں تو ٹرین تو ٹرین ہر چیز پٹری سے اتری ہوئی ہے۔ کون سا ایسا ادارہ ہے، کون سے ایسے ذمہ داران ہیں اور کون سے ایسے رویے ہیں جو پٹری سے اترے ہوئے نہیں ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود میں اب تک نہیں سمجھ پائی کہ ٹرین کا پٹری سے اترنا ایسی کون سی خاص بات ہے بس پھر یہی سمجھ آیا کہ اگر یہ ٹرین پاکستان میں پٹری پر چلتی تو خبر بنتی، امریکن ٹرین کا پٹری سے اترنا اتنا حیرت انگیز ہے۔ جتنا پاکستانی ٹرین کا پٹری پر چلنا...... تو خبر تو بنتی ہے اور اسی خبر کے ساتھ تمام پڑھنے والوں کو میری جانب سے 2018ء کا روشن اور تابناک سورج مبارک ہو۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

☆محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! نئے سال کا نیا' پہلا شمارہ آپ کے پیش نظر ہے.....سال گزشتہ کے' آخری شمارے' طویل کہانی نمبر' کو آپ نے جو بے حد سراہا اور پسند کیا' اس کے لیے ہم دل سے تمام قارئین کے شکر گزار ہیں اور اب آپ کے لیے یہ خبر یا اطلاع کہ سچی کہانیاں کے دیرینہ دوست' سینئر لکھاری سلیم اختر صاحب نے ماہِ جنوری سے شروع ہونے والے انعامی کہانی کے سلسلے سے اپنی کہانیوں کو مستثنیٰ رکھنے کا محبت بھرا حکم صادر فرمایا ہے۔

اور اب آغازِ احوال سے پہلے سالِ نو کی آمد کے حوالے سے سب کے انور مقصود' میرے انو بھائی کی ایک تحریر پیشِ خدمت ہے۔

پاکستان بنے 70 سال گزر گئے لیکن کمبخت ہپی نیو ایئر نہیں آیا۔ ہر سال جانے والے سال سے بُرا اور آنے والے سال سے اچھا گزر جاتا ہے۔ چند مہینے ہوئے ہمارے ایک دوست اپنے ساتھ کسی مستقبل کا حال بتانے والے کو لے آئے۔ انہوں نے ہمارا ہاتھ دیکھا پھر مختلف زاویوں سے ہماری شکل دیکھتے رہے اور پھر ایک کاغذ پر ہمارے مستقبل کے بارے میں کچھ سطریں لکھ کر ہمیں دے دیں۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ''پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں' آنے والے سال کا سورج خوشیاں لے کر طلوع ہو رہا ہے۔'' غرضیکہ ہم کو خوش کرنے والی ساری باتیں اُس کاغذ میں موجود تھیں۔ ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔ ''آج رات آپ کیا کر رہے ہیں؟'' مستقبل کا حال بتانے والے کہنے لگے ''رات کے پروگرام کا ابھی سے کیا بتا سکتا ہوں ابھی تو دوپہر ہے' پتا نہیں کیا پروگرام بنتا ہے۔'' ہم نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ کو اپنے رات کے پروگرام کا پتا نہیں تو ہمارے اگلے سال کے پروگرام کے بارے میں آپ نے کیسے اندازہ لگالیا۔'' ہمارے دوست نے ہمیں ٹوکا کہ یہ بہت بڑے جوتشی ہیں۔ ہم نے اُن سے معافی مانگی اور کہا۔ ''اللہ کرے آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک نکلے۔'' جاتے وقت انہوں نے اپنی فیس جو ڈھائی سو روپے تھی لینے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ نے ہمارا دل دکھایا ہے انشاء اللہ فیس آپ سے سال ختم ہونے کے بعد لیں گے اور ڈھائی سو نہیں بلکہ ڈھائی ہزار۔''

خیر وہ بغیر فیس لیے چلے گئے۔ چند دن پہلے ہم نے اپنے دوست کو فون کیا اور کہا کہ یار آج شام مجھے تم اپنے جوتشی کے پاس چلو مجھے اُن کی فیس دینا ہے کیونکہ نیا سال شروع ہونے میں کچھ دن رہ گئے ہیں مجھے کچھ دہشت سی ہو رہی ہے۔ ہمارے دوست نے کہا اب ذرا مشکل ہے اس کے لیے نہیں لینا کیونکہ جمعرات کو گرومندر پر وہ ٹرک کے نیچے آ گئے۔ ہم نے دریافت کیا کہ کیا اُن کو یہ معلوم تھا کہ وہ ٹرک کے نیچے آ جائیں گے۔ ہمارے دوست نے جواب دیا۔ ''اُن کو تو شاید معلوم نہیں تھا مگر ٹرک والے کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ اُس کو معلوم تھا کہ یہ آدمی ٹرک کے نیچے آ جائے گا......!

اور اب آغازِ احوال...... یہ پہلا خط ہے حیدرآباد سے معروف صحافی' مصنف اور منفرد لکھاری سید سرور ندیم کا' لکھتے ہیں۔ بھائی ناصر رضا! چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد سال کے آخری شمارے طویل کہانی نمبر پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ منورہ نوری خلیق مرحومہ کی منزل کی تعریف کیا کی جائے' اللہ اُن کی مغفرت کے ساتھ درجات بلند کرے' اس کہانی میں ایسا بہت کچھ ہے' جو پڑھنے والے کی عقل اور شعور سے مکالمہ کرتا ہے' کھڑکی میں رکھی آنکھ' دو اقساط پر مشتمل رئیسہ خالد صاحبہ کے اس ناول نے دل کو ملال سے آباد کر دیا سچ اور وہ بھی کڑوا سچ' ہمیں بتا رہا ہے کہ دشمن بھارت کی دشمنی اپنی جگہ افسوس صد افسوس کہ ہم خود بھی تو اپنے دوست نہ تھے۔ 'بخت گزیدہ' ایک ایسی لاجواب زندگی سے جڑی طویل کہانی ہے جو ایک اعلیٰ ناول کی صورت بھی محمد سلیم اختر تحریر کر سکتے تھے۔ 'اندھیرے کا سفر' اچھی ہے مگر عام کے زمرے میں آتی ہے۔ مقدر یوں راکھ ہوا' بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ زندگی کے رنگ گاؤں کے پس منظر میں بہت اچھی تحریر ہے' مہر پرویز دولو اسے اور بھی اچھی تحریر بنا سکتے تھے' اگر سوچنے اور لکھنے کے درمیان فاصلہ کچھ بڑھایا ہوتا۔ 'مسکراہٹ' حسین خواجہ نے بہت ہی خوبصورت خیال بُنا ہے اس تحریر کی صورت جو منفرد ہی نہیں مثالی بھی ہے۔ 'ریشم کے دھاگے' روشانے سبطین کا نام کہانی اور افسانے کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں' منظر نامے اور مکالمے پر ان کی گرفت بہت پکی ہوتی ہے۔ ناول کی پہلی قسط میں بھی انہوں نے یہ کمال دکھایا ہے۔ اب آگے دیکھیے وہ اپنے قارئین کو اور کیا کمال دکھاتی ہیں؟ 'شاہ مراد' تبسم زہرا رضوی پُراسرار کہانی لکھنے کی اسپیشلسٹ ہیں' یہ کہانی بھی چند ناقص مناظر کے قطع نظر انہوں نے اچھی تحریر کی ہے۔ 'املتاس' تاشون جیسے بہترین ناول کے بعد سچی کہانیاں کے لیے شاذلی سعید مغل صاحبہ کی یہ دوسری طویل تحریر ہے۔ پہلی اور دوسری قسط لاجواب رہیں' تیسری قسط ان کے مقابلے میں کچھ کم تھی' اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ میری تمام نیک تمنائیں شاذلی سعید مغل صاحبہ کے ساتھ ہیں۔ جن کی املتاس کا مقابلہ انہی کے تاشون سے ہے۔ دلیس کہانی ایک بہت اچھا معلوماتی سلسلہ ہے۔ اشعار کہانی' سفر کہانی' نمایاں شخصیات' حاصلِ مطالعہ علم اور آگہی ہے۔ جو یقیناً اچھی بات ہے۔ بدیسی کہانی اِس بار بس ٹھیک ہی ہے۔ البتہ 'آواز کی دنیا' معروف علمی شخصیت محمد سلیم اختر صاحب (لاہور والے) کی یادداشت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی' امید ہے کہ وہ آئندہ بھی سچی کہانیاں کے قارئین کو ایسی 'خاص' تحاریر سے نوازیں گے اور اب اجازت سے پہلے آپ کے تمام

قارئین اور سچی کہانیاں کے لکھاریوں کے لیے ایک شعر......

خدا آباد رکھے تم کو پیارے
ہمیں زرخیز کرتے جا رہے ہو

◄ بھائی سرور ندیم' آپ چند ماہ بعد آئے مگر اتنے بھرپور اور بامعنی تبصرے کے ساتھ کمال آئے' کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ہر ماہ اتنے ہی اچھے' بھرپور مکمل تبصرے کے ساتھ احوال میں آئیں......تو پھر کیا خیال ہے...؟

☆ ملک عاشق حسین ساجد مظفر گڑھ سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم' امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ماہنامہ' سچی کہانیاں' ماشاء اللہ اب نکھرتا جا رہا ہے۔ بہت سی تبدیلیاں اسے مزید خوبصورت بنا رہی ہیں۔ آپ جس محنت اور لگن سے اسے تیار کر کے ہم تک پہنچا رہے ہیں' مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ویلڈن سائیں! اس میگزین کو بہت سارے قارئین زیر مطالعہ کیے ہوئے ہیں جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ اس کی بے پناہ مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے خداوند کریم آپ کو اس کی ٹیم کو اور اسے مزید ترقی و دوائمی کامیابیوں کے ساتھ سدا قائم و دائم رکھے آمین ہو سکے تو پُراسرار نمبر کو کم کر کے روحانی نمبر اور دیگر نمبرز شائع کریں۔ موسم اور حالات کے پیش نظر اور منظوم کلام کو بھی نمایاں جگہ دیں۔ تمام سینئرز اور جونیئرز لکھاری خواتین و حضرات کی کاوشیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ آج کل ماشاء اللہ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک جا رہی ہے۔ تمام لکھاری اور مراسلہ نگاروں کی خدمت میں خلوص بھرا اسلام عرض۔

◄ بھائی ملک عاشق حسین ساجد آپ احوال میں آئے دل شاد اور آباد ہو گیا۔ آپ کی تمام تجاویز پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں عمل پیرا ہونے کا بھی وعدہ رہا۔

☆ مسز نگہت غفار کراچی سے شامل احوال ہو رہی ہیں محترم ناصر بھائی' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ معہ فیملی اور اسٹاف بخیر ہوں گے۔ جیسا کہ فون پر آپ نے 'پُراسرار' کہانی کا حکم دیا۔ میں فوراً ہی کہانی لکھنے بیٹھ گئی اللہ رب العزت بڑا ہی مسبب الاسباب اور کارساز ہے۔ 1980ء کی کہانی کو اب 2017ء میں شائع ہونا تھا۔ دیکھیں اُس رب کا کرم مجھے فوراً ہی یاد آ گئی یہ کہانی میں نے کل ہی شروع کر دی تھی حالانکہ طبیعت بہتر نہیں تھی مگر آج تو بہت زیادہ ہی خراب رہی سارا دن' نزلہ' کھانسی' بخار' سارے بدن میں درد' چھینکیں توبہ توبہ...... طبیعت پھر ماشاء اللہ آج' سورۃ مزمل شریف' پڑھوایا دن میں نہیں لکھ سکی اب اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں سب سو رہے ہیں' سوتے سوتے مجھے منع کر کے سوئے تھے۔ امی......اب سو جائیں صبح لکھیے گا...... میں نے کہا کہ ہاں! صبح لکھوں گی اب سو رہی ہوں۔ گر جیسے سب سوئے چپکے سے اُٹھ کر موبائل کی ٹارچ میں لکھ رہی ہوں کیونکہ تہیہ کر لیا کہ یہ کہانی انشاء اللہ تعالیٰ لازمی پوسٹ کروانی ہے۔ آج کل بہت ہی زیادہ پریشانی ہو رہی ہے ڈاک کے سلسلے میں پہلے اسکول جاتی تھی سارے کام خود کرتی۔ اب ریٹائر ہو گئی ہوں اور پھر بیمار بھی زیادہ رہنے لگی ہوں اب زیادہ پیدل نہیں چل سکتی۔ بچے سارے معروف ہیں۔ ماشاء اللہ شادی شدہ کی مصروفیت' الحمدللہ ماشاء اللہ نواسے آج کل میرا یہ کام کر دیتے ہیں مگر وہ بھی مصروف' اسکول' ٹیوشن' کوچنگ' پھر موقع ملتا ہے' نانو کا کام کرنا ہے ارے مما...... بائیک پر بس یوں گئے یوں آئے' لیجیے پُراسرار کہانی 'وہ چہرہ نورانی' پوسٹ ہو گئی ہے۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معہ فیملی' سچی کہانیاں معہ فیملی' کو ہم سب کو اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے حصار میں رکھے۔ سدا کامیاب و کامران رکھے۔ اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین ثم آمین)۔

◄ اچھی بہن مسز نگہت غفار! ہماری تمام اچھی' سچی اور پکی دعائیں آپ کی صحت' زندگی کے حوالے سے آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ اپنے اہل خانہ اور پیاروں کے ساتھ شاد رہیں آباد رہیں۔ وہ نورانی چہرہ موصول ہو گئی ہے۔

☆ نسیم سکینہ صدف بی سکینہ سے شامل احوال ہو رہی ہیں۔ پیارے ناصر بھائی! السلام علیکم! عرصے بعد آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہی ہوں۔ دو کہانیاں حاضر خدمت ہیں۔ ایک میرے بھائی دستگیر شہزادی اور دوسری میری پڑھ کر قریبی شمارے کی نظر کر دیں آپ کے دوبارہ آنے پر بے حد خوشی ہے۔ اللہ پاک آپ کو زندگی کی سچی خوشیاں نصیب فرمائے آمین۔

◄ اچھی بہن نسیم سکینہ صدف! آپ احوال میں آئیں' خوشی ہوئی آپ کی ارسال کردہ دونوں کہانیاں پڑھ کے زیر نظر شمارے کے قارئین کی زیر نظر کر دی ہیں۔

☆ منصور احمد بلوچ میاں چنوں سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ قابل قدر جناب ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! میں یہ امید کرتا ہوں کہ اب آپ بالکل خیر خیریت سے ہوں گے۔ اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بندہ کون ہے۔ ناصر بھائی! میں بھی سچی کہانیاں کا ایک لکھاری ہوں۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے میں نے سچی کہانیاں میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ نہ لکھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ کیونکہ سچی کہانیاں میں صرف چند مخصوص لوگ ہی لکھ سکتے تھے اس کے علاوہ باقی لوگوں کی تحریریں نظر انداز کر دی جاتی تھیں۔ سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ مجھے ملا' ٹائٹل بہت ہی خوب صورت ہے' اس کے علاوہ آپ نے جو تبدیلیاں کی ہیں مطلب نئے سلسلے شروع کیے ہیں۔ یقیناً وہ سب ہی اچھے ہیں۔ اور سب سے زیادہ خوشی مجھے احوال میں شائع ہونے والے خطوط سے ہوئی ہے۔ کیونکہ جتنے بھی خطوط شائع ہوئے ہیں' سب کے سب اصلی خطوط ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں' پیارے احوال ساتھیوں ایم اشفاق بٹ' شاہد رفیق سہو' محمد قاسم خان بلوچ' ایم حنیف' عاصم بلوچ' عامر زمان عامر' عبدالعزیز جی آ' منشی عزیز مے' اور بہت ہی عرصے سے گم ہماری بہن سدرہ انور علی یہ سب لوگ سچی کہانیاں کی نگری میں واپس لوٹ آئیں۔ آپ سب کی اب دل آزاری نہیں ہوگی۔ بلکہ ناصر رضا بھائی خوش آمدید کہیں گے۔ اس شمارے کی سب کہانیاں بہت ہی اچھی لگیں۔ اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

بھائی مقصود احمد بلوچ' جو وقت گزر گیا گزر گیا' بس اب موجودہ وقت کی بات ہونی چاہیے۔ آئندہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ آپ کی پُراسرار کہانی پُراسرار نمبر کا حصہ ہوگی۔

☆ مدیحہ گل تاندلیانوالہ سے شریک احوال ہیں۔ میرا نام مدیحہ گل ہے۔ میں نے یہ کہانی سچی کہانی سے متاثر ہو کے لکھی ہے۔ برائے مہربانی شائع کر کے میری حوصلہ افزائی ضرور فرمایئے گا۔ لکھائی کی غلطیوں کے لیے معذرت......

مدیحہ گل! ہماری پوری کوشش ہوگی کہ تمہاری محنت رائیگاں نہ جائے۔ کا بہتر سے بہتر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھو۔

☆ ارشد اقبال چوہان جڑانوالہ سے شریک احوال ہیں۔ جناب ناصر رضا صاحب' السلام علیکم! ایک ماہ کی غیر حاضری پر شرمندگی میں اضافہ آپ کی فون کال نے کر دیا۔ آپ کی محبتوں کا زیر بار ہو گیا ہوں' شکریہ۔ ابھی تک 'کاغذی تاج محل' کا منتظر ہوں؟ میجر صاحب کا اگر نمبر ہو تو تحریر فرما دیں۔ گوجرہ سے غلام مرتضٰی صاحب تحریر کو پسند کرنے کا شکریہ' دسمبر کا شمارہ بہت دیر سے ملا ہے' نہ جانے کیوں؟ نعمان احمد آرائیں صاحب پہلے 'سچی کہانیاں' میں کہانی' شعر' احوال میں کوئی تحریر بھجوانے کے لیے ٹوکن ضروری تھا۔ ناصر رضا صاحب نے ختم کر دیا ہے۔ اُن کا شکریہ۔ محمد شاہد خان صاحب کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ دسمبر کا شمارے کا سرورق بہت خوبصورت ہے' دیکھ کر پتہ چلا کہ واقعی سردی آ گئی ہے۔ تاریخی کہانی نے بہت مزہ دیا' نمایاں شخصیات کا جواب نہیں اللہ کرے فضل الٰہی ایوب صاحب جیسے لوگ سلامت رہیں۔ اللہ اُن کو اجر عظیم دے۔ آمین' محمد سلیم اختر کی 'بخت گزیدہ' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ 'الماس' کی اٹھان تو اچھی ہے۔ جوانی اس سے بھی انشاء اللہ اچھی ہوگی۔ اور جس کی جوانی اچھی ہو تو بڑھاپا کمال ہوتا ہے' خدارا اُس کے صفحات میں اضافہ فرما دیں۔ آخر میں آپ کی صحت مند زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ تمام احوالیوں کو سلام۔

محترم بھائی ارشد اقبال چوہان صاحب! زیر بار تو ہم بھی ہیں آپ کی محبت اور خلوص کے' میجر صاحب کا 'کاغذی تاج محل' آپ کو ارسال کر دیا ہے۔ اُن کا موبائل نمبر بھی آپ کو سینڈ کر رہا ہوں۔ آپ بہت مصروف رہتے ہیں لیکن احوال میں ایک اچھے تبصرے کے ساتھ آپ کی آمد بھی ضروری ہے۔

☆ نعمان احمد آرائیں جام شورو سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ السلام علیکم! تازہ شمارے میں احوال کی محفل اچھی ہے اور ایسی کوئی بات نہیں جس پر کوئی تنقید کی جائے۔ سب نے شمارے پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔ اس بار میں نے اپنے خط میں شہر کا نام لکھ دیا ہے۔ میں اپنے خط میں تنقید کرتا ہوں یہ تنقید برائے تنقید نہیں اور یہ ایک اچھے ایڈیٹر کی پہچان ہے کہ تعریف ہو یا تنقید وہ کسی کے خط کو شامل کرنے پر کوئی قدغن نہیں لگاتے' اور یہ آپ کی ایک اچھی مثال ہے کہ آپ نے میرے خط کو خود کو اہل ادب ثابت کرنے کے لیے شامل نہیں کیا۔ آخر میں تمام احوالیوں' قارئین اور رائٹر کے لیے



اس ماہ کی چار بہترین تحریریں کون سی ہیں؟

میری نظر میں مندرجہ ذیل تحریریں ترتیب وار انعامات کی مستحق ہیں

پہلا انعام	____________	800روپے
دوسرا انعام	____________	700روپے
تیسرا انعام	____________	600روپے
چوتھا انعام	____________	400روپے

اس انتخاب کا فیصلہ ہم اپنے قارئین کرام کو سونپ رہے ہیں۔ قارئین کی کثرت آراء سے منتخب ہونے والی اُن چار کہانیوں کے نتائج آئندہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے اور اُنہی کے مطابق قلم کاروں کو انعامی رقم ارسال کر دی جائے گی۔ یہاں ہم ایک بار پھر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ معاشرے کے عکاس قلم کار بے زبانوں کی زبان اور صداقت کے ترجمان ہوتے ہیں' ہم ان کا قرض ادا نہیں کر سکتے تاہم یہ انعامات صرف تکمیل فرض کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے اور اس کا مقصد نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تکمیل فرض کی اس کوشش میں آپ مندرجہ ذیل ٹوکن بھر کر ہمارا ہاتھ ضرور بٹائیں گے۔

یہ ٹوکن صرف جنوری 2018 کے لیے ہے' ڈاک سے بھیجنے کی آخری تاریخ 10

مندرجہ بالا ٹوکن پُر کرنے کے بعد کاٹ کر بھیج دیجیے' سادہ کاغذ پر بھیجی جانے والی آراء شامل نہیں ہوں گی۔

88-C II First Floor,Khayaban-e-Jami Commercial D.H.A Phase # 7
Defence Housing Authority Karachi. Ph: 021-35893121-35893122

سلامتی‘ خوشحالی‘ تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز واقارب اس دنیائے فانی سے پردہ کر چکے ہیں ان سبھی کے لیے دعائے مغفرت اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

نعمان احمد آرائیں! مجھے آئندہ بھی ایک بہت اچھے تبصرے کے ساتھ آپ کی احوال میں آمد کا انتظار رہے گا۔ آپ کی زندگی اور صحت کے لیے بے شمار دعائیں۔

☆ حجاب فاطمہ حجاب کراچی سے احوال میں شریک ہورہی ہیں۔ ناصر بھیا! السلام علیکم! سب سے پہلے تو تمام قارئین اور سچی کہانیاں کے تمام اراکین کو سچی اور پکی دعائیں‘ بہت عرصہ بعد اپنے عزیز شمارے کی یاد ستائی تو ہاکر سے التجاء کی کے ہمیں شمارہ لا دے‘ اور یوں بہت عرصہ کے بعد اپنے پیارے ماہنامے کو دیکھ کے نہ پوچھیے کتنی خوشی ہوئی‘ ساتھ ہی خوشی مزید بڑھ گئی جب اپنے پیارے بھائی کو احوال میں دوبارہ پایا (واضح رہے یہ پایا وہ پایا نہیں جو ناشتہ میں تناول کیا گیا تھا‘ ہاہاہا) خیر ابھی تو لیٹ ہونے کے ڈر سے میل کر رہی ہوں اور شمارہ بھی زیر مطالعہ ہے‘ اگر حاضری لگ گئی تو نصیب آوری ہوگی‘ اس بار ایک انتخاب اور ایک اپنی نظم ارسال کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرہ یک ساتھ آؤں گی زندگی رہی تو......

حجاب فاطمہ حجاب! ایک عرصے بعد ’احوال‘ میں تمہاری آمد پر جی خوش ہوگیا۔ دیکھو تمہاری حاضری لگ گئی ہے احوال کے رجسٹر میں اب غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری زندگی‘ صحت اور کامیابی کے لیے اس جہاں کی سب اچھی دعائیں۔

☆ ایم حسن نظامی قبولہ شریف سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ قابل قدر ناصر رضا جی! امید ہے آپ اور اسٹاف سچی کہانیاں خیر خیریت سے ہوں گے۔ آپ کے حکم کی روشنی میں ایک تحریر حاضر خدمت ہے۔ معیاری ہو اور پسند آئے تو سچی کہانیاں کے سنہری صفحات کی زینت ضرور بنایئے گا۔ میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔ اور شاید جذبات اور الفاظ کے فن سے بھی ناآشنا‘ آپ نے اس قابل سمجھا اور پذیرائی دی جس کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ گزارش ہے کہ مٹی پہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے سے تصویر بن جائے تو بندہ مصور نہیں کہلا سکتا‘ کہانی کے ہر کردار کے جذبات واحساسات اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے لفظوں کو مختلف پیراگراف میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے والا ہی رائٹر کہلاتا ہے پھر وہ اپنے تجربے سے ہوا سے ہوا میں ہوا لکھا دکھا سکتا ہے اور یہ نجانے کتنے جان جوکھوں اور محنتوں کا کام ہے۔ میں اپنی اس محبت بھری کہانی کے ساتھ آپ سبھی کو نئے سال کی مبارکباد دے رہا ہوں‘ بہت سے چہروں کے جذبات کی عکاسی لفظوں کی ادائیگی کی ہے؟ اور میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا؟ فیصلہ آپ پر منحصر ہے۔ ساتھیو! محبت بہتے ہوئے پانیوں کی طرح بے ثبات نہیں ہوتی اور نہ ہوا کی طرح اپنی سمتیں بدلتی ہے۔ وہ تو بہار میں کھلنے والے اس اولین شگوفے کی مانند ہوا کرتی ہے۔ جو تاقیامت صحن دل میں مہکتا رہتا ہے۔ اپنی ابدی مہک سے دلوں میں چاہتوں کے پھول کھلاتا رہتا ہے‘ میرا پیغام محبت ہے ان ساتھیوں کے لیے جو ایک ہی جگہ اندھا

دھند اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی منزل سمجھ لیتے ہیں اور دوسرے کسی کے جذبات اور سوچ کا ذرہ بھر احساس نہیں کرتے حالانکہ وہ بنا اظہار کے بھی آپ کو بے پناہ چاہتوں‘ الفتوں اور محبتوں سے پیش آتا ہے۔

بھائی ایم حسن نظامی‘ احوال میں آپ کی آمد ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ آپ اچھا لکھتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ بہت منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔ آپ کی یہ محبت بھری کہانی بہت اچھی ہے‘ اور اسی لیے ہم نے اسے ماہ مارچ 2018ء میں سچی کہانیاں کے محبت نمبر کے لیے ابھی سے منتخب کر کے رکھ لیا ہے۔ آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد اور نئی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔

☆ عمارہ عبید چیچہ وطنی سے شریک احوال ہو رہی ہیں۔ انکل ناصر! احوال میں یہ میری پہلی حاضری ہے۔ امید ہے آپ سمیت محفل کے سبھی لوگ میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ انکل میں پُراسرار کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سچی کہانیاں کے سال میں تقریباً چار شمارے پُراسرار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں مجھے بہت پسند ہے۔ کہانیوں کے علاوہ اس کے سارے سلسلے اچھے ہیں خاص کر آپ کی ڈائری تو بہت ہی اچھی ہے۔ انکل میں ایک پُراسرار کہانی لکھ رہی ہوں اگلے تبصرے کے ساتھ بھیج دوں گی امید ہے فروری کے پُراسرار نمبر میں شائع ہو جائے گی۔ معاشرے کی اجتماعی اصلاح کے لیے زندگی کے رنگ جیسی کہانیاں سود مند ثابت ہوں گی‘ وہ لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں جو اپنی خوشیاں دوسروں کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ ’ریشم کے دھاگے‘ یادگار تحریر ہوگی۔ ’بخت گزیدہ‘ بھی بہت اچھی لگی۔

عمارہ عبید! محفل احوال میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید‘ آپ کی پُراسرار کہانی کا انتظار ہے۔

☆ اسماء غفور چیچہ وطنی سے شریک محفل ہو رہی ہیں۔ انکل ناصر اور تمام احوالی میرا آداب قبول فرمائیں۔ تین چار ماہ بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ انکل آپ کا پیغام چاچو غفار مسلسل دیتے رہے‘ مگر کچھ گھریلو اور اسکول کی مصروفیات ایسی تھی کہ کوشش کے باوجود بھی نہ لکھ سکی۔ آپ کی محبت کو سلام شاید اس بار بھی آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو پاتی مگر بھائی نعمان احمد کے سوال کے جواب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں‘ قابل احترام بھائی نعمان میرا مقصد مردوں کی کردار کشی اور غیر ضروری تنقید نہیں تھا غیر ضروری تنقید وہ تلوار ہے جو سب سے پہلے خوبصورت تعلقات کا سر قلم کر دیتی ہے عین ممکن ہے کہ آپ حق پر ہوں‘ پر حقیقت کون جھٹلا سکتا ہے چاروں طرف کے راستے بند ہوں تو تاریک گلیوں میں راستے کی تلاش عورت کی مجبوری بن جاتی ہے اور حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی عورت کی مجبوری ٹھہری‘ یقین نہ آئے تو حسین خواجہ کی ’مسکراہٹ‘ پڑھ لیں۔ عظیم مردوں کی بات کریں تو آج بھی بہت سے محمد بن قاسم ہمیں ملیں گے‘ تصدیق کے لیے مہر پرویز کی زندگی کے رنگ‘ کافی ہے۔ تفصیل میں نہیں جانا چاہتی صرف اتنا بتا دیں بھائی کہ جس طرح آپ اپنی مرضی کی زندگی

گزار رہے ہیں کیا آپ کی بہن کو بھی وہی زندگی گزارنے کا حق ہے؟ آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ بہن مریم شادی مبارک ہو نئے سفر کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ اچھی بھتیجی اسماء غفور! احوال میں تمہاری آمد ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تم آئندہ بھی اپنی آمد کا سلسلہ برقرار رکھو۔

☆ عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے شریک محفل ہو رہے ہیں محترم ناصر رضا اور عزیز بہن بھائیو آپ سب کو میرا خلوص بھرا اسلام اور ڈھیروں دعائیں' ساتھیو انسانی زندگی رشتوں سے بندھی ہے اور رشتوں کی ڈور ردیوں سے بھی غور کیا ہم نے ہمارا رویہ دوسروں کے ساتھ کیسا ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں سے ملنے میں تمام زندگی صرف ہو جاتی ہے اور خود سے کبھی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔ نیا سال شروع ہو رہا ہے آئیں عہد کریں دوسروں کی اصلاح سے پہلے ہم اپنی اصلاح کریں گے' اگر ہم انفرادی طور پر اپنی اصلاح کا تہیہ کرلیں تو پورے معاشرے کو مثبت نہج پر ڈال سکتے ہیں۔ باجی منزہ کے اداریے نے پھر دکھی کر دیا' ماؤں کے لخت جگر محفوظ اور پرامن پاکستان کے لیے اپنے لہو سے جو عظیم تاریخ لکھ رہے ہیں اس پر پوری قوم کو فخر ہے ان کی شہادتیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ بھائی نعمان احمد یہ حقیقت ہے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ڈائجسٹ چھپتے ہیں اور ہزاروں ابدی نیند کے حوالے ہو جاتے ہیں وجہ سفارش اور تعلقات ہوتی ہے۔ سچی کہانیاں سے پرانا تعلق ہے اس کی پالیسی میرٹ اور معیار کو برقرار رکھنا اور اس کا منشور محبتیں تقسیم کرنا ہے' اصلی اور نقلی کی نشاندہی ہم سب کا فرض ہے کیونکہ اس کی بقا ہمیں عزیز ہے۔ میری رائے غلط ہو سکتی ہے۔ پر سسٹر ام مناہل کی رائے کو کیسے جھٹلائیں گے۔ بھائی ملازم حسین شیرازی شور کھلاڑی نہیں تماشائی کرتے ہیں آپ کے تبصرے کی تعریف کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہے' دولت کی خاطر ہم اتنے گر چکے ہیں کہ رشتوں کے تقدس اور اخلاقیات کو بھول بیٹھے ہیں ہر کوئی دولت کے لالچ میں اندھا ہو چکا ہے لیکن یاد رہے دولت سے ہم گدے تو خرید سکتے ہیں نیند نہیں' عینک تو خریدی جا سکتی ہے لیکن نظر نہیں' دولت سے ہم جسمانی راحت کا سامان تو خرید سکتے ہیں مگر قلبی و روحانی سکون و اطمینان نہیں خرید سکتے۔ محترم سلیم اختر نے اس موضوع پر بہت جاندار تحریر بخت گزیدہ' لکھی اسی طرح مہر پرویز نے اپنی تحریر 'زندگی کے رنگ' میں معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اگر کچھ حاصل کرنا ہے یا کر کے دکھانا ہے تو ہم اپنا مقصد کا تعین کریں اور پھر خود کو اس کے حوالے کر دیں یہی قدرت کا عظیم منصوبہ ہے۔ مہر پرویز نے اپنی تحریر میں انسانیت کو زندہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ م ن رخ کی منزل نے بھی بہت متاثر کیا۔ کسی کو بھولنا آسان نہیں ہوتا' بعض اوقات خود کو بھول کر کسی کو بھولنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اپنا آپ بھول گیا اور صرف کوئی اور اپنے آپ میں رہ گیا ہے۔ محمد سلیم اختر صاحب نے ریڈیو کی اہمیت پر روشنی ڈالی بہت اچھا لگا۔ ذرائع ابلاغ میں ریڈیو ایسا میڈیم ہے جس کی اس جدید ترین دور میں اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید بڑھی ہے کیونکہ یہ ایک

سمعی ذریعہ معلومات ہے جو نظری کام سے توجہ ہٹائے بغیر سننے والے کو اپ ڈیٹ دینے میں مدد کرتا ہے 1965ء کی جنگ میں ملکہ ترنم نور جہاں کا ہر گانا ریڈیو کے ذریعے ہی فوجیوں نے سنا ان میں قابل ذکر 'اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے' کرن شبیر کی تحریر 'اندھیرے کا سفر' کمال کی تحریر تھی دنیا میں آنے کا مقصد ہم بھول چکے ہیں۔ زندگی کا اصل مقصد اجتماعی سوچ ہے مگر ہم نے انفرادی سوچ سے اپنے لیے پریشانیاں پیدا کر لی ہیں ہمارے کردار دوسروں کے لیے عذاب بن رہے ہیں اس کی وجہ ہم میدانِ عرفات والا پیغام بھلا بیٹھے ہیں اندھیروں کو روشنی میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم میدانِ عرفات والا سبق یاد کریں۔ ریشم کے دھاگے کی پہلی قسط پڑھ کر خوشی ہوئی امید ہے اس کی ہر قسط سسپنس سے بھرپور ہوگی۔ شازلی سعید مغل کی سلسلے وار تحریر الماس بہت متاثر کر رہی ہے۔ اس پر یہی لکھا کافی ہے۔ چلتے ہوئے منزل کی بابت پوچھتے ہوئے ہمیں بدگمان مت کر دو یہ تو منزل پر پہنچ کر ہی معلوم ہوگا کہ ہم کہاں جانا چاہتے تھے۔ زین شمسی نے ایمان تازہ کر دیا' شمیم احمد نے محمد ایوب فضل الٰہی سے ملاقات کرائی بہت اچھا لگا' شبینہ فراز نے وادی بگروٹ کی سیر کرائی شکریہ آپ کی ڈائری میں ہر کسی نے اچھا لکھا۔ انعامی سلسلے سے سچی کہانیاں کی مقبولیت بڑھے گی' ناصر بھائی یہ تو آپ کا بڑا پن ہے جو نا چیز کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور بے ترتیب جملوں کو پسند کرتے ہیں' اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ ہم سب کو زندگی کی تمام خوشگوار مسرتیں ایمان اور صحت کے ساتھ عطا فرمائے آمین۔

◆ بھائی عبدالغفار عابد! گہرائی اور گیرائی سے آراستہ آپ کا تبصرہ اچھا لگا...... آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اور ہاں اس بار آپ کے خط میں کوئی شعر شامل نہیں...... حیرت ہوئی؟ سو اب ایک شعر میری طرف سے آپ کے لیے......

بزم میں حشر اک بپا ہے
یہ کون آئینہ رکھ گیا ہے

☆ ڈاکٹر فرمان بھٹی' منڈی صادق گنج سے شریک احوال ہیں۔ ناصر انکل' سلام! اس بار شمارہ کافی دیر سے ملا پر جب ملا تو سبھی گلے شکوے دور ہو گئے' طویل کہانی نمبر زبردست رہا' مسکراہٹ بخت گزیدہ شاہ مراد' کھڑکی میں رکھی آنکھ' منزل' مقدر یوں راکھ ہوا' آواز کی دنیا' وہ کہانیاں ہیں جن کو میں نے بار بار پڑھا' دونوں ناول بھی خوب رہے' آپ کی ڈائری جو کہ دراصل ہماری ڈائری ہے کے تمام مراسلات اپنا ثانی نہیں رکھتے' خطوط کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ کچھ لوگ انتشار پھیلاتے ہیں' محفل کے ماحول کو خراب کرتے ہیں آپ اِس چیز کا ذرا خیال رکھا کریں۔

◆ فرمان بھٹی صاحب! طویل کہانی نمبر آپ کو پسند آیا شکریہ' احوال میں خطوط کی اشاعت کے حوالے سے میں بس یہ خیال کرتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

☆ بارش علی ثمیر چک جیوے والا سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر جی! آداب! سچی

کہانیاں ملا واہ بھئی واہ کیا کہنے' آپ نے تو کمال ہی کر دیا' اس بار آپ نے رسالے کو ناول کی شکل دے دی ہے' میڈم منزہ سہام کے اداریے سے لے کر بدلتی کہانی تک کا سفر بہت ہی اچھا رہا اور آپ کی ڈائری کا اسٹاف تو ایک منفرد اسٹاپ تھا۔ ریشم کے دھاگے اور الماس دونوں کی شروعات اچھی رہی اور انجام بھی اچھا ہی ہوگا۔ احوال کی محفل بھی خوب سجی ہوئی تھی ایک سے ایک تبصرہ تھا شاہد صاحب کے لیے دل سے دعا اور عثمان جامی کو شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد۔

◆ بارش علی ثمیر! آپ کو طویل کہانی نمبر پسند آیا ہماری محنت وصول ہوگئی۔ آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ ماسٹر طاہر مقصود ہاشمی پہلی بار مٹھن آباد سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ عزیزم ناصر رضا' السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ تمام احباب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ماہ دسمبر کا طویل کہانی نمبر ملا جو کہ آپ کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت تھا' محترمہ منزہ سہام صاحبہ نے بہت خوب فرمایا۔ "میں بھی ماں ہوں" محترمہ کے الفاظ میں بہت تاثیر تھی ماں کی ممتا کے اندر زندگی کے سبھی رنگ ہیں۔ احوال میں اگر احوالی برادرز کا ذکر کیا جائے تو سبھی خوب سے خوب تر تھے خواجہ حسین کی کہانی 'مسکراہٹ' بہت پسند آئی اس کہانی میں انہوں نے معاشرے کے ایک خاص مسئلے کی نقاب کشائی کی ہے' عورت کے اندر کے کرب اور دکھ کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ بہن ردشا نے سبعین کی کہانی 'ریشم کے دھاگے' بہترین سلسلہ ہے۔ بہن کرن شبیر کی کہانی 'اندھیرے کا سفر' بہترین کہانی تھی' باقی کہانیاں پڑھ کر اگلے ماہ تفصیلی تبصرہ کروں گا۔ جناب سرور شاز صاحب عبدالحکیم ساجد اور بابر نایاب کے ساتھ بہت پرانا یارانہ ہے' ان اہلِ ادب کے ساتھ میری محفل اکثر جمتی رہتی ہے' اور انہی احباب کے پرزور اصرار پر ہی میں حاضر ہوا ہوں' یقین جانیں تمام احباب آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں' ناصر رضا صاحب' ویسے تو مطالعہ کا شوق مجھے زمانہ طالب علمی سے ہی ہے اور اس وقت میں عمر کے اُس حصے میں ہوں جہاں بندہ ہر چیز سے فراغت چاہتا ہے ماضی کے اوراق کو اگر گردانا جائے تو پتا چلتا ہے کہ میں بھی چند مشہور جریدوں میں لکھتا چلا آیا ہوں' آداب عرض میں کئی سال ناقابل فراموش کے عنوان سے لکھا' آئینہ میں لکھا' کونل میں بھی کچھ تحریریں لگیں اور سچی کہانیاں میں بھی لکھا جس کو قارئین نے بہت پسند کیا' خواجہ حسین کی بیشتر تحریریں میرے پاس نظر ثانی کے لیے آئیں جن کی نوک پلک کو سنوارا اِس دوران میں نے خواجہ حسین کو بتایا کہ میرے پاس ایک عدد ناول تحریر کی شکل میں موجود ہے جس کو میں اپنی بیماری اور مالی وسائل کی وجہ سے نہیں چھپوا سکا۔ ناصر رضا صاحب میری تحریر آپ کے شمارے کے معیار پر پوری اترے گی۔ انکار کرنے سے پہلے اتنا ضرور یاد رکھیے گا کہ بہت پُرامید ہو کر خط لکھ رہا ہوں۔ یہ ناول میں نے آج سے 5 سال پہلے لکھا تھا اور سوچا تھا جب ریٹائر ہوں گا تو اپنی پنشن سے شائع کرواؤں گا' لیکن اچانک مجھے دل کا مرض لگ گیا تو کچھ پیسے ہارٹ بائی پاس پر لگ گئے اور کچھ پیسے مکان پر لگا دیے تا کہ میرے بعد

بچوں کو کوئی مسئلہ نا ہو' کم از کم بچوں کے لیے چھت تو ہونی چاہیے۔ عرض یہ ہے کہ جتنے صفحات پر آپ مجھے حکم دیں گے میں کمپوز کروا کر بھیج دیا کروں گا' اپنے مسائل اور وسائل کے پیش نظر میں پوری تحریر نہیں بھیج سکتا۔ اور آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ میرے تبصرے میں بہت سی کمی رہ گئی ہے لیکن آپ محبت کی نظر سے یہ کمی دور فرمائیں گے آپ کے مثبت جواب کا طالب ہوں۔

محترم طاہر مقصود ہاشمی صاحب! آپ احوال میں آئے دل شاد اور آباد ہو گیا۔ سرور شاز' عبدالحکیم ساجد اور بابر نایاب صاحب خود بہت اچھے ہیں' اس لیے دوسروں کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ اپنے ناول کی دو تین اقساط تو ارسال کریں۔ 'الماس یا ریشم کے دھاگے' دونوں میں سے جس کا بھی پہلے اختتام ہو گا میں آپ کے ناول کا آغاز کرنا چاہوں گا۔

☆ حسین خواجہ منچن آباد سے شریک احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! جناب عالی! اس بار شمارہ چھ تاریخ کو ملا سب سے پہلے تو میری کہانی کی اشاعت کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ' یہ سب آپ ہی کی محبت ہے ورنہ میں اس قابل کہاں رب کریم آپ کو سلامت رکھے تا قیامت رکھے آمین ثم آمین۔ ناصر صاحب آپ نے دو نئے سلسلے شروع کیے ہیں جو کہ لاجواب ہیں اور ہو بھی کیوں نا آخر باکمال رائٹرز نے قلم بند کیے ہیں محترمہ روشانے سعین صاحبہ ایک مشہور نام ہے اور بہن شازلی سعید مغل صاحبہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتیں' اب سمجھ آیا جن لوگوں کے نام میں 'ش' آتا ہے وہ باکمال ہوتے ہیں' جبھی تو دونوں سلسلے 'ش' نام سے شروع ہوئے ہیں' رب کریم مزید ترقی عطا فرمائے آمین' اچھا جی اب آتے ہیں اس ماہ کی شاندار و جاندار کہانیوں کی طرف تو جی پہلی کہانی ہے بہن رئیسہ خالد کی 'کھڑکی میں رکھی آنکھ' جو کہ ماہ دسمبر کی خصوصی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ لاجواب بھی تھی' بہن اتنی اچھی کہانی لکھنے پر بہت بہت مبارکباد' جناب سلیم اختر صاحب کی 'بخت گزیدہ' بہت اعلیٰ' بہن کرن شبیر صاحبہ 'اندھیرے کا سفر' اچھی کاوش تھی۔ بہن حنا بشریٰ کی تحریر 'مقدر یوں راکھ ہوا' سو میں سے سو نمبر کی حقدار رہی۔ آپ کی ڈائری میں تمام انتخاب پسند آئے۔ عورت کے نام سے میں نے اپنی سوچ قلم بند کی تھی' جس کو آپ نے جگہ عنایت فرمائی' شکریہ' احوال کی محفل میں کبھی بہت اچھا لکھتے ہیں' میرے علاوہ نعمان احمد شروعات آپ نے علی انصاری سے کی ہے' اور کہا ہے کہ ہائیڈ پارک ہو یا آپ کی ڈائری ایک ہی بات ہے یہ سوچ کے دو الگ انداز ہیں۔ میں اس پر بس اتنا کہنا چاہوں گا اگر تم نے شمارے پر تبصرہ کیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا اب اگر تم کو کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تو اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟

بھائی حسین خواجہ! آپ کتنے قابل ہیں شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے...... آئندہ بھی آپ کی کہانیوں کا انتظار رہے گا۔

اور اب اجازت سے پہلے' نئے سال کی آمد اور بیتے ہوئے برس کے حوالے سے نوجوان شاعر

اشعر جواد کی ایک دل سے مکالمہ کرتی نظم آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت میں ہے۔

بیتے برس کا نوحہ

اب کہاں اتنی فرصت کہ
بیتے برس کا نوحہ لکھوں!
دل گرفتہ حادثوں کے
تسلسل کو میں'
ماضی کا سم لکھوں'
گزشتہ تلخی ایام کو
مقدر کا جام جم لکھوں'
اب کہاں وہ حوصلے کہ
مجروح انا کی تیرگیوں میں
دل جب سوختہ ہوا تو
کتنے ستارے آنسو
کی صورت بکھر گئے
خواب کتنے چٹخ گئے
کتنے مہرباں
اس نزع میں
بٹ گئے
مرے غم خوار کتنے
ان پُر پیچ راہوں سے
ہٹ گئے
مگر میں
ذات کی تمام 'سچائیوں' کے ساتھ
اپنی جگہ ابھی تو
استقامت پذیر ہوں
اس انتظار میں کہ
کبھی جو فرصت ملے تو
میں بیتے دنوں' بیتے برس کا
نوحہ لکھوں!

پھر ملیں گے گر خدا لایا
ناصر رضا

تاریخ کہانی

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

دخترِ کاہن

(حصہ اول)

[illegible]

> اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
> سوغاتِ عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

''دیکھو! وہ سامنے کوہِ سینا جسے کوہِ طور بھی کہتے ہیں۔'' لاوی بن یعقوب کے خاندان کے معزز عالم ابراہیم بن کالب نے بلند ترین چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی ایش بن کالب



سے کہا۔ ''یہی وہ بلند ترین پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا نے انہیں شریعت عطا کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔ میں جب پہلی بار بابا جان کے ساتھ یہاں آیا تھا' تب بھی اس پہاڑ کے بالائی حصے کو بادلوں نے یونہی ڈھکا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ بابا جان نے اپنے بزرگوں سے اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چلہ کیا تھا۔ یہیں وہ اپنے خدا سے باتیں کرتے تھے اور یہی چوٹی ہے جہاں ان کی ضد پر خدا نے اپنا جلوہ دکھایا مگر وہ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے اور وہی حصہ مسلسل بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔''

ابراہیم بن کالب نے یہ سب ایک ہی سانس میں خوشی سے مرتعش آواز میں یوں کہا جیسے یہاں آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو اور اس وقت وہی نہیں بلکہ خود ایش بن کالب بھی بڑی حیرت' عقیدت اور خوشی سے اس پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جس سے ہزاروں داستانیں وابستہ تھیں۔ ابراہیم بن کالب نے دھیرے سے اعتراف کے انداز میں کہا۔

''ایش' میرے بھائی! تمہارے ساتھ اتنا طویل سفر کرنے کے لیے میں رضامند ہی اس لیے ہوا تھا کہ تم اس طرف سفر کر رہے تھے ورنہ یوں مسلسل سفر کرنا آسان بات نہیں ہے۔''

اس وقت ایش بن کالب نے اسے تائیدی نظروں سے دیکھا۔ ان دونوں نے بہت کم قیام کے بغیر یہ سفر کیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک رات گزارنے کی تمنا اسے بھی تھی لیکن ابراہیم کے دل میں مچلنے والی تمنا کو وہ بہت حد تک جانتا تھا اور اسی وقت خود ابراہیم نے بھی دھیرے سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے' یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب سے جو مانگو' وہ ضرور ملتا ہے۔'' اس کے لہجے میں عجیب اشتیاق تھا' عجیب آس تھی۔ ایش بن کالب محسوس کیے بغیر نہ رہا۔ اس نے کہا۔

''موسیٰ کے رب سے جہاں بھی مانگو' وہ ضرور دیتا ہے۔''

''مگر میرا اعتقاد جگہ پر بھی ہے اور آج کی رات میں وہ سب کچھ مانگنا چاہتا ہوں جس کی مجھے آرزو ہے۔'' ابراہیم بن کالب نے اپنے اندر مچلتی ہوئی تمناؤں کو محسوس کیا۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا کہ پہلے کیا مانگے' منصب یا اولاد؟

وہ دونوں بھائی تھے مگر ان کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ ابراہیم بن کالب کی عمر پینتیس سال تھی اور ایش بن کالب کی عمر بیس سال مگر عمروں کے اس فرق کو نظر انداز کر کے ان دونوں میں بھائیوں والی چاہت بھی تھی۔ باپ بیٹے والا احترام بھی اور دوستوں والا پیار بھی۔ بات نفع کی ہوتی یا نقصان کی' خوشی کی ہوتی یا غمی کی' وہ ایک دوسرے سے ہی کرتے تھے اسی لیے ایش بن کالب ان محرومیوں سے بھی واقف تھا جن کا اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ ابراہیم بن کالب' لاوی بن یعقوب کے خاندانی رواج کے مطابق خود کو علم کے لیے وقف کر چکا تھا اور ایش بن کالب ایک تاجر تھا اسی لیے اس بار کوہِ سینا کی طرف سفر کرتے ہوئے ابراہیم نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں قیام کر کے مرادیں مانگ کر انہیں واپس ہونا تھا اور تجارت بھی واپسی میں ہی کرنا تھی۔

بیت المقدس کی نئی تعمیر کے بعد اس قوم نے اسے اپنی تہذیب کا مرکز بنا لیا تھا اور اس مقدس گھر کی کہانت کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم ہو چکا تھا۔ بنو اسرائیل بارہ قبائل میں منقسم تھے جن میں گیارہ قبیلے زندگی کے لاتعداد شعبوں میں دیگر امور کی انجام دہی کے لیے مخصوص تھے لیکن ''بنی لاوی'' صرف اور صرف بیت المقدس کی کہانت کا ذمے دار تھا۔ یہ لاوی بن یعقوب کا خاندان تھا۔ ابتدا سے اس مقدس گھر کا کاہن صرف اسی خاندان سے چنا جاتا تھا جو تمام مذہبی رسمیں ادا کرتا' قوم کو برائی سے روک کر نیکی کی طرف راغب کرتا' مذہبی معاملات کی نگرانی' وقف بچوں کی پرورش' مقدموں کے فیصلے سناتا' انصاف کرتا' بیت المقدس کے خاص حصے میں جا کر بخور جلاتا اور دعائیں کرتا۔ الغرض اس کی حیثیت ایک قاضی یا جج کی سی ہوتی یا ایک باپ اور نگہبان کی۔

بنو اسرائیل اس کاہن پر اندھا اعتماد کرتے تھے

یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی اس کی تعظیم کرتا تھا۔اس ساری خدمت کے بدلے میں یہ کاہن ان سے کچھ بھی نہ لیتا بلکہ اپنی روزی خود کماتا' ساری قوم سے زیادہ سادہ زندگی گزارتا۔قوم اس منصب اور عہدے کے لیے بنی لاوی کے جلیل القدر علماء کو منتخب کرکے ان میں سے ایک کو چننے کے لیے باقاعدہ قرعہ اندازی کرتی۔ اس وقت تمام علماء موجود ہوتے' جس کے نام قرعہ نکل آتا' اسے اپنا کاہن مان لیتے۔ایسے میں بنی لاوی کا ہر جوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرکے خود کو اعلیٰ ترین ثابت کرنا چاہتا تھا اور جو خود یہ منصب نہ پاسکتا' اپنے بیٹوں کے لیے کوشاں رہتا۔اس زمانے میں بنی لاوی کے خاندان کا بڑا بیٹا خود کو حصولِ علم کے لیے وقف کردیتا تھا تاکہ یہ منصب پاسکے اور ابراہیم بن کالب بھی اس خواہش سے بے نیاز نہیں تھا۔ بیت المقدس کا کاہن بننا معمولی بات نہ تھی مگر وہ بنی لاوی کے علماء میں سب سے کم عمر سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس کے کاہن بننے کی امید لوگوں کو بہت کم تھی پھر بھی اس رسم کی ادائیگی سے پہلے ان دونوں کو واپس بیت المقدس پہنچنے کی آرزو تھی مگر چونکہ ان کے پاس وقت کی فراوانی تھی' وہ باآسانی اس تجارتی سفر سے واپس جاکر اس رسم میں شریک ہوسکتے تھے۔

ان دونوں کا ایک ہی گھر تھا اور لگتا تھا کہ ان دونوں کی بے پناہ چاہت ان کی بیویوں میں بھی منتقل ہوگئی تھی۔ابراہیم بن کالب کی بیوی حمنہ' اولاد کے سوا ہر نعمت سے مالا مال تھی۔اپنی تیس سالہ زندگی کا ہر لمحہ اس نے خوش رہنے اور خوش رکھنے میں گزارا تھا۔گھر میں ہوتی یا بیت المقدس جاتی' دوسروں کے لیے ہی طلب کرتی لیکن ان سب اوصاف کے باوجود تنہائیوں کے لمحوں میں کسی ننھے منے وجود کی تمنا پر قابو نہ پاسکتی۔یوں برسوں گزر گئے' تب ایش بن کالب کی نوعمر بیوی زلیخا نے ہنستے ہوئے لاثان بن ایش کو اس کی گود میں ڈالا تو اسے لگا کہ یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔ اب لاثان اس کا تھا اور جب موسیٰ کے رب نے ایش اور زلیخا کو ایک اور بیٹے ہاران سے نوازا تو ان کا تعلق کچھ اور مضبوط ہوگیا۔

عمروں کا فرق ان دونوں میں بھی تھا لیکن ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے اور شفقت و محبت کی فضا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنادیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بھائی طویل سفر پر جاتے ہوئے مطمئن تھے کہ یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی اور زمانے بھر کی غم گسار تھیں اور زمانہ ان کا دوست۔جس وقت ٹھنڈی ریت پر لیٹا ہوا ایش کالب یہ سب سوچ رہا تھا' عین اسی وقت اس بلند و بالا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہوا ابراہیم بن کالب بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑ پر نظریں جمائے تصور ہی تصور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب کو اس کی قوتوں کے واسطے دے رہا تھا۔اس نے کہا۔

''موسیٰ کے لامتناہی قوت والے خدا! یہ وہی جگہ ہے جہاں تو نے ایک پُرجلال قوم کو پست کرنے اور ایک کمزور قوم کو عزت دینے کا فیصلہ کیا تھا پھر تیرے اس فیصلے میں کوئی شئے رکاوٹ نہیں بن سکی تھی۔ باری تعالیٰ تیری ذات سب پر محیط ہے۔تو سب کو دیتا ہے اور سب تیرے محتاج ہیں۔آج تیرا سب سے کمزور اور محتاج بندہ تجھ سے وہ شئے طلب کررہا ہے جس کا حصول اس کے لیے ناممکن مگر اس کا عطا کرنا تیرے لیے آسان ہے۔باری تعالیٰ لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کو بیت المقدس کی کہانت اور اولاد عطا فرمادے۔ موسیٰ کے لامحدود قوت والے خدا! موسیٰ کے لامحدود قوت والے خدا!''

دُعا کے الفاظ ادا ہوتے رہے' آنسو بہتے رہے' وہ گڑگڑاتا رہا' مانگتا رہا اور بادلوں میں چھپی ہوئی چوٹی پر خدا کے موجود ہونے کا احساس اسے دیوانہ بناتا رہا۔کتنی دیر گزری' اسے اندازہ ہی نہ ہوا' ہاں' بہت دیر بعد قلب کی طمانیت نے اسے یقین دلا دیا کہ موسیٰ کے رب نے گزارش سن لی' التجا قبول کرلی' تب اس نے زمین پر اپنا سر رکھ دیا۔ دوسرے دن اس نے کہا۔''ایش میرے بھائی! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ موسیٰ کے رب نے میری گزارشیں سن لیں۔قبولیتِ دُعا کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ قلب پر سکون طاری ہوجاتا ہے جس کا احساس مجھے پہلی بار ہوا

ہے۔''

''موسیٰ کا رب آپ کو ہر نعمت عطا فرمائے۔'' ایش بن کالب نے کہا۔''اب ہم واپسی کا سفر شروع کرسکتے ہیں۔''

''بے شک' بے شک' ہمارے پاس وقت کی قلت نہیں ہے لیکن غیر ضروری دیر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔''

دونوں بھائیوں نے بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑ پر آخری نظر ڈالی اور واپسی کے لیے گھوڑے موڑ لیے۔اس وقت ان کی گفتگو کا موضوع بیت المقدس اور قرعہ اندازی کی رسم تھی۔

بیت المقدس میں عام قرعہ اندازی کا طریقہ تو یہ تھا کہ جو معاملہ طے نہ پاتا' توریت لکھنے والے عام مصلی اپنے اپنے قلم پانی سے بھرے ہوئے طشت میں ڈال دیتے۔جس کا قلم بھی پانی پر تیر جاتا' اس معاملے کو وہی طے کرتا اور سب اس فیصلے کو مان لیتے لیکن کہانت کا فیصلہ اور کاہن کا انتخاب کوئی عام بات نہ تھی۔ ایسے میں خاندان بنی لاوی کے عالموں اور توریت مقدس کے حافظوں کو مدعو کیا جاتا جن کی تعداد بارہ ہونی ضروری تھی۔ بنی اسرائیل کے لیے مدتوں بارہ کے عدد کی بڑی اہمیت رہی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے بارہ چشمے پھوٹے جنہیں بارہ قبیلوں نے اپنی اپنی ملکیت بنا لیا اور آگے چل کر وہی اس قوم کی پہچان بن گئے۔دن کے بارہ گھنٹے تھے' رات کے بارہ گھنٹے اور سال کے بارہ ماہ تھے اور اب بھی بنو اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے جن میں گیارہ بیت المقدس کے دیگر تمام امور کے نگراں اور بارہواں بنی لاوی کہانت کے لیے مخصوص تھا اور ان کے بھی چیدہ چیدہ صرف بارہ علماء کو دعوت دی جاتی تھی جس کے لیے یہ خاندان برسوں محنت کرتا تھا۔

اس بار قرعہ اندازی کے لیے دعوت دی گئی تو صرف گیارہ عالم ہی جمع ہوسکے۔اب ایک اور کی تلاش تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اسی دن' اسی موقع پر اپنے تجارتی سفر سے لوٹنے والے ابراہیم بن کالب سے سب ہی واقف تھے اور اس کی علمی حیثیت بھی جانتے تھے لہٰذا انہیں دیکھتے ہی ایک شور بپا ہوگیا۔ کوئی بولا۔

''ارے' ابراہیم بن کالب بھی تو حافظ توریت اور عالم ہے۔بس عمر کم ہے۔''

''ہاں' ہاں' گنتی پوری کرنے کے لیے شامل کرنے میں کیا حرج ہے؟'' کسی نے چلا کر کہا۔

ہر طرف شور بپا تھا اور اصل صورت حال سے ناواقف یہ دونوں بھائی حیران تھے۔اسی وقت کسی نے آواز لگائی۔

''بنی لاوی کے خاندان کا ہے' عالم توریت ہے' تو دیر کس بات کی؟ چلو قرعہ اندازی شروع کرو۔''

یہ کہتے کہتے کچھ لوگ قریب آئے اور گھوڑے سے اترتے ہوئے ابراہیم بن کالب کو بیت المقدس کی طرف لے جانے لگے۔لوگ ابھی تک چہ میگوئیاں کررہے تھے۔

''دیکھو' آج صبح سے ہم لوگ بارہویں عالم کے لیے پریشان تھے اور وہ اتنے طویل سفر سے آنے والا تھا۔''

اب ابراہیم بن کالب کے قلب پر وہی دُعا والی طمانیت عود کر آئی تھی۔سب جوتے اتار اتار کر بیت المقدس میں داخل ہونے لگے۔بیت المقدس کے اندر کا نظارہ آج کچھ اور تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت اس گھر کے مقدس صحن میں رکھا ہوا تھا۔اس کے گرد خاندان بنی لاوی کے معززین گھیرا بنائے کھڑے تھے' دوسرا بڑا گھیرا بیت المقدس کے باقی خدمت گار اور مصلیوں کا تھا پھر دوسرے قبائل کے معززین کا نمبر تھا۔ یہ گھیرا قدرے بڑا تھا اور تیسرا باقی قبائل کے معززین کا تھا اور پھر بیت المقدس کے دیگر خدمت گزاروں کا جن کی اہمیت عام لوگوں سے تو زیادہ تھی مگر ان معززین سے کم تھی لہٰذا اسی ترتیب سے سب کو مقام ملے تھے۔ان سب کے علاوہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا جو اپنے اپنے جوتے باہر اتار کر اندر آگئے تھے اور جو اندر نہ آسکے تھے' باہر ہی سے نتیجہ دیکھنے کے

تمنائی تھے۔ جنہیں اندر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا' وہ آوازوں سے اندازہ کر رہے تھے۔

اس وقت اندر کا منظر عجیب تھا۔ پانی سے بھرا ہوا طشت درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ پانی کی حرکت کم ہوتے ہوتے ساکن ہو جاتی' تب کارروائی شروع کی جاتی۔ لوگ انتظار کر رہے تھے اور ابراہیم بن کالب اس صورت حال سے حیرت زدہ سا ہو رہا تھا۔ دعائیں اتنی جلد اثر دکھائیں گی' اسے یقین تو تھا مگر خود پر اس کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ اسے لگا' ہونٹ بار بار خشک ہو رہے ہیں جنہیں زبان پھیر پھیر کر تر کرنا ضروری تھا۔ کبھی اسے لگتا' کوئی اندر سے کہہ رہا ہے۔ 'ابراہیم بن کالب' تم تو صرف عالم کی گنتی پوری کرنے کے لیے لائے گئے ہو پھر دھکیل دیے جاؤ گے۔ کاہن تو نہ جانے کون بننے والا ہے؟' اس کے ساتھ ہی اسے لگتا' کوئی اندر سے ہی اطمینان دلا رہا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ خاندان بنی لاوی کے لاتعداد اور جوان بھی صاحب علم ہیں اور یہاں موجود تھے مگر موسیٰ کا رب ہی تم کو طویل سفر سے یہاں لایا اور تم اندر تک آ گئے۔'' ابھی امید و بیم کی یہ کیفیت جاری تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے طشت کا پانی ساکت ہو گیا' تب بوڑھے مجاور نے آواز بلند کی اور چلا کر بولا۔

''خاندان بنی لاوی کے معزز عالمو...... اپنے اپنے قلم آہستگی سے پانی میں ڈال دو۔'' یہ آواز سنتے ہی ان بارہ عالموں نے اپنے اپنے قلم اس پانی میں ڈال دیے۔ اس وقت بیت المقدس میں موجود ہر فرد کی نظریں اس طشت پر مرکوز تھیں اور سب علماء کے قلم تیزی سے چکر کھا رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد کوئی بھی قلم پانی کی سطح میں جا کر کسی بھی عالم کو مایوس کر دیتا اور قلموں کی تعداد گھٹ جاتی۔ یوں تعداد گھٹتی رہی' ایک...... دو...... تین...... چار...... اور دیکھنے والے محو دید رہے۔ سب عالم پلکیں جھپائے بنا پانی کو دیکھ رہے تھے یا قلموں کو دیکھ رہے تھے یا پھر ان کی نظریں محض اس قلم کے لیے بے چین تھیں جو واحد تیرتا ہوا رہ جاتا اور اس جلیل القدر منصب کا اعلان کر دیتا۔ گیارہ قلم ڈوب گئے اور ایک قلم تیرتا رہ گیا۔ اس وقت ابراہیم بن کالب کو لگا کہ بصارت سے زیادہ سماعت نے کام کیا ہے اور بے شمار آوازوں میں سب سے پہلے آنے والی آواز الیش بن کالب کی تھی۔ اس نے خوشی سے مغلوب آواز میں لوگوں سے کہا۔

''دیکھو' دیکھو' ابراہیم بن کالب کا قلم پانی پر تیر رہا ہے۔''

''ہاں دیکھو' ابراہیم بن کالب کا قلم تیرتا ہوا رہ گیا۔'' کئی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر تو جیسے شور مچ گیا۔ اس وقت ابراہیم بن کالب کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی اور ہر طرف کی آوازیں سنتے ہوئے وہ خود کو سنبھال رہا تھا اور اس کا قلم ابھی تک پانی پر تیر رہا تھا۔ لوگ جگہ بنا بنا کر اس کی طرف آ رہے تھے اور اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

''بیت المقدس کے عظیم کاہن ابراہیم بن کالب۔''

دیر تک نام پکارا جاتا رہا۔ جو لوگ خوش نہیں تھے' وہ صرف ناکام ہونے والے تھے۔ ایسے میں کامیاب ہونے والوں کے شور میں وہ بھی گم ہو کر رہ گئے اور صرف ایک ہی نام لیا جا رہا تھا جسے سن سن کر ابراہیم بن کالب کا یقین دعاؤں کی قبولیت پر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اسے بیت المقدس کا کاہن منتخب کر لیا گیا تھا۔ اب لوگ اسی وقت حلف وفاداری چاہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے صحن کا منظر بدل گیا پانی کے طشت کے ہٹاتے ہی چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہونے والے سرک سرک کر صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے لگے تاکہ وفاداری کا حلف اٹھاتے ہوئے عالم کو دیکھ اور سن سکیں۔ اس وقت حلف لینے والے جلیل القدر عالم اور یہ اقرار سننے والے لاتعداد افراد موجود تھے۔ ابراہیم بن کالب کو ان سب کی موجودگی میں وہ قسم کھانی تھی جس پر ایک کاہن کی حیثیت سے عمر بھر عمل کرنا تھا۔ چند لمحے وہ خود کو سنبھالتا رہا۔ اس دوران کسی عالم نے جا کر بیت المقدس کے خاص حصے میں بخور جلایا جس کی خوشبو سے صحن مہک

گیا۔ اسی جگہ ایک بڑے طاق میں ایک فرشتے کا مجسمہ اپنے ہاتھ میں موم بتی لیے کھڑا تھا۔ اس موم بتی کو نئے کاہن نے خود جلا کر موسیٰ کے رب سے قسم کھائی اور اب اسے یہاں موجود سب لوگوں سے عہد کرنا تھا۔

یہ رسم بڑی مقدس تصور کی جاتی تھی اور اس وقت بھی سب بڑے شوق اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ابراہیم بن کالب نے اس موم بتی کو روشن کیا۔ اس وقت بیت المقدس کی معزز عورتیں مبارک بادی کا گیت گانے لگیں۔ کچھ نے اپنے ہاتھوں میں اگربتیاں لی ہوئی تھیں اور حلف لینے والے عالم تیزی سے اس خاص حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں فرشتے کے سفید پیکر کے ہاتھ میں موم بتی تھی اور بخور کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ یہ عالم ابراہیم بن کالب کے دائیں اور بائیں اور عقب میں کھڑے ہو گئے تب اس نے اس مقدس صحن میں جمع سب کو دیکھا اور مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''محترم و بزرگ علما! آپ سب کی موجودگی میں موسیٰ کے رب نے جس طرح مجھے یہ منصب سونپا' آپ سب گواہ ہیں۔ بے شک اس معزز خاندان میں سب ہی مجھ سے زیادہ قابل اور عالم ہیں مگر موسیٰ کے رب نے میرا انتخاب کیا ہے تو میں اسی جلیل القدر رب کی قسم کھا کر' آپ سب کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ بیت المقدس کے کاہن ہونے کا پورا پورا حق ادا کروں گا۔ میں آپ سب کی زندگیوں کو اپنی زندگی پر' آپ سب کے نفع کو اپنے نفع پر آپ سب کے حقوق کو اپنے حقوق پر ترجیح دوں گا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام احکامات پر عمل کروں گا اور آپ سب کو بھی اسی کی ہدایت دوں گا۔''

•......•......•......•

اس بار گھر کی طرف جاتے ہوئے ابراہیم کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ کل تک وہ صرف خاندان بنی لاوی کا ایک صاحب علم جوان تھا لیکن اب ایک دم سے ہی بیت المقدس کا وہ عظیم کاہن بن گیا تھا جسے بادشاہ بھی سلام کرتا تھا۔ یہ وہ بلند ترین منصب تھا جس کے لیے بنی لاوی کا ہر مرد عمر بھر محنت کرتا تھا' تمنا کرتا تھا مگر محروم رہ جاتا تھا کیونکہ یہ منصب صرف ایک کو ملتا تھا۔ باقی محنت کرنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ منصب سے ناموری اور عزت ملتی ہے۔ دنیا کی نظر اسی پر ہوتی ہے۔ اس میں پنہاں آزمائشوں اور فتنوں کا احساس ان سے گزرے بغیر کسی کو نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے گھر تک پہنچنے سے قبل یہ خبر علاقے بھر میں عام ہو چکی تھی اور انہیں یقین تھا کہ حمنہ اور زلیخا دوسری معزز عورتوں کی طرح گھر سے باہر ہی انہیں مبارک باد دیں گی لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں اور دلوں کے اندیشے دلوں میں چھپائے اردگرد پر نظریں ڈالتے وہ دونوں گھر تک پہنچ گئے۔ اپنے گھوڑے اور دیگر اشیا غلام کے حوالے کر کے وہ دونوں بڑا احاطہ پار کر کے گھر میں داخل ہوئے تو دروازے پر خدمت گار لونڈی کے ساتھ صرف زلیخا نے لوبان جلا کر اس کا استقبال کیا اور بولی۔

''زلیخا بیت المقدس کے عظیم کاہن کو سلام پیش کرتی ہے اور مبارک باد دیتی ہے۔''

اس کے جواب میں ابراہیم نے بڑے مضطرب سے انداز میں ان کے سر پر ہاتھ رکھا' دعا دی۔ لونڈی کو بھی دعا دی۔ حمنہ کی غیر موجودگی ان دونوں کو متردد کر رہی تھی۔ الیش بن کالب نے کہا۔

''کیا یہ سلام اور مبارک باد معزز کاہن کی زوجہ کو پیش کرنا نہیں چاہیے تھا؟''

یہ سوال تھا' استفسار یا اپنے اضطراب کا اظہار' جو بھی تھا' زلیخا نے اسے محسوس کیا اور بولی۔

''یقیناً انہیں یہاں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن علاقے کے معمر حکیم نے انہیں چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ موسیٰ کا رب معزز کاہن کو کہانت کے بلند مرتبے کے ساتھ ساتھ اولاد کی نعمت بھی عطا کرنا چاہتا ہے۔''

اس وقت الیش بن کالب نے حیرت اور مسرت سے دیکھا اور ابراہیم بن کالب کو لگا کہ ہر طرف گھنٹیاں بج رہی ہیں' رگ رگ میں سنسنی سی دوڑ رہی ہے۔ کس قدر مایوسیوں کے بعد ایک دم ہی ہر خوشی مل

گئی تھی۔ اس دن اپنی خواب گاہ میں جانا اسے عجیب لگ رہا تھا جیسے وہ حمنہ کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ حمنہ نے اسے بتایا کہ ان دونوں کے سفر پر جانے کے کچھ دن بعد ہی اس کی طبیعت خراب ہوئی تو حکیم نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ گویا کہ وقت کا بڑا حصہ گزر چکا تھا اور کم وقت باقی تھا۔ اس وقت بیت المقدس کا یہ جلیل القدر عالم اور عظیم کاہن اپنی دوسری آرزو کی تکمیل میں بے چینی سے گھڑیاں گننے لگا۔ موسیٰ کے رب نے دونوں خوشیاں ایک ساتھ ہی عطا کر دی تھیں۔

کہتے ہیں' منصب مانگنے والے کو آزمائش ملتی ہے' شہرت طلب کرنے والے کو بدنامی اور دولت طلب کرنے والے کو ہوس مگر پھر بھی انسان کے دل میں یہ تمام آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں' دولت' نام وری اور عزت۔ انسان ان خواہشات پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔ کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم بن کالب بھی انسان تھا اور اس کے علم کی بدولت اس منصب پر اس کا حق بنتا تھا' اولاد کی تمنا بھی اس کے خیال میں جائز تھی۔ اس دنیا میں کوئی شخص ایسا ہوا ہی نہیں جس نے اولاد کی آرزو نہ کی ہو۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھا اور پھر انسان ہے بھی عجیب و غریب مخلوق' بے پناہ نعمتوں کے حصول کے باوجود ایک کمی کو اپنی محرومی بنا لیتا ہے پھر ہر کوشش' ہر خواہش اور ہر کاوش اسی کے حصول کے لیے کرتا ہے۔ ایسے میں دعا' دوا اور علم و عمل کی سب صلاحیتوں کو اسی کے لیے آزماتا ہے اور ان لاتعداد نعمتوں کو بھول جاتا ہے جن کا شکر ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔ یوں عمر بھر شکر ادا نہیں کرتا' بس مانگتا ہے' التجائیں کرتا ہے' گڑگڑاتا ہے اسی لیے کبھی کبھی بڑی دعاؤں کے بعد کوئی خواہش کسی بہت بڑے نقصان کے ساتھ پوری ہو جاتی ہے اور انسان کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ ابراہیم بن کالب نے بھی پندرہ برسوں میں صرف محرومی کو محسوس کیا تھا' کہانت کے منصب کی تمنا کی تھی۔ اور جبل موسیٰ پر جا کر نفع ہی نفع کی بات کی تھی۔ اس کے عوض نقصان کو بھول گیا تھا اور موسیٰ کے جلیل القدر رب نے اس کی دعا قبول فرما لی تھی۔ منصب عطا کر دیا تھا مگر آزمائش کے ساتھ جس کے بارے میں اس عالم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ بس اب وہ بے چینی سے اولاد کا منتظر تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وقت کا انتظار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ اس کے جلو میں کیا' کیا آنے والا ہے؟ اسے بھی اندازہ نہ تھا۔

سب ہی مگن تھے' سب ہی خوش تھے۔ لاثان اور ہاران خاندان بنی لاوی کے دو بیٹے ان کی توجہ کا اور تیسرا آنے والا ان کے انتظار کا مرکز تھا۔ وہ جو بھی تھا' بیٹا یا بیٹی' یقیناً اس گھر کو خوشیوں سے بھر دینے والا تھا۔ وہ سب جب ساتھ ساتھ ہوتے' یہی موضوع چھڑ جاتا۔ ایلش بن کالب کہتا۔ ''اگر مقدس کاہن کو موسیٰ کے رب نے بیٹا عطا کیا تو ہم اس کا نام ''یعقوب'' رکھیں گے۔''

ایسے میں زلیخا کہتی۔ ''اگر بیٹی ہوئی تو میں اس کا نام ''حوا'' رکھوں گی۔ ''حوا'' کے معنی ہیں' خواہش' تمنا' آرزو۔'' اس وقت سب ہنس دیتے۔ نام بھی عجیب تھا اور معنی بھی عجیب۔ یہ سب باتیں خوشیوں کا اظہار کرتیں۔ وہ سب ہی بے چین سے انتظار کر رہے تھے۔ وقت گزرا اور بیت المقدس کے کاہن کو نئی معروفیت دے گیا۔ اب اس کا زیادہ وقت اس مقدس گھر میں گزرنے لگا اور ایلش بن کالب ایک طویل سفر کے بعد آرام کر کے تھکن اتارنے میں مصروف تھا۔

ایسے میں موسم نے اپنے انداز بدلے۔ کسی پر خوشگوار اثر ڈالا' کسی کو لپیٹ میں لے لیا۔ ایسے میں کسی نے محسوس بھی نہ کیا جب اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر کام کرنے والی زلیخا کو ٹھنڈ لگ گئی۔ بات تو کچھ بھی نہ تھی' موسم اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ لوگ نزلے' بخار کا شکار ہو رہے تھے لیکن اس بار مرض کی نوعیت کچھ اور تھی یا زلیخا نے ہی بے پروائی اختیار کر لی تھی کہ وقت گزرتا رہا' طبیب آتے گئے' علاج بدلتے گئے' سب مرض کی نوعیت پر گفتگو کرتے رہے مگر موت کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ سب دیکھتے ہی رہ گئے اور زلیخا ڈیڑھ ہفتے کی جان لیوا تکلیف کے بعد پانچ سالہ لاثان اور دودھ پیتے ہاران کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ ابراہیم اور حمنہ کی کاوشیں ایلش بن

کالب کی محبتیں اور معصوم بچوں کی بے کسی' کوئی بھی اسے نہ روک سکا۔ سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ جو جہاں تھا' جیسے اپنی جگہ ایک پتھر تھا۔ ہاں' لاثان یا ہاران روتے تو انہیں لگتا' اس گھر میں زندگی موجود ہے۔ ابراہیم بھی چونک جاتا اور حمنہ بھی ہوش میں آ کر ان بچوں کو سینے سے لگا لیتی۔ یوں بھی اب وہ دونوں اسی کی گود کے ہو کر رہ گئے تھے اور ایلش بن کالب اس کمرے کا جس سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ تکیے میں منہ دے کر لیٹتا تو وقت کا پتا ہی نہ چلتا اور ابراہیم اس کی تنہائی پسندی سے گھبرا کر اسے سفر کے مشورے دیتا لیکن اس کے جانے کے تصور سے خود ہی گھبرا جاتا۔ لگتا تھا' غم ان سب کے اندر بیٹھ گئے ہیں کہ وہ سب خود سے بھی ڈرنے لگے ہیں یوں جیسے ایک دوسرے سے منہ چھپا رہے ہیں۔ ان ہی دنوں ایک بڑے میلے کا اعلان ہوا۔ تاجر لوگ مختلف علاقوں سے مال لے کر اس میلے میں جاتے اور اپنی دکان لگاتے۔ ایلش بن کالب ایسے میلوں میں جا جا کر بہت نفع کما لاتا تھا۔ اس وقت مال سے زیادہ سوچوں اور صحت کے لیے یہ سفر ضروری تھا' شاید اس بات کو اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ بہت کم وقت میں اس سفر کا فیصلہ ہو گیا اور لاثان کو پیار کر کے' ہاران کو چومتے ہوئے اس نے حمنہ کو دیکھا' ہنسنے کی کوشش کی' حمنہ نے آنسو پیتے ہوئے دعا دی تب وہ ابراہیم سے گلے ملتے ہوئے ایک اچھے وقت پر ملنے کی تمنا لیے رخصت ہو گیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وقت کے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں جو ابراہیم کے سینے میں پیوست ہونے والے تھے؟ ایک خوشی کے انتظار میں انسان کتنے غم جھیل جاتا ہے' شاید جھیل کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔

ایلش بن کالب چلا گیا۔ چند ہفتوں کا سفر تھا۔ یہ وقت ان سب نے ہی بڑی بے چینی سے گزارا۔ کسی نئی روح کی آمد کا تصور ہزار ہا غموں میں بھی عجیب مسرت دیتا ہے۔ ابراہیم بھی خود کو بشاش رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت کا احساس اسے اب بھی تھا لیکن اس وقت کی قیمت ابھی ادا کرنی تھی۔ حمنہ کا پیر پھسلا اور وہ گر گئی۔ چیخ کی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر گیا۔ خدمت گار لونڈی نے خدمت کی اور احباب نے خلوص کو آزمانے میں کمی نہ کی۔ اس وقت ان میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا کہ جان کے بدلے جان کا معاملہ ہے۔ وہ سب ہی حمنہ کو ہوش میں لانے اور نئی روح کے دنیا میں لانے کا اہتمام کر رہے تھے۔ دنیا میں آنے والی روح کو آنا تھا' وہ آ گئی مگر اس شب تمناؤں سے طلب کی ہوئی اور ارمانوں سے مانگی ہوئی اولاد نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تو ہوش و خرد سے بے گانہ حمنہ نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ دیکھنے والے چیختے چلاتے رہ گئے' عورتوں نے غم اور مدہوشی میں بال کھول کر منہ پیٹنے شروع کر دیے مگر ابراہیم بن کالب اس نئے وجود کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاید انسان جتنے بلند منصب پر ہوتا ہے' اتنے ہی بڑے حوصلے کے ساتھ آزمائشوں سے گزر جاتا ہے۔ ابراہیم بن کالب' بیت المقدس کا عظیم کاہن قیامت خیز آزمائشوں سے گزر کر اس وجود کو تکتا رہ گیا جسے موسیٰ کے رب سے اس جلیل القدر پہاڑ پر جا کر مانگا تھا۔ ایک ننھا سا روئی کی طرح نرم وجود' چھوٹی سی آواز' اس کا دل چاہا' اسے کلیجے میں اتار لے تب ہی خدمت گار لونڈی سیلہ نے کہا۔

''مقدس گھر کے جلیل القدر کاہن......! آپ کو موسیٰ کے رب نے بیٹی عطا کی ہے۔''

''حوا!'' ابراہیم بن کالب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''حوا یعنی خواہش' تمنا' آرزو۔'' آنسوؤں سے نم یہ آواز کسی نے نہیں سنی' بس دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بنی لاوی کے عظیم کاہن نے اس نرم وجود کو سینے سے لگا لیا جسے باپ کے بوسے سے پہلے آنسو ملے تھے۔ ابراہیم بن کالب بہت بڑے غم سے گزرا تھا۔ ہمدردی کرنے والے بے پناہ محبتوں کے باوجود رخصت ہو گئے۔ اب غموں کو بانٹنے اور محبت کرنے والی ایک ہستی کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ دل چاہتا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں ایلش بن کالب آ جائے اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنا

سارا غم آنسوؤں میں بہادے۔ دن ان تینوں کے کام کرانے اور ادھیڑ عمر سیطہ کو ہدایت دینے میں گزر جاتا اور رات میں ایک بازو کے ساتھ لاثان دوسرے بازو کے ساتھ ہاران اور سینے پر چھوٹی سی رضائی میں لپٹی حوا اسے مصروف رکھتی۔ خیالات کبھی ماضی اور کبھی حال کا احاطہ کرتے' کبھی کوئی پرانی یاد مضطرب کرتی تو کبھی حال کی کیفیت آنکھیں نم کر دیتی۔ ایسے میں مستقبل بھی اپنی کرن دکھاتا۔ وہ تصور ہی تصور میں ایش بن کالب کو واپس آتے ہوئے دیکھتا اور کہتا۔

'میرے بھائی! زلیخا کا نعم البدل نہیں مل سکتا مگر اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ لاثان کو' ہاران کو اور حوا کو۔ پرورش اور نگہداشت کا کام صرف اور صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔' یہ سوچتے سوچتے اسے لگتا اب اسے صرف ایش بن کالب کی ضرورت ہے۔ اس کا انتظار ہے جس کے سہارے وقت گزارے۔ اب اس کے کان وہ دستک سننا چاہتے تھے جو ایش بن کالب کے آنے کی خبر دیتی۔

اور ایک رات دروازہ بجنے کی آواز نے اسے نیند سے چونکا دیا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ ایش بن کالب کا آنا متوقع تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ کیا اس وقت دروازے پر متعین غلام موجود نہیں یا بہت گہری نیند سو گیا ہے جو آنے والے کو اتنے زور سے دستک دینی پڑی؟ جب تک ابراہیم بن کالب اٹھتا' سیطہ بڑے دروازے تک پہنچ گئی۔ اس وقت آنے والا ایش بن کالب نہیں بلکہ قافلے کے لٹ جانے کی خبر تھی۔

آنے والوں نے خبر دی کہ قافلہ منزل پر پہنچ کر لٹ گیا' میر قافلہ مارا گیا' مال لوٹ لیا گیا اور کچھ مسافروں کی حالت خراب ہے' ان میں ایش بن کالب بھی ہے۔ ابراہیم پر کیا گزری' یہ محسوس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تین کم سن بچوں کو سیطہ کے حوالے کر کے گھر سے قافلے کے پڑاؤ کے مقام تک وہ کس طرح پہنچا' شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا' بس اسے اتنا ہی پتا تھا کہ ایش بن کالب اور اس کے ساتھیوں کو قزاقوں نے گھیر لیا۔ اس کے پہنچنے تک کچھ رخصت ہو گئے اور سانس توڑتا ہوا ایش بن کالب اس کے سامنے تھا مگر لگتا تھا' کچھ کہنے کی سکت نہیں ہے۔ وہ زخموں سے چور چور چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سانس کھینچ کر بولا۔

''بھائی محترم......! انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے' وہ فیصلہ اللہ ہی کا ہوتا ہے کیونکہ اس کی منشا و مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہتے کہتے ایش بن کالب نے ہاتھ بڑھایا تو ابراہیم بن کالب نے یہ ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔

''آپ لاثان اور ہاران کا خیال رکھیے۔ حنہ سے کہیے' انہیں ماں......''

اس وقت بات پوری نہ ہوئی کہ عمر میں پہلی بار ابراہیم بن کالب بلند آواز سے رو دیا۔ کچھ کہنے یا وعدہ کرنے کا مقام ہی نہ تھا۔ کیسے کہہ دیتا کہ حنہ تو خود ایک بڑی تمنا پوری کر کے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ان تین بچوں میں سے کسی کی بھی ماں نہیں ہے مگر وہ یہ بات کہہ نہ سکا اور روتا رہا۔ کہتا بھی کس سے' ایش بن کالب یہ سب سننے کو وہاں موجود نہ تھا۔ اس دن بیت المقدس کا عظیم کاہن اس کے جسد خاکی کو اٹھائے پلٹ آیا اور زلیخا اور حنہ کی قبروں کے پاس ایک قبر اور بن گئی۔

•... .•. ...• ... •

وقت زخم دیتا ہے اور وقت ہی اسے بھر دیتا ہے' اس کا اندازہ انسان کو خود ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو نہ زخم نظر آتے نہ ان کے بھر جانے کا احساس ہوتا۔ انسان خود گزرے وقت کی نشانیوں کو عزیز رکھ کر اسے بھول جاتا ہے یا صبر کر لیتا ہے۔

ایش بن کالب جسے اس نے بیٹوں کی طرح پرورش کیا تھا' اس خاندان کو دو بیٹے دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ابراہیم نے سوچا۔ ''قدرت کو یہی منظور تھا۔'' اب اس نے بچھڑے ہوئے بھائی کو ان دو بیٹوں میں پا لیا تھا۔ اسے بھولا نہیں تھا' بس سمجھوتا کر لیا تھا۔ حنہ' اس کی عزیز بیوی' ٹوٹ کر محبت کرنے والی ساتھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ زندگی کا وہ عیش و آرام اسے لمحہ لمحہ یاد تھا۔ اس محبت' اس ساتھ سے وہ محروم ہو چکا تھا لیکن حنہ کی نشانی موجود تھی جسے ہر محرومی سے

بچانے کے لیے اس نے یہاں بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ ہاں' کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں تعجب سے سوچتا۔

'کیا آرزوئیں یوں بھی تکمیل پاتی ہیں؟ تمنائیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں؟ کہانت کا مقدس منصب مانگا تو سب کچھ لٹ گیا۔ اولاد مانگی تو گھر میں اولاد کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔' یہ سب تصورات تنہائی میں متوجہ کرتے لیکن تنہائی کا وقت کم سے کم ہوتا گیا۔ کہانت کی ذمے داریاں اور بچوں کی موجودگی اسے مصروف کرتی رہی۔ سیطہ خادمہ بھی تھی اور ان بچوں کی ماں بھی۔ ان کی دیکھ بھال' کھانے پینے' کھیلنے اور سونے جاگنے کے اوقات کا خیال رکھنا اسی کی ذمے داری تھی۔ ہاں' ان سب کے مستقبل کے لیے سوچنا ابراہیم بن کالب کا فرض تھا اور وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتا' ایک ہی فیصلے کو دہراتا۔ 'ابراہیم بن کالب' بنی لاوی کے عظیم کاہن' تم خاندانی روایات کے مطابق بڑے فرزند کو عالم اور دوسرے کو تاجر بناؤ گے تاکہ تمہارے گھرانے کا ایک لڑکا ضرور کہانت کے مقابلے کے لیے موجود رہے۔ تمہارے باپ نے تمہیں عالم اور ایش کو تاجر بنایا' اب تم لاثان بن ایش کو عالم اور ہاران بن ایش کو تاجر بناؤ گے۔'

یہ آرزو کرتے وقت وہ بھول جاتا کہ اس گھر میں ایک بچی بھی ہے۔ اس کا بھی کوئی مستقبل ہے؟ اچھے سے اچھے علم کی تلاش صرف لاثان بن ایش کے لیے ہوتی اور تجارتی فن میں طاق کرنے کے لیے ہاران بن ایش پر توجہ دی جاتی۔ بے پناہ محبت کرنے والا باپ اس کم سن بچی کو سینے سے لگا کر سوتا۔ اس کی غذا' اس کے لباس کا سب سے بہتر انتظام کرتا لیکن وہ کیا چاہتی ہے' کس بچے کے ساتھ خوشی محسوس کرتی ہے' اس جلیل القدر عالم کی نظر وہاں تک جاتی ہی نہ تھی۔ یوں وقت گزرتا گیا' ابراہیم بن کالب بیت المقدس کے کاموں میں مصروف ہوتا گیا اور بچے تیزی سے بڑے ہوتے گئے۔

علاقے کے مکتب سے تعلیم پانے کے بعد اب لاثان بن ایش کو مزید علم کی ضرورت تھی۔ یوں بھی گھر میں کیا تھا جو وہ وقت گزاری کے لیے رہتا؟ اب اسے لمحہ لمحہ ابراہیم بن کالب کے ساتھ رہنا تھا۔ اب علاقے کے مکتب میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہاران جاتا' حوا جاتی اور ان کی عمر کے چند بچے ان کے پاس آتے۔ یہ سب کبھی پڑھتے' کبھی تصویریں بناتے۔ ہاران لکڑی کے کھلونے بنا کر ان پر روغن کرتا تو حوا کو یہ سب اچھا لگتا۔ یوں بھی اپنے سے عمر میں کئی برس بڑا سنجیدہ سا لاثان اسے مسرور نہ کرتا۔ ہاں' ہاران چست' پھرتیلا' غصے اور محبت کا بے تکلف اظہار کرنے والا جو علم اور کھیل میں توازن رکھتا' اسے اچھا لگتا تھا۔ چند دن لاثان ابراہیم بن کالب کے ساتھ بیت المقدس میں رہا تو حوا کو جلد ہی اس صورت حال کی عادت پڑ گئی۔ ہاران نے الجھتے ہوئے کہا۔

''حوا! لاثان اب کئی کئی دن کے بعد گھر آئے گا۔ تمہیں وہ یاد آتا ہے؟ میں تو اس کے بغیر اداس ہوں۔''

''میں اداس نہیں ہوں۔'' حوا نے لکڑی کے گھوڑے پر روغن کرتے ہوئے کہا۔ ''لاثان ہمارے ساتھ کھیلتا نہیں' بس پڑھتا ہے۔ تم میرے ساتھ کھیلتے ہو' تم تو نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' ہاران نے اپنے طور پر فیصلہ کیا۔ ''ہم دونوں یہاں رہیں گے۔''

حوا خوش ہو گئی۔ مکتب اور گھر میں وہ دونوں ساتھ ہوتے' ساتھ کھیلتے۔ ہاران کوئی نئی بات سیکھتا تو اسے ضرور سکھاتا اور وہ خود بھی جو کام کرتی' اسے بتاتی۔ ابراہیم بن کالب ان پر دولت لٹاتا' انہیں خوش رکھنے کو سب کچھ کرتا۔ جب مقدس گھر سے واپس اپنے گھر آتا تو اسے لگتا' صرف یہی بچے ہیں جو اس کا دامن کھینچ لیتے ہیں۔ وہ تمام وقت ان میں گزارتا' ان کے کھیل دیکھتا' ان کے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیتا اور انہیں ڈھیروں محبتیں دے کر پھر چند دن کے لیے چلا جاتا اور وہ خود مصروف اور بچے پھر ایک دوسرے میں گم ہو جاتے۔ اب وہ دونوں لاثان کو دیکھ کر خوش ہوتے مگر اس کی محفلیں دیر تک انہیں مسرور نہ کر سکتیں۔

لاثان کا راستہ جدا ہو چکا تھا جو بہت کشادہ' بہت

طویل تھا۔ ابراہیم بن کالب جب علاقے کے لوگوں میں بیٹھ کر ان کی باتیں کرتا تو وہ سب حیرت سے دیکھتے۔ توریت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ بہت جلد خاندان بنی لاوی کا فرد ہونے کے باعث مزید تعلیم کے لیے منتخب کرلیا گیا تھا۔ اس انتخاب کے لیے بھی امتحان ہوتا تھا جس میں بنی لاوی کے خاص خاص لڑکے ہی شریک ہوتے اور چند ایک ہی کامیاب ہوتے تھے اور اس برس بارہ سالہ لاثان بن ایلش نے اپنی قابلیت سے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور آئندہ کے لیے بیت المقدس کے مصلیوں نے اسے تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ ابراہیم بن کالب کی خوشی کی انتہا نہ تھی' وہ خود کاہن تھا اور اس کا ہونہار بھتیجا کاہن بننے والا تھا۔ اسے لگا' مستقبل محفوظ ہے۔ بنی لاوی کے خاندان کی عزت اور شان سب اسی کے دم سے ہے۔

اس بار وہ گھر آیا تو علاقہ بھر کے لوگوں نے حاضری دی' سلام پیش کیا اور مبارک باد دی۔ ان سب کو لگا کہ لاثان بن ایلش' ابراہیم بن کالب کے لیے لازم و ملزوم بن چکا ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے۔ بیت المقدس کا یہ عظیم کاہن اٹھتے بیٹھتے اسے کہانت کے اصول سمجھاتا' لوگوں سے محبت کی تعلیم دیتا' انصاف اور اخلاق کے درس دیتا' یہ باتیں ہاران بھی سنتا اور حوا بھی لیکن حوا کے سر سے گزر جاتیں۔ ہاں' ابراہیم بن کالب کا قرب اسے اچھا لگتا۔ اس کی موجودگی اسے بہت بھاتی' کبھی کبھی وہ اس کے قریب ہوجاتی' بازو ہلا ہلا کر یا اس کی داڑھی کو چھو کر پوچھتی۔

''بابا جان.....! آپ کو سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟''

تب ابراہیم بن کالب اسے بازو کے حلقے میں لے لیتا' اس کے نرم نرم بالوں کو چومتا اور کہتا۔ ''ہمیں سب سے زیادہ محبت اپنی بیٹی سے ہے۔''

''اور اس کے بعد؟'' وہ سب کو فخر سے دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کرتی۔

''اس کے بعد بھی اپنی بیٹی سے۔'' ابراہیم بن کہتا۔

''اور اس کے بعد؟'' وہ پھر سوال کرتی۔

''اپنی بیٹی سے۔''

یوں سوال اور جواب کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ سب جانتے تھے مگر یہ حقیقت تھی کہ ابراہیم بن کالب کو حوا سے حد درجہ محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس سے بات کرتے کرتے بھی کبھی کبھی وہ چونک جاتا۔ اسے لگتا' کسی نے کہا ہے۔

'ابراہیم بن کالب' اپنے خاندان کے اس آخری بیٹے کی کہانت اور منصب کے لیے تمہیں ابھی سے محنت کرنا چاہیے۔'

تب وہ لاثان بن ایلش کو ایک دم ہی کوئی نیا درس دینے لگتا۔ حوا پر سے گرفت کم ہوجاتی اور اسی وقت ہاران کو نزدیک آتا دیکھ کر حوا بھی جیسے سب کچھ بھول جاتی۔ لمبے قد کا دبلا پتلا کتابوں میں گم اور ہر دم کہانت کے آداب سیکھنے والا لاثان اسے متوجہ نہ رکھتا اور بابا جان بھی مصروف ہوتے تب ہاران کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہی ساتھی تھا' وہی دوست اور وہی پناہ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ساتھ مضبوط ہورہا تھا' انسیت بڑھ رہی تھی' ایک دوسرے کا ساتھ ضروری بنتا جارہا تھا' سب کی دنیا وسیع ہورہی تھی لیکن حوا کی دنیا سمٹ کر صرف ہاران تک محدود ہورہی تھی۔ بابا جان مصروف تھے' کوئی بات نہیں۔ لاثان چلا گیا' اب آتا بھی تو اہم نہ لگتا۔ علاقے کے بچے بھی ملتے' کبھی نہیں لیکن ہاران ساتھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ جذبہ پختہ ہوتا گیا اور اسے اندازہ ہی نہ ہوا۔ ہاں' جس دن ابراہیم بن کالب نے اعلان کیا۔

''ہاران.....! تمہاری علاقے کے مکتب کی تعلیم مکمل ہوچکی ہے۔ اب تمہیں فنِ حرب کی تربیت کے لیے جانا ہوگا۔''

حوا نے چونک کر دیکھا' ہاران بھی اسی کو دیکھ رہا تھا مگر بابا جان سے کچھ کہنے کی ہمت اس میں نہ تھی لہٰذا یہ کام اس نے کیا اور بولی۔

''بابا جان.....! ہاران کو فنِ حرب کی تربیت کیوں لینی ہے؟ وہ تو تاجر بنے گا۔''

''ہاں بیٹی.....!'' ابراہیم بن کالب نے پیار سے کہا۔ ''مگر کبھی کبھی تجارت میں بھی مقابلہ اور لڑائی کی ضرورت پیش آجاتی ہے لہٰذا فنِ حرب کی تربیت تو ہر لڑکے کے لیے ضروری ہے۔''

یہ آخری فیصلہ تھا گویا کہ ہاران بن ایلش کو گھر سے جانا تھا۔ اس وقت حوا کو لگا کہ ایک طویل ساتھ ہے جو چھوٹنے والا ہے۔ اتنا وقت تو اس نے ابراہیم بن کالب کے ساتھ بھی نہیں گزارا تھا لہٰذا اداسی لازمی تھی۔ اس نے کہا۔

''بابا جان.....! میرے ساتھ کون کھیلے گا؟ کون پڑھے گا؟''

''بیٹی.....! تم کسی بھی لڑکی کو دوست بنالو۔'' ابراہیم بن کالب نے اطمینان سے کہا۔ ''علاقے میں بہت سے گھر ہیں' بہت بچے ہیں' سب ہی تمہیں جانتے ہیں مگر ہاران کو تو شہ سواری اور شمشیر زنی ضرور سیکھنی ہے ورنہ وہ کسی بھی دشمن سے ہار جائے گا۔''

شاید ہاران نے اس بات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ بس افسردہ تھا' اداس تھا۔ ابراہیم بن کالب نے اسے پیار سے دیکھا اور بولا۔

''ہاران.....! سب ہی جوان گھروں سے جاتے ہیں' پڑھتے' لکھتے اور لڑائی کی تربیت لیتے ہیں پھر آج جاتے ہیں تو لگتا ہے' کل ہی واپس آگئے۔ مستقبل بنانے کے لیے چند برس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور پھر تم تو گھر سے بہت دور نہیں جاؤ گے' ہفتے' پندرہ دن میں گھر آتے رہوگے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ جس دن تم فنِ حرب کی تربیت مکمل کرو گے' جو مانگو گے' ملے گا۔''

ایک وعدہ ہوگیا۔ ہاران رخصت ہوگیا اور حوا چپ چاپ روتی رہ گئی۔ آنسو جو نظر نہیں آتے' سسکیاں جو سنائی نہیں دیتیں' بڑا دکھ دیتی ہیں۔ ایسے دکھ جو سمجھے جاتے ہیں نہ سمجھائے جاتے ہیں' صرف اپنا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہاران کی رخصتی کا دکھ بھی صرف اسی کا سرمایہ تھا۔ کسی سمجھ دار آدمی کو اس سے غرض ہی کیا تھی' بڑوں کے نزدیک ایسی بچکانہ باتوں کی اہمیت ہی کیا۔ کبھی ڈانٹ دیا' کبھی سمجھا دیا۔ ان کے پس پردہ کتنی خواہشات پامال ہوتی ہیں' کتنے جذبات کچلے جاتے ہیں' کوئی نہیں جان سکتا۔ ابراہیم بن کالب جیسے جلیل القدر عالم کے نزدیک بھی یہ باتیں بچپن اور ناسمجھی تھیں۔ ہاران کے لیے تعلیم و تربیت لازمی تھی۔ عمر بھر کا سوال تھا' نسلوں کا دارومدار تھا اور یہ افسردگی چند دن کی بات تھی۔ شاید جذباتی عمر سے گزرنے کے بعد جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی لہٰذا ہاران بن ایلش چلا گیا۔

حوا کو لگا جیسے اب وہ اکیلی رہ گئی ہے' تنہا رہ گئی ہے' کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا' یوں ہفتے کے ایک ایک دن کرکے سب دن گزر گئے۔ اس نے کچھ بھی نہ کیا' ہاں' اس دن ابراہیم بن کالب کے ساتھ لاثان اور ہاران دونوں آئے تو اسے لگا' خالی گھر میں بہار آگئی ہو اور ہاران کو بھی محسوس ہوا کہ آج بہت خوش ہے' مسرور ہے۔ اس دن وہ سب دنوں کی باتیں اسے سناتا رہا۔ فنِ حرب کی تعلیم اور یہ مکتب اس کے لیے نیا تھا اور حوا کے لیے بھی۔ وہ دلچسپی سے یہ سب سنتی رہی اور سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ باتیں اچھی لگ رہی ہیں یا یہ ساتھ خوشی دے رہا ہے؟ دن گزرا' رات بیتی اور ہاران پھر چلا گیا مگر اس بار وہ اس طرح نہیں روئی نہ اس نے بابا جان سے ضد کی بلکہ روانگی کے وقت سے ہی آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اب یہ ان سب کی زندگی کا معمول بن گیا کہ ایک ہفتے میں صرف ایک رات گزارنے آتے اور دوسرے دن صبح کی روشنی ہوتے ہی چلے جاتے۔

ایسے میں ابراہیم بن کالب حسب دستور کہانت کے آداب پر ہدایت دیتا رہتا' لاثان بن ایلش اس منصب کے لیے دن رات مصروف رہتا اور ہاران اس کے ساتھ ساتھ اس سے ان اچھے دنوں کی باتیں سنتا اور اپنے اچھے دنوں کی لمبی لمبی باتیں اسے سناتا۔ اس طرح آنا جانا ہوتا رہا اور وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔

اس وقت نے کتنی خواہشات کو مٹا کر کتنے جذبوں کو جنم دیا' کسی کو پتا نہ چلا۔ حوا کیا سوچتی ہے' یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس اسے خود لگتا کہ اس کا ہر تعلق' ہر خوشی اور ہر رشتہ صرف ایک نام ہے' ہاران بن

ایش' جس کی گرفت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ دل و دماغ کو اس سوچ' اس تصور سے آزاد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ کوئی یاد یا تصور نہیں' اس کا دل ہے' اس کی سوچ ہے۔ وہی اس کا پہلا ساتھی تھا اور وہی اس کا ہر ساتھی تھا۔ بابا جان کا تصور بھی کہیں دھندلا گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک مصروف ترین کاہن نے لے لی تھی۔ وہ کاہن جس پر سب کا حق تھا جواب مستقبل کا کاہن بنانے میں اس قدر مصروف تھا کہ بے پناہ محبت کے باوجود بھی اپنی بیٹی کو وقت نہیں دے سکتا تھا مگر اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وقت نے اسے ان سب کی مجبوریاں سمجھا دی تھیں اور اس کی سوچوں کا بھی تو ایک مرکز تھا جس سے اس نے ابتدائی سانس سے محبت کی تھی اور عمر نے اس محبت کو پختہ کر دیا تھا۔

بہت سا وقت گزر گیا' سیلہ تھکتی گئی۔ اب خدمت کے لیے کسی نئی خادمہ کی ضرورت تھی لیکن مکتب چھوڑنے کے بعد حوا سب کچھ خود کرنا چاہتی تھی۔ ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب پورے گھر کی صفائی کے بعد وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی تہہ بنا رہی تھی۔ سیلہ کھانا بنا کر اپنے کمرے میں آرام کے لیے جا چکی تھی کہ بڑے پھاٹک پر گھوڑا رکنے کی آواز نے اس کی توجہ لوٹ لی۔ اسے لگا' کوئی مہمان ہے جو دور سے سفر کرتا ہوا آیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑے پھاٹک پر متعین خادم ایسے آنے والوں کو ٹھہرانے اور میزبانی کرنے کا ذمے دار تھا مگر گھوڑا رکنے کے چند منٹ بعد ہی اندر کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ کیا خادم وہاں موجود نہیں تھا؟ اس بات سے زیادہ اسے اس بات کا تردد تھا کہ سیلہ بھی تھک کر آرام کرنے چلی گئی تھی اور اب شام سے پہلے جاگنے والی نہ تھی۔ دستک پھر ہوئی تب اس نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''ایک مسافر...... مصیبت زدہ...... پیاسا...''

یہ آواز بھی عجیب تھی۔ حوا پریشان ہوگئی۔ اس نے کہا۔

''کیا بڑے پھاٹک پر خادم نہیں ہے جو تم یہاں تک چلے آئے؟''

''جناب' اس مسافر کی مصیبت سننے والا وہاں کوئی نہیں ہے' آپ ہی تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔''

حوا گومگو کے عالم میں تھی' طویل گرم دوپہر' پیاسا مسافر لیکن لٹیروں کی بھی کمی نہ تھی اور پھر بڑے پھاٹک کا غلام کیا ہوا؟ ان سوچوں کے ساتھ ہی وہ اپنی آواز میں دبدبہ اور بے خوفی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''آپ بڑے دروازے پر ٹھہریں' میں آپ کو کھانا اور پانی بھجواتی ہوں۔''

''مگر مجھے یہاں بیٹھ کر کھانا ہے۔'' مسافر نے ضد کی تو حوا چونک گئی۔ اب اسے دھمکانے کی ایک ہی صورت تھی کہ اس علاقے کی سب عورتوں کی طرح وہ بھی اپنی مدد کے لیے اپنے مردوں کو پکارنے لگتی۔ بے شک وہ گھر میں موجود ہوں یا نہ ہوں' اس سے وہ ڈر کر بھاگ جاتا' اس وقت اس نے بھی بے ساختہ وہ نام لیا جو اسے بہت عزیز تھا۔ جس سے محبت اور اعتماد کا ہر رشتہ قائم تھا۔ اس نے زور سے کہا۔

''ہاران...... اِیچے آؤ' ذرا اس مسافر کو پانی پلا دو۔''

''اچھا' آتا ہوں۔'' اس جواب کے ساتھ اچانک دروازہ کھل گیا اور مسافر بھاگنے کی بجائے اندر آگیا۔ حوا نے اندر آتے ہوئے ہاران کو دیکھا۔ حیرت' مسرت اور ستائش کے جذبوں نے ایک ساتھ یلغار کی اور فضا قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اس نے کہا۔

''اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ یقین کرنے کے لیے کہ مصیبت کے وقت تمہارے لبوں پر ہمارا ہی نام آتا ہے۔'' ہاران نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ آپ کا ہی نام پکارا۔''

''کیا تم کوئی اور نام بھی پکار سکتی ہو؟'' ہاران نے پوچھا۔

''آج آپ لاثان اور بابا جان سے پہلے کیسے آ گئے؟'' اس نے بات ٹالنی چاہی تو ہاران نے کہا۔

''اب ہم کبھی نہ جانے کے لیے آگئے ہیں یعنی فنِ حرب کی تربیت مکمل' اب شادی پھر تجارت۔''

اسی لمحے حوا نے رخ موڑ لیا اور واپس جاتے ہوئے بولی۔

''آپ پہلے کھانا کھائیں گے یا سفر سے واپسی کے بعد غسل کریں گے؟''

''کیا تم نے کھانا کھا لیا؟'' ہاران نے پوچھا۔

''نہیں' سیلہ کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور میں دھلے ہوئے کپڑے سمیٹ رہی تھی کہ اس کام کے بعد کھاؤں گی۔''

''تو پھر آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران ہم تمہیں اپنی شاندار کامیابی کے قصے سنائیں گے اور تم داد دو گی۔''

اس دن ان دونوں نے ہمیشہ کی طرح بہت سا وقت ساتھ گزارا' بہت ساری باتیں کیں جس طرح بچپن سے کرتے تھے لیکن حوا کو لگا کہ آج خوشی کا کوئی اور انداز ہے۔ ہاران واپس آ گیا تھا مگر کبھی نہ جانے کے لیے اور عین اسی وقت خود ہاران بھی سوچ رہا تھا کہ اس بار ابراہیم کو وہ بات یاد دلائے گا جو اس نے فنِ حرب کی تربیت کے لیے جانے سے پہلے کہی تھی۔

''ہاران......! جب تم اپنی تربیت مکمل کر کے آؤ گے تو جو مانگو گے' ملے گا۔'' اور ہاران نے اس وعدے کو دل پر لکھ لیا تھا۔ اس بار وہ یہ وعدہ یاد دلانے والا تھا۔ الغرض کہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مصروف' آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی موجودگی سے حظ اٹھا رہے تھے۔ ایسے میں انہیں خود اپنے جذبوں کو پہچان لینے میں دیر نہ لگی۔ جب حوا کام میں مصروف ہوتی اور ہاران مدد کرتا تو انہیں لگتا' یہ وہ بچپن والی حوا نہیں ہے نہ وہ سادہ سا ہاران جو مل جُل کر کام کرتے تھے بلکہ اب ہر بات تقریر اور سماعت کی حد سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب تقریر میں جتنے معنی ہوتے' سماعت میں اس سے زیادہ اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ حوا کو لگتا' ہاران کے سانس لینے میں بھی سیکڑوں جذبے پوشیدہ ہیں' ہر بات بامعنی اور ہر کام بامقصد لگتا۔

یوں اس بار دونوں ملے تو جذبوں کے نئے نئے معنی آشکار ہوتے گئے اور انہیں لگا کہ شعور' سمجھ' عقل سب کچھ آنے سے قبل انہوں نے محبت کی ہے...... محبت ...... پتا نہیں کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟ انہیں اس سے بھی غرض نہ تھی' بس انہیں تو لگتا تھا کہ محبت ان کے خون میں گردش کر رہی ہے' سانس کی آمد و رفت کے ساتھ جاری ہے' محبت کا تصور بڑا خوش آیند لگتا ہے جبکہ سامنے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو۔ ہر دم ساتھ رہنے اور کھیلنے والے دو بچے اپنے سوا کسی کے بارے میں سوچتے ہی نہ تھے اور کس کے لیے سوچتے؟ اپنے سوا انہوں نے کسی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ایک ابراہیم بن کالب' بیت المقدس کا عظیم کاہن اور دوسرا لاثان بن ایش' مستقبل کا کاہن' ان دو کو فرصت ہی نہ تھی۔

اس بار ان دونوں کو آنا تھا مگر نہیں آئے۔ حوا رات گہری ہونے تک انتظار کرتی رہی مگر خبر ملی کہ لاثان بن ایش کو توریت مقدس کی تعلیم کے ساتھ اب مقدس مقامات کی سیر بھی کرنی ہے۔ ایسے میں وہ سفر پر جانے والا ہے اور ابراہیم بن کالب طالبانِ علم کے اس قافلے کو روانہ کر کے ہی آئیں گے۔ حوا کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اسے لاثان بن ایش کے نہ آنے کی پروا نہ تھی۔ ہاں' ابراہیم کا انتظار ضرور تھا جس کے لیے وہ نت نئے کھانے بناتی تھی' تیاری کرتی تھی۔ اگر ہاران نہ ہوتا تو شاید وہ افسردگی سے رو دیتی لیکن جس نے ہر اداسی اور ہر دکھ کے بعد اسے ہنسایا تھا' وہ اب بھی موجود تھا لہٰذا چند لمحے کی اداسی کے بعد وہ پھر ہنس دی اور وقت پھر گزرنے لگا۔

گھنٹے' دنوں میں اور دن' ہفتوں میں بیت گئے اور ایک دن ابراہیم بن کالب آ گیا۔ حوا کو لگا' فضاؤں میں ٹھنڈک ہے' ہواؤں میں مہک ہے اور یہ دن خوشیوں سے بھرپور دن ہے۔ اب وہ تینوں ہوتے اور زمانے بھر کی باتیں۔ ہمیشہ ابراہیم کی توجہ لاثان کی طرف رہتی' اس کی تعلیم' کہانت کا مقدس پیشہ۔ خاندان بنی لاوی کا یہ جوان جس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں حوا کو نہ اس جوان سے غرض تھی نہ کہانت کے مقدس منصب سے اور نہ خاندان بنی لاوی سے۔ ہاں' ابراہیم دیر تک لاثان کی باتیں کرتا تو اسے اچھا نہ لگتا۔ دل چاہتا کہ اب وہ ہاران کی باتیں کریں۔ ابراہیم بن کالب کو ہاران سے بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی لاثان سے۔ وہ تینوں جمع ہوتے تو بہت ساری

باتیں ہوتیں، ماضی کی، حال کی، مستقبل کی۔ حوا بھی ان میں حصہ لیتی۔ اس دن ابراہیم نے کہا۔

''موسیٰ کے رب سے دُعا کرو کہ وہ بنی لاوی کے جس لڑکے کو مستقبل کا کاہن بنائے، وہ لاثان بن ایش ہی ہو۔''

''کیوں بابا جان؟'' حوا نے حیران ہو کر دیکھا۔

''اچھا کام کرنے کے لیے کوئی بھی ہوسکتا ہے، لاثان ہی کیوں؟'' ابراہیم بن کالب نے ہنس کر اسے دیکھا۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی معصوم بھی۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ حوا نے نیا سوال کیا اور بولی۔

''بابا جان! آپ نے کہانت کے لیے لاثان ہی کا کیوں انتخاب کیا ہے؟ کیا ہاران ذہین نہیں ہے؟''

''ہاران، لاثان سے بہت زیادہ حسین بھی ہے، ذہین بھی اور بہادر بھی۔'' ابراہیم بن کالب نے سمجھایا۔ ''لیکن بنی لاوی برسوں سے کہانت کے لیے بڑے بیٹے کو ہی تیار کرتے ہیں۔ میرے باپ نے مجھے علم دیا اور ایش کو تاجر بنایا۔ اب میں نے لاثان کو علم دیا اور ہاران کو تاجر بناؤں گا تاکہ ہمارے خاندان میں علم بھی رہے اور تجارت بھی۔''

''لیکن بابا جان، بنی لاوی میں جن کے ایک ہی بیٹا ہو، وہ کیا کرتے ہیں؟'' اس بار ابراہیم بن کالب بے ساختہ ہنس دیا۔ اسے لگا کہ حوا کی معصومیت بھی ذہانت ہے جس پر وہ فخر کرسکتا ہے۔ وقت یونہی گزرتا رہا، حوا کی معصومیت اور ہاران کی شرارتیں ابراہیم کو سارے غم بھلا دیتیں۔ اس دن وہ دھوپ کی زد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حوا نے عقب سے آ کر اس کی آنکھیں بند کرلیں۔ ایسے میں جب تک وہ پہچانتا نہیں تھا، وہ چھوڑتی نہیں تھی اور اس دن ابراہیم بن کالب بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ اس نے کہا۔

''میں پہچان گیا، تو کون ہے، یہ ہاتھ ہاران کے ہیں۔'' اس وقت حوا کا ہنسی سے برا حال تھا۔ ہاران نے یہ منظر دیکھا اور بولا۔

''نہیں، میں یہاں ہوں۔''

''اچھا؟'' ابراہیم نے تجاہل عارفانہ برتا اور شرارت سے بولا۔ ''تو پھر یہ لاثان کے ہاتھ ہیں۔''

''مگر لاثان کی کلائیوں پر تو بال ہیں؟'' لاثان نے مذاق سے اس کی بات کاٹی۔

''اوہو......'' ابراہیم نے کہا۔ ''میں نے پہچان لیا، یہ ہاتھ سبیطہ کے ہیں۔'' اب فضا قہقہوں سے گونج گئی۔ سبیطہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی اور حوا اور ہاران تو تھے ہی بہت خوش اور ابراہیم کو ان سب کی خوشیاں ہی اچھی لگتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا کہ لاثان کو کہانت کے مزید علم کے لیے انتخاب کرلیا جائے اور حوا کو ہر عیش نصیب ہو، ہاران بنی لاوی کا معزز تاجر کہلائے۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بار بار تمنا کرتا۔ ایسے میں ہاران اسے اس کا پرانا وعدہ یاد دلانے کا موقع تلاش کرتا رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا، اسے کہے۔ 'بابا، حوا میری زندگی ہے، اسے میں جان دے کر بھی حاصل کرنا اور خوش رکھنا چاہتا ہوں۔'' مگر یہ سب کہتے ہوئے وہ جھجک جاتا اور وقت ہاتھ سے نکل جاتا۔ آخر ایک دن اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے کہا۔

''بابا، آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے جب آپ نے کہا تھا کہ جب میں اپنی تربیت مکمل کر کے لوٹوں گا تو جو مانگوں گا، ملے گا؟''

''ہاں، ہاں، مجھے اپنا وعدہ خوب یاد ہے۔'' ابراہیم نے یاد کیا۔ ''مگر تو کیا مانگے گا؟''

''جو مانگوں گا، وہ دے دیں گے؟'' ہاران نے پکا وعدہ لینا چاہا۔

''ارے، کیا تو مجھ سے پھر سے عہد لینا چاہتا ہے؟'' ابراہیم نے ہنس کر کہا۔ ''ارے پاگل، میں نے تو تیرے باپ کو بھی پالا تھا اور تجھے بھی۔ بھلا کیا کوئی اپنی اولاد کو مایوس کرتا ہے؟ میرے پاس جو کچھ بھی ہے، تم ہی لوگوں کا تو ہے اور تو کیا مانگنے والا ہے، کیا میں جانتا نہیں، میں جو تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

اس وقت ہاران کی آنکھیں چمک گئیں۔ اسے خوامخواہ ہی لگا کہ ابراہیم سب جانتا ہے۔ وہ جھینپ سا گیا اور اسے آزمانے کو بولا۔

''اچھا، بتائیے کہ میں آپ سے کیا مانگنے والا ہوں؟''

اس وقت ابراہیم نے اس خوب صورت جوان کو محبت سے دیکھا جو بلاشبہ بہت چنچل، بہت حسین تھا، بہت ہنس مکھ تھا۔ چند لمحے محبت اور تجسس سے دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

''او شریر لڑکے، میں جانتا ہوں تو کیا مانگے گا۔ ایک لمبے تجارتی سفر کی اجازت۔''

ہاران بے ساختہ افسردہ سی ہنسی ہنس دیا۔ علم کے کمال کو پہنچ کر بھی یہ مقدس کاہن اپنی ہی اولاد کے جذبات سے ناواقف تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ کہہ دے۔ ''مجھے تجارتی سفر کی نہیں، حوا کی ضرورت ہے، حوا جو میری تمنا ہے، میری زندگی ہے۔'' مگر وہ یہ سب ایک دم سے کہہ نہ سکا اور کہنے کا موقع بھی نہ ملا۔ حوا کھانے کی اطلاع دینے اسی طرف آ رہی تھی، ان دونوں کو خوش و مسرور دیکھ کر وہ بھی مسرور ہوگئی۔

اس رات جب کھانے کے بعد وہ دونوں کھلے آسمان کے نیچے چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے، عین اسی وقت ابراہیم اپنی خواب گاہ میں لیٹا ہوا ایش بن کالب سے کیے ہوئے وعدے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے مرتے ہوئے کہا تھا۔ ''لاثان اور ہاران کا خیال رکھیے گا۔'' اور اس خواہش پر ابراہیم نے عمر بھر عمل کیا تھا۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے زندہ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ لاثان کو عالم بنانے کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور ہاران کی تعلیم اور حربی تربیت اسی محبت کا نتیجہ تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی آرزو کی تھی کہ اس کے دونوں بھتیجے نامور عالم اور بڑے تاجر بنیں اور اب اس کی تکمیل کے لیے اس کے دل میں تمنا مچل رہی تھی کہ ہاران کو تجارتی سفر پر جانے کی اجازت دے دے اور حوا اور لاثان کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر دے۔ اس کے خیال میں لاثان جیسا عالم اور سنجیدہ مزاج جوان ہی حوا کی قدر کرسکتا تھا۔ وہ یہ سب سوچتا رہا، غور کرتا رہا مگر اسے پتا ہی نہ تھا کہ ان کی خوشی کیا ہے؟ ہاں، اگر وہ اس وقت کھلے آسمان کے نیچے خوش اور مسرور ہونے والے ان دونوں بچوں کو دیکھ لیتا تو شاید جان جاتا کہ ان کی خوشی کیا ہے لیکن والدین اولاد کو خوشیاں ان کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے پیمانے سے ناپ کر دیتے ہیں۔ اس کا بھی اپنا پیمانہ تھا، وہ بھی ناپ کر دینا چاہتا تھا، پیاس بجھے نہ بجھے، یہ ان کا نصیب۔ یہ رات گزر گئی۔ دوسری صبح بہت بڑی خوشی لائی۔ لاثان بن ایش اپنے تعلیمی سفر سے واپس آ گیا تھا مگر رات میں کس وقت آیا، یہ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ صبح ہاران نے تعجب سے کہا۔

''بھائی! آپ رات کس وقت آئے؟''

''تم سب آرام کر رہے تھے۔ میں نے بے آرام کرنا گوارا نہیں کیا۔'' لاثان نے جواب دیا۔ ''اور پھر راستے میں سرائے سے کھانا کھا کر آیا تھا لہٰذا خادم نے دروازہ کھول دیا اور میں آ کر لیٹ گیا۔''

حوا کو یہ بات عجیب سی لگی۔ بھلا اتنے عرصے بعد کوئی اپنے ہی گھر میں اتنے پھیکے انداز سے آتا ہے؟ مگر اس نے اس وقت کچھ نہ کہا، ہاں، جب ہاران سے کہا تو وہ بولا۔

''دراصل بھائی کسی کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتے، وہ بہت عظیم ہیں۔ بس دینا جانتے ہیں، لیتے کچھ بھی نہیں۔''

یہ بات غلط نہیں تھی۔ لاثان بن ایش بے ضرر فطرت کا مالک تھا۔ علم کے سوا کسی شئے سے غرض نہ تھی۔ اپنی کوئی آرزو نہ تھی، کوئی طلب نہ تھی اسی لیے جب ابراہیم بن کالب نے کہا۔

''میرے بھتیجے لاثان بن ایش! تمہارے لیے میرے دل میں عجیب سی آرزو مچل رہی ہے۔ اگر میں تمہارے لیے کوئی فیصلہ کروں تو قبول کرو گے؟''

''بابا! آپ سے ہٹ کر نہ میں کچھ ہوں نہ میرا کوئی فیصلہ۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے اور مجھے آپ کا ہر حکم منظور ہے۔'' لاثان نے کہا۔

''حکم نہیں، بس میری خواہش ہے کہ میں تمہیں حوا سے منسوب کردوں۔ اگر تمہاری کوئی اور پسند نہیں......''

''میری کوئی پسند نہیں۔'' لاثان نے جواب میں جلدی کی۔ ''آج تک حصول علم کے سوا میں نے کوئی آرزو بھی نہیں کی یہاں تک کہ آج سے قبل میں نے

حوا کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب جبکہ وہ آپ کی آرزو ہے تو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہستی ہوکر رہے گی۔''

ابراہیم بن کالب اس بھتیجے پر جتنا بھی فخر کرتا' کم تھا جس نے کم عمری میں ہی علم بھی حاصل کرلیا تھا اور تمام مقدس مقامات کی زیارتیں بھی۔ اب اسے کہانت کے منصب سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت فرماں بردار تھا' اطاعت گزار تھا۔ آج حوا کے مستقبل کی طرف سے وہ مطمئن ہوگیا تھا۔

دوسرے دن سننے والوں نے اس اعلان کو حیرت اور خوشی کے ساتھ سنا جب بیت المقدس کے عظیم کاہن نے کہا۔

''میں نے اپنی تمناؤں سے مانگی ہوئی بیٹی کے لیے جس سے میں دنیا جہان میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں' ایک اعلیٰ ترین جوان کا انتخاب کرلیا اور وہ ہے میرا بھتیجا لاثان بن ایش۔''

اس وقت سب نے خوشی کا اظہار کیا' مبارک باد دی اور حوا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ نجانے غم کی کیفیت چھپانا چاہتی تھی یا آنسو روکنا مقصود تھا؟ ہاران بن ایش نے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھا۔ ابراہیم بن کالب' اس کا عظیم چچا تھا' اس کا محسن تھا' مربی تھا جسے اس نے کبھی دکھ دینا نہیں چاہا تھا اور دوسرا لاثان بن ایش تھا۔ اس کا محبوب بھائی جس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا' کبھی ضد نہیں کی تھی اور اس کی خوشی اسے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کا صحت مند چہرہ مسرور تھا۔ ہاران کو اس کی مسرت اچھی لگی۔ اس کے رخ کے گرد نور کا ہالہ اس کے پاکیزہ کردار کی گواہی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی محرومیوں' اپنے غموں کو ضبط کرتے ہوئے سوچا۔

'ہاران' بے شک حوا کو ایسے ہی پاکیزہ کردار جوان کی ضرورت ہے۔'

غرض کہ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جو مسرور تھے' مبارک باد دے رہے تھے اور جو غمگین تھے' غموں کے جام پی گئے تھے۔ غم کے جام پینا زہر کے جام پینے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ وہ تڑپے' مچلے اور موت کے سوا ہر اذیت سے گزر گئے اور کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے انداز سے خوشی منائی مگر اس شام اندھیرا ہونے کے بعد ہاران بن ایش نے تاریکی کی زد میں کھڑے کھڑے ابراہیم بن کالب سے کہا۔

''بابا' آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا کہ مجھے طویل تجارتی سفر کی اجازت دیں گے؟''

''تمہیں اجازت ہے بیٹے!'' ابراہیم بن کالب نے تاریکی کے سبب اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور پیار سے بولا۔ ''تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہاری ترقی' میری ترقی ہے مگر تمہاری آواز کیوں رندھ رہی ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' ہاران مزید اندھیرے کی طرف پلٹ گیا۔ ''موسم خراب ہے......''

''اور تم لوگ احتیاط بھی نہیں کرتے۔'' ابراہیم نے محبت سے کہا۔ ''جانتے نہیں ہو نا کہ تمہاری تکلیف سے مجھ پر کیا قیامت گزر جاتی ہے۔ باپ بنو گے تو پتا چلے گا۔ ہاں' تمہارا تجارتی قافلہ کب روانہ ہونے والا ہے؟''

''بابا! شاید مجھے آج رات ہی جانا پڑ جائے۔''

ہاران نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جو لوگ کثیرالاولاد ہوتے ہیں' جنہیں بن مانگے ہی اولاد مل جاتی ہے' وہ بھی اپنی اولاد کو یہی کچھ دیتے ہیں اور ابراہیم بن کالب نے اپنی ترسی ہوئی محبت کے لیے ''جبلِ موسیٰ'' پر جاکر موسیٰ کے رب سے اس نعمت کی آرزو کی تھی جسے رب نے سن لیا تھا اور شادی کے برسوں بعد یہ بیٹی عطا کردی تھی۔ اس نے بھی اس بیٹی کو یہی کچھ دیا تھا۔ کپڑا' روٹی اور خود فیصلے کے نام پر زندگی کا ساتھی۔ لاثان بن ایش سنجیدہ' باوقار' محبت کرنے اور دکھ درد کو محسوس کرنے والا وہ جوان جو بابا جان کی نظر میں ہی نہیں بلکہ سب کی نظروں میں اعلیٰ و ارفع تھا' اگر اس نے ہاران بن ایش کی پرستش نہ کی ہوتی تو اس کی پسند بابا جان سے جدا نہ ہوتی۔ سر تو اس نے اب بھی جھکا دیا تھا مگر دل کا نقش انمٹ تھا۔ ہاں' باپ کی محبت نے اس کی محبت کا خون کردیا تھا۔

(اس کہانی کا دوسرا حصہ آئندہ ماہ پڑھیے)

اس ماہ کی خاص کہانی

ایک ریٹائرڈ فوجی جنرل کی یادتحریر کی صورت

بازخار

منیر نیازی کا انتخاب

> واپس نہ جانا وہاں کہ تیرے شہر میں منیر
> جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

احمد توفیق جیلانی

امام بارگاہ کرنل مقبول حسین سے منسلک ایک دبلی پتلی گلی فقط چند قدموں کی مسافت پر پیچ در پیچ تاریک راہ داریوں میں پیوست ہوجاتی۔ ''کلاسٹرفوبک'' نما یہ طرزِ تعمیر نچلے طبقے کے



ہندوؤں کا خاصہ رہی ہے۔ دلی تنگ کی مانند بھول بھلیوں جیسی ایک ایسی گلی بھی تھی جہاں صبح و شام ہارمونیم' سارنگی' اور الغوزے کی مدھر دھنیں راہ گیروں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتیں۔

یہ رہائش گاہ قاضی احمد کی تھی۔ بحیثیت پیشہ ور موسیقار' تقسیم ہند سے قبل آپ Bombay Talkies میں بطور اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر رہے۔ لاہور مستقل آباد ہونے میں ناکامی کے بعد پنڈی آگئے شام ڈھلتے ہی آپ کی رہائش گاہ پر موسیقی سیکھنے والے طلباء طالبات کا تانتا بندھا رہتا۔

راجہ بازار سے منسلک بدنام زمانہ قصائی گلی راولپنڈی کا ایک مشہور ومعروف تاریخی مقام تھا۔ وجہ شہرت چھوٹے گوشت کی دکانیں' شادی بیاہ سے متعلقہ ساز وسامان کے کھوکھے' بالا خانے اور گانے بجانے کے ٹھیکے' یہاں سے وابستہ فنکار قاضی صاحب سے سر اور تال میں نکھار پیدا کرنے یا پھر ایڈ وانس ٹریننگ حاصل کرنے اُن کی رہائش گاہ پر ریاض کرتے۔

قصائی گلی میں منعقد محفلیں خالصتاً موسیقی سے رغبت رکھنے والوں کے لیے سجتیں اور ان ہی کے دم سے قائم تھیں۔ بدکاری' جسم فروشی اور دوسرے گھناؤنے کاروبار میں دلچسپی لینے والے لوگ سرائے بیلی رام' رتہ امرال جیسی جگہوں کا رخ کرتے۔

ہندوستان سے ہجرت کیے اجڑے خاندانوں میں ایک کنبہ وزیر علی کا بھی تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ ایک منجھے سارنگی نواز تھے۔ آپ کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ بیگم اختر' مراد آبادی' پنکج ملک' خورشید' جگ موہن اور کندن لال سہگل' وزیر علی کی شرکت کے بغیر آرکیسٹرا کو ادھورا سمجھتے۔ آپ کا فلمی نام ماسٹر مدن لال جی تھا۔ سنہ 1948ء کے اوائل میں' کے ایل سہگل نے لاہور میں 'شو' کرنے کی حامی بھرتے اصرار کیا کہ مدن لال کی موجودگی کو ضروری بنایا جائے۔ خاصی تگ و دو کرنے کے بعد سنگیت سازوں کے بالا خانوں سے موصوف کی رہائش کا کھرا آریہ محلّہ جا نکلا۔ آپ کی شمولیت نے میوزیکل شو کو چار چاند لگادیے۔

شو کے اختتام پر سہگل صاحب نے ماسٹر مدن لال کو واپس بھارت آنے پر رضامند کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ شنید ہے مدن لال نے زیرلب مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''بہت بہت دھنے واد..... کندن لال جی' اب ہمارا جینا مرنا اسی دھرتی کے ساتھ طے پاچکا ہے۔''

شومئی قسمت وطن کی لگن نے انہیں مفلسی اور غربت کے علاوہ کچھ نہ دیا اُس کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے صابر علی کو اچھی تعلیم دلوانے کی خاطر مشہور ومعروف 'سینٹ تھریسا' مشنری اسکول میں داخل کروادیا۔

وقت کے دھارے نے ایسا پلٹا کھایا کہ رقص وسرور کی محفلیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ سازندے موسیقار اور فنکار دھندہ چھوڑ' گزر اوقات کی خاطر چھوٹے موٹے پیشوں سے منسلک ہو گئے۔ یہ بجلی ماسٹر مدن پر بھی گری' قاضی احمد کے وساطت سے 502 ورکشاپ میں نوکری ملی۔ اچھے رویے اور اچھی کارکردگی کے باوجود مقامی لوگوں کی اکثریت نے انہیں دل سے قبول نہ کیا۔ ساتھی محنت کش اُن پر آواز کستے۔ بھیا' ہندوستانی اور مٹروے جیسے القاب روز مرہ کا معمول بن گئے۔ دل برداشتہ وزیر علی نے بالآخر ملازمت

چھوڑ دی۔

پھر ایک وقت آیا 'میوزک ایوننگ' زور پکڑنے لگیں لیکن موسیقی کے ساز و سامان کی جدت نے سارنگی کو 'اولڈ فیشن' اور فرسودہ ساز ڈیکلیئر کرتے ہوئے اِسے پکے راگوں تک محدود کردیا۔ بھوک اور افلاس نے وزیر علی کو پٹڑی سے اتار دیا۔ قصائی گلی کے پرانے شناسا آڑے آئے۔

بدقماشی' جس سے وزیر علی عمر بھر بدکنار رہا اب اُس کا ذریعہ معاش بن گئی۔ شراب کی بھٹیاں' ٹھیکہ افیون اور بھنگ کی کیپوں کی فروخت کا کاروبار کسی کی شراکت کے بغیر وزیر علی کی زیر نگرانی ہونے لگا۔ آسودگی اور معاشی خوشحالی نے اپنا اثر صابر علی پر بھی ظاہر کیا۔ آریہ محلہ میں رہائش اور سینٹ تھریسا اسکول کا درمیانی فاصلہ چند سو گز ہونے کے باوجود وزیر علی اپنے بیٹے صابر علی کو نئی نویلی واکس ہال (Vauxhal) موٹر کار میں خود چھوڑنے آتا۔ عمر میں مجھ سے چند برس سینئر ہونے کے باوجود صابر کی میرے ساتھ گاڑھی چھنتی۔

مشنری اسکول کے الگ تھلگ قطعہ میں ایک چھوٹا سا گرجا گھر اور اس کے ساتھ منسلک ایک پہاڑی جس کے بیچوں بیچ کھڑا حضرت مریمؑ کا رنگدار مجسمہ بہت خوشنما منظر پیش کرتا۔ ''مارننگ گلوری'' کے پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی یہ پہاڑی میری اور صابر کی دوستی کا مرکز اس وقت بنی جب ہر ہفتے کی صبح طلباء و طالبات کی اسمبلی ہوتی۔ اجتماعی دعا کی جاتی جس کے اختتامی الفاظ کچھ یوں ہوتے۔

''اے خدا اے ہمارے 'باپ' ہمارے اوپر رحم کر۔''

ایسی ہی ایک صبح ساتھ والی قطار میں کھڑے صابر نے سرگوشی میں مجھے خبردار کیا کہ اس دعا کا حصہ ہرگز نہ بنوں!

گھر پہنچتے والد محترم کی توجہ جب اس دعا کی طرف دلوائی تو آپ خاموش ہوگئے۔ پھر میری پیٹھ تھپتھپاتے بولے۔

''ہمارے ملک میں تعلیم عام کرنے میں مشنری اسکولوں کا کردار نہ صرف اہم ہے بلکہ قابل تحسین بھی ہے۔ جب یہ قابل اعتراض دعا کی جائے تو آپ خاموش کھڑے رہیں' کوئی مضائقہ نہیں۔''

ایک دن خبر آئی کہ وزیر علی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مفلسی گویا آنگن میں تیار کھڑی تھی تعلیم چھوٹی اور صابر باپ کی ڈگر پر چل نکلا۔ وراثتی کاروبار کو خوب سنبھالا باوجود کہ یہ ایک کٹھن راہ تھی۔

لڑائی مار کٹائی' چاقو زنی' دنگا فساد' اغواء برائے تاوان' بردہ فروشی اور پولیس مقابلے' یہ تمام مراحل صابر نے نہایت مہارت سے طے کیے اور ''علاقہ بندمعاش'' بن گیا۔ پنڈی بھر میں اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر نہ جانے کیوں اور کیسے حج کی سعادت حاصل کی۔

واپسی پر بے پناہ تبدیلیاں ساتھ لایا۔ مخصوص علاقوں کے اِس بے تاج بادشاہ نے نہ جانے کتنی ستم رسیدہ خواتین کو بردہ فروشوں کے چنگل سے آزاد کروا کر سرائے بیلی رام اور ویسٹریج کے درمیان ایک پرانی کرائے کی حویلی میں پناہ دی۔ دھندے سے منسلک خواتین اور ان کے بچوں کی فلاح و بہبود میں دن رات مشغول صابر ہر سال حج کی سعادت سے فیض یاب ہوتے ہوئے 'حاجی صابر علی سرائے بیلی رام والے' کے نام

سے پہچانا جانے لگا۔

موہن پورہ کی رہائشی سورن لتا پیدائشی ہندو تھی۔ ہر منگل کی صبح پوجا پاٹ کے دوران اپنی من موہنی سندر آواز میں جب یہ بھجن الاپتی'

''تیرے مندر کا ہوں دیپک جل رہا''

تو مندر میں بیٹھے شرنارتھی آنکھیں موندے لہکنے لگتے۔ مندر کے پجاری شری رام دیو نے اس کی آواز میں مزید نکھار پیدا کرنے کی خاطر قاضی احمد سے درخواست کی کہ اُن کی پُتری کو شاگردی میں لے لیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے گیت کی ریہرسل کے دوران ہی اِردگرد کے بالا خانوں اور کوٹھوں کے فنکاروں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اتنی کم عمر' اتنی سریلی اور اتنی شیریں ادا؟

لتا منگیشکر کے مشہور گیت' تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے؟' کی مسحور کن ادائیگی کے دوران حاضرین و ناظرین افسوں زدہ سے ہوگئے۔

قاضی احمد نے اٹھ کر بچی کا ماتھا چوما اور صرف اتنا کہا۔

''یہ آواز اللہ کی دین ہے' بیٹا آپ کو ٹریننگ نہیں سازندوں کی ضرورت ہے۔''

اور پھر یوں چندر بدن' چندر مکھی' سورن لتا' چھوٹا لتا' کے نام سے مشہور ہوگئی۔

گرمیوں کی اُس شام کی یہ محفل چندرئیس زادوں کی فرمائش پر کرتین بائی کے کوٹھے پر منعقد ہوئی تھی۔

بازار اور اُس کے ساتھ منسلک گلی کوچوں میں روز مرہ کی طرح رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ موتیے کے ہار اور گجروں کی بھرمار نے پورے محلے کو بھینی بھینی خوشبو سے معطر کر رکھا تھا۔

نحوست ماری عورتیں دن بھر پلنگ توڑنے کے بعد شام ڈھلتے ہی چاک و چوبند ہوگئیں۔

چھوٹی لتا کی آمد آمد تھی۔ سفید چاندنی پر گاؤ تکیے لگائے نیم دراز تماش بین شراب سے لطف اندوز ہوتے وقتاً فوقتاً راہ داری کی جانب تکتے۔

دھان پان سی چھوٹی لتا' اپنی ماں کے ہمراہ سر ڈھانپے تانگہ سے اتری اور نہایت اعتماد سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ خوش آمدید کی نعروں کے شور و غوغا میں چیف سازندے نے ایک بھاری بھرکم موتیے کی کلیوں سے لدا ہار پیش کیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر آشیر باد دی۔

یہ انداز آمد' یہ رکھ رکھاؤ اور شان و شوکت صابر علی کے لیے موجب حیرت بنا۔ کوٹھے کے بالمقابل کھدو میراثی کے جھرو کے سے یہ سب کچھ بغور مشاہدہ کرتے اُس نے سوالیہ نظریں ڈالیں؟

سرکار' یہ یہاں کی نہیں' کسی مندر کی داسی ہے۔ ہندو لی ہے۔ بہت اچھا گاتی ہے' ایک بیٹھک کے پانچ سو روپیہ لیتی ہے اُس کی ماتا!''

کھدو نے انٹیلی جنس یونٹ کے فیلڈ اسٹاف کی طرح موٹی موٹی معلومات فرفر اُگلتے' دو سو چون شراب کی بوتلوں کی سپلائی وصول کی' پیمنٹ ادا کی اور صابر کو الوداع کہنے کی خاطر اُس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔

ہاتھ کے اشارے سے' بس ٹھیک ہے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں' کا اشارہ کرتے صابر علی گلی میں آ گیا۔ اوپل ریکارڈ کار کا دروازہ کھولا' پھر نہ جانے کیا سوچتے گاڑی بند کی اور کرتین بائی کی بزم گاہ کی جانب چل دیا۔ سیڑھیاں چڑھتے سازندوں کے سر تال میں باہمی ربط پیدا کرنے کی گونج سنائی دینے لگی' دیدہ زیب بلوری فانوسوں سے مرصع یہ کوٹھا تماش بینوں کے ذوق رقص و سرود کو مدنظر رکھتے آراستہ کیا گیا تھا۔ سفید چاندنی چوکور سرخ رنگ کے ایک چھوٹے سے مخملی گدیلے پر بیٹھی یہ گلوکارہ نظریں جھکائے آرکیسٹرا کی منتظر تھی۔

صابر علی کو اپنے درمیان پا کر کرتین بائی خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ صابر نے کبھی تماش بینی نہیں کی۔ جب بھی کبھی ٹھیکے پر آنا ہوتا تو مقصد سو فیصد کاروباری ہوتا۔ یہ خوشگوار سی تبدیلی کم از کم کرتین کے لیے نہایت حیران کن تھی۔

چیف سازندے نے تیاری کا اشارہ دیا۔

چھوٹی لتا نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ حاضرین مجلس کا فرداً فرداً چہرہ کرتے فرشی سلام پیش کیا۔ پھر صابر علی سے نظریں چار ہوئیں۔ گندمی رنگت' مناسب قد و قامت' تیکھی ناک' صاف شفاف چہرہ اور ہونٹوں پر ایک مبہم سی اُداس مسکراہٹ' یہ نووارد کون تھا۔ لتا نے سرگوشی میں ماں سے پوچھا؟ چند سنٹ مزید خاموش بیٹھے رہنے کے بعد صابر علی دھیرے سے اٹھا اور غلام گردش کی جانب چل دیا۔ سیڑھیاں اترنے تک' ساز و آواز متحرک ہو گئے۔

چھوٹی لتا نے جب ''کٹتے ہیں دکھ میں یہ دن پہلو بدل بدل کے'' کا مشہور و معروف نغمہ چھیڑا تو صابر علی کی سیڑھیاں اترنے کی رفتار بتدریج کم ہوتے ہوئے بالکل تھم گئی۔ اتنی سریلی اتنی مدھر آواز؟

صابر نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ اوپر حاضرین مجلس کی واہ واہ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔...... خاموش' گم صم وہ باہر نکل گیا۔ بوجھل قدم اٹھاتے گاڑی کے پاس پہنچا۔ سر گھما کر ایک اچٹتی سی نظر کرتین کے کوٹھے پر ڈالی۔ بازار اب مکمل طور پر جاگ چکا تھا۔ گرد و پیش موسیقی کی لہریں اور گلوکاروں کی صدائیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ روز مرہ کے اِس دستور سے صابر بخوبی واقف تھا۔ گلی میں جا بجا کھڑے بے زیب و زینت دلالوں کی ٹکڑیاں کاندھوں پر صافہ نما مفلر اور ترچھی ٹوپی سجائے راہ گیروں کو گھیرنے میں مصروف تھیں۔

اُن میں سے چند ایک صابر علی کو پہچان کر نہایت ادب و احترام سے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر پکارتے۔

''حاجی صیب ...... ستے خیراں!''

☆......☆......☆

''ہاں بھئی فوجی بھائیو کھانا کہاں کھاؤ گے؟''

ڈیڑھ گھنٹہ چپ کا طویل روزہ توڑتے صابر نے سید سعید حسن اور راقم سے سوال کیا تھا؟

''کہیں بھی چلے چلو۔'' میں نے وقت بچانے کی خاطر فری ہینڈ دیا۔

''سعید بھائی' نمک منڈی چلا جائے؟''

''یار تیرا عذاب یہ ہے کہ تو بذات خود ہمیں لینے کے لیے گھر آ پہنچتا ہے۔ آدمی انکار بھی نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی یہ بتاتا ہے کہ جانا کہاں ہے اور کرنا کیا ہے؟ اور پھر چپ سادھ لیتا ہے۔'' سعید حسن نے ہائے ہائے کرتے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا پُر زور ماتم کیا۔

''واہ سبحان اللہ! اور جب آپ لوگ تین تین گھنٹے تپتی دھوپ میں ڈرل کرتے ہیں اور چپ سادھے کھڑے رہتے ہیں تو اُس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے 23 مارچ کی پریڈ دیکھ رکھی ہے۔ اللہ معافی ...... خاموش...... بے بس ...... چپ' بس ساکت کھڑے رہو' گھوڑے پر سوار سالا دو افسردہ دو تین ہزار بے بس فوجیوں کو فقط اپنی تلوار کے بل بوتے گھنٹوں' بوجو' کی طرح نچاتا رہا۔ واہ

بھئی کیا پیشہ ہے اور یہاں سالی دو گھنٹے کی خاموشی مارے جارہی ہے۔'' صابر نے میرے زانو کو شرارتاً دباتے کہا۔

سنہ 60-70 کی دہائی میں پیشے کے اعتبار سے فوج ایک نہایت پُرکشش ادارہ تھا۔ انٹر کرتے ہی طلبا کی ایک کثیر تعداد سلیکشن بورڈ کی تیاری میں مصروف ہوجاتی۔ کامیاب کیڈیٹس جب بھی ملٹری اکیڈمی سے تعطیل پر گھر لوٹتے تو ہمہ وقت سبز بلیزر اور فلیٹ ہیٹ زیب تن کیے رہتے۔ یہ پُرکشش 'مارکیٹنگ تھیم' فوج کے آرزومند طلبا میں جولانی کیفیت پیدا کردیتی۔ سٹیلائٹ ٹاؤن پنڈی میں ڈیوڈ بینجمن نامی ایک صاحب طلبا کو انٹر سروسز سلیکشن بورڈ (ISSB) کی تیاری کرواتے تھے۔

آپ پیشے کے لحاظ سے سائیکولوجسٹ تھے۔ بڑے بھائی میجر طاہر محمود جیلانی نے ڈیوڈ صاحب سے رابطہ کرتے ارقم کی ایڈمیشن کروائی اور تین مہینے کی ٹریننگ کے مبلغ ڈیڑھ سو روپے بھی ارسال کیے۔ بدقسمتی سے جس دن کوچنگ کلاسز شروع ہوئی تھیں اُسی دن ہمیں شکار کرنے کی خاطر چوہا سیدن شاہ روانہ ہونا تھا۔ یہ پلان آٹھ دس یوم سے مرتب کیا جارہا تھا۔ سعید سید سعید حسن' گل حسنین اور راقم اس خاص موقعہ کی بڑے عرصہ سے تلاش میں تھے یہ وہ وقت ہوتا جب سردیوں کی آمد پر چکوال کے نواحی علاقوں میں چیتے دیکھے جاتے۔ چھوٹی قسم کے اس چیتے کو مقامی زبان میں 'بُرڈا' کے نام سے پکارا جاتا۔

گل حسنین کا آبائی گھر 'سلوئی' چکوال میں تھا جو ہمارا 'بیس کیمپ' ہوا کرتا تھا۔ درحقیقت سلیکشن بورڈ کی تیاری میری ترجیح نہیں تھی اور میرے نزدیک کبھی بھی کی جاسکتی تھی' لہٰذا ہم نے شکار کے پلان کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا' گیارہ دن کی غیر حاضری کے باوجود ڈیوڈ صاحب نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور ٹریننگ سائیکل کے اختتام پر 50 روپے بھی یہ کہتے واپس کردیے کہ آپ نے یہ ٹریننگ صرف چار ہفتہ کی تھی؟ بہرکیف سلیکشن بورڈ کے طویل اور پیچیدہ مراحل طے کرتے اور گرتے پڑتے اللہ کے حکم سے سرخرو ہوا اور ملٹری اکیڈمی پہنچ گیا' پہلی سہ ماہی ٹریننگ کے خاتمہ پر دس یوم کے تعطیلات ہوئیں۔ پنڈی پہنچتے اگلے روز ہی شکار کا پروگرام بنا ڈالا۔ چکری اور گوجر خان کے مضافات ہماری پسندیدہ شکارگاہیں تھیں۔ گندم اور چنے کے کھیتوں میں بھورے تیتر شام ڈھلتے ہی میدان میں اتر آتے اور ہم جیسے گھات لگائے شکاریوں کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ وگرنہ مردانہ طریقہ کار تو انہیں ہوا میں مار گرانا ہوتا جو ناپختہ عمر کے اس حصے میں ہماری استعداد سے باہر تھا۔

ماضی کی طرح ہمارا رخ اُس شام بھی 'مندرہ' کی جانب تھا۔ بھائی طاہر محمود کی 12 بیج شارٹ گن کو میں نے فولڈ کیا اور اخبار میں لپیٹ کر سعید حسن کے سپرد کردیا۔ جنگل گرین فوجی جیکٹ اور مخصوص فوجی ہیئر کٹ میں ڈوبی وضع قطع لیے ہم دونوں ہیوی موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے براستہ ڈلہوزی روڈ سے ہوتے مال روڈ جا پہنچے۔ کمانڈر انچیف ہاؤس سے منسلک پتلی سی سڑک سے ایک سیاہ اسٹاف کار یک لخت نمودار ہوئی۔ نہ پائلٹ جیپ' نہ آؤٹ طرائیڈر نہ ٹریفک پولیس کے سارجنٹ نہ ملٹری پولیس کے پوائنٹ مین' اور نہ ہی خفیہ والوں کی جانی پہچانی نیلے رنگ کی ٹویوٹا جیپ چونکہ ہماری رفتار بہت تیز تھی' لہٰذا بھرپور بریک لگانے کے باوجود موٹر سائیکل متحرک قوت کی وجہ

سے اسٹاف کار کے عقبی حصے سے جا ٹکرائی۔

ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے سیاہ سوٹ میں ملبوس جس متحیر شخص سے میرا آمنا سامنا ہوا وہ جنرل موسیٰ تھے بصد مشکل موٹر سائیکل کو سنبھالا دیا اور اٹینشن ہوتے ہوئے ساکت جسم کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ عام قواعد کے مطابق اگر کوئی جونیئر پیادہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ سیلوٹ کرے اور اگر 'سواری' پر سوار ہو یعنی سائیکل یا موٹر سائیکل پر تو سیلوٹ لازمی نہیں' لیکن وہیں بیٹھے بیٹھے بازو اکڑا لیے جائیں۔

گنڈیری کٹ بال فوجی جیکٹ اور فوری اٹینشن ہونے کے ایکشن نے میری اصلیت عیاں کردی۔ چند لمحوں کے ذہنی الجھاؤ کے دوران جنرل صاحب نے ڈرائیور سے کچھ کہا پھر میری جانب دیکھتے خفیف سی مسکراہٹ لیے چل دیے۔ وی وی آئی پی کے جاتے ہی چیف ہاؤس کے پہلو والی سڑک پر جیسے خودکش حملہ ہوگیا ہاوروی کیا اور بےوردی کیا......

تمام حضرات میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ گمشدہ نیلے رنگ کی ایک جیپ بھی نہ جانے کہاں سے یکا یک نمودار ہوگئی۔ چیف کے ساتھ ٹکراؤ' غیر قانونی ہتھیار' ڈرائیونگ اور موٹر سائیکل کے کاغذات کی عدم موجودگی اور پھر...... جرم کا مرتکب......

زیر تربیت فوجی' ان گھمبیر حالات کا ادراک کرتے ہی میں نے تہیہ کرلیا کہ یہاں سے فوراً بھاگ لیا جائے۔ کک شافٹ پر تقریباً کھڑا ہوتے اور وجود کا پورا بوجھ ڈالتے کک لگائی گئی لیکن بے جان انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ سکیورٹی عملے کا فاصلہ ہم سے گھٹتے گھٹتے جب بیس پچیس گز کا رہ گیا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

جنگ عظیم دوئم کی ساڑھے سات ہارس پاور 'نورٹن' موٹر سائیکل میرے بہنوئی اسلم غزنوی کو ان کے کسی عزیز نے تحفتاً پیش کی تھی' دیوہیکل قسم کی اس ہیبت ناک مشین کو چلانا آسان کام نہ تھا۔ غالباً ان ہی وجوہات کی بنا پر دونوں حضرات نے اِسے ڈسکارڈ کر رکھا تھا۔ پانچ گیلن پیٹرول ٹینکی کے دائیں طرف جڑا موٹر کار کی مانند گیئر شفٹ لیور اس کی ہیبت ناکی کو مزید ہوا دے رہا تھا۔

''ایسے اسٹارٹ نہیں ہوگی' میں دھکا دیتا ہوں۔''

سعید حسن نے عجلت سے موٹر سائیکل کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

موٹر سائیکل کو نیوٹرل میں ڈالا۔ میت کو ہلانا کون سا آسان کام تھا بمشکل تمام جنبش ہوئی' فرسٹ گیئر لگایا' کلچ چھوٹتے ہی جیسے مردہ زندہ ہوگیا' سکیورٹی اسٹاف نازل ہوا چاہتا تھا۔ جس فلمی انداز سے سعید حسن موٹر سائیکل پر سوار ہوئے کاش اُسے فلمایا گیا ہوتا۔ میرے بائیں کاندھے کا سہارا لیتے شاہ صاحب نے جست لگائی اور پچھلی سیٹ پر جاگرے غیر متوقع اس جھٹکے سے موٹر سائیکل خوب ڈگمگائی۔

اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو آج ڈی آئی پی جیل اٹک کی ہوا کھا رہے ہوتے' طاقتور انجن کا سپیڈومیٹر چند لمحوں میں اسی میل فی گھنٹہ کو چھونے لگا۔ تعاقب میں سرکار بھی لپکی۔ مخالف سمت کی ہلہ بولتی ہوا نے پہلے تو سر پر اوڑھی 'بیرٹ کیپ' کو ہوا میں اچھالا پھر دونوں آنکھوں کو رُلاتے پانی سے لبریز کردیا۔ یہ پانی تند مخالف کی شدت سے بہتا رخساروں سے ہوتا' کانوں اور گردن کو چھونے لگا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر ڈگمگانے لگی'

میں نے ہینڈل بار کے دائیں جانب لگے اکلوتے عقبی شیشے سے دیکھا' سید سعید حسن میری پیٹھ کے ساتھ پیٹھ ملا کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلسل پیچھے نظر رکھنے کا یہ نہایت عقلمندانہ اقدام تھا۔

''ہم سے کتنی دور ہیں؟'' میں نے شاہ صاحب سے پوچھا؟

''پانچ سے آٹھ سو گز کا فاصلہ ہے ہمارے درمیان۔ موٹر سائیکل سوار تو کہیں نظر نہیں آ رہے لیکن جیپ خطرناک ہو سکتی ہے۔''

شاہ صاحب نے رننگ کمنٹری دیتے صورتِ حال اور واضح کی۔

میں نے رفتار بڑھا کر سو میل فی گھنٹہ کر دی۔ یہ ایک خطرناک اقدام تھا۔ بھاری بھرکم مشین پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ گھڑگھڑاہٹ سے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں کسی ٹریکٹر کا انجن نصب کیا گیا ہو۔ مندرہ سے چند کوس پیشتر ایک پگڈنڈی بائیں جانب نیچے اترتی دکھائی دی۔ رفتار آہستہ کرتے میں نے اگلی پچھلی دنوں بریکیں ایک ساتھ لگائیں۔ پھر بھی انجن کی حرکتی طاقت ہمیں پگڈنڈی سے کہیں آگے لے آئی۔ شہرہ آفاق فلم The Great Exeape کے ہیرو Steve Macquin نے دشمن سے بچنے کی خاطر کیا کراس کنٹری چھٹ پھلیا بھگائی ہوگی جو میں نے دوڑائی' سڑک کے بائیں جانب ڈھلوان پر اترتے اور مخالف سمت میں کاٹتے پگڈنڈی کو جا لیا۔ بوہڑ کے ایک قدیم درخت کے تلے گندے جوہڑ کے ساتھ منسلک' مخدوش کوٹھے کے پہلو میں پناہ لیتے' سڑک کی جانب نظریں مرکوز کر دیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد فراٹے بھرتی سکیورٹی جیپ برق رفتاری سے ہمارے پاس سے گزر گئی۔

''معاملے کو زیادہ ہی سنجیدہ لیا جا رہا ہے' کیا خیال ہے؟'' سید سعید حسن نے جیپ کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتے سگریٹ سلگایا۔

''شاہ صاحب واپس جانے کا یہی موزوں وقت ہے' تاخیر کی صورت میں مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔''

معاً دائیں جانب کہیں نزدیک سے بھورے تیتر کی پے در پے 'کالز' نے ہمیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ مسکراتے میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ چند سو گز کے فاصلے پر پگڈنڈی جب گھنٹے گھنٹے جھڑ بیریوں میں گڈمڈ ہو گئی تو گاڑی وہیں پارک کرتے پیدل چل دیے۔ مرگِ آفتاب میں بمشکل ہی پچیس منٹ بچے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم لاتعداد 'باڑیوں' کی بیری اور کیکر کے کانٹوں نے قلعہ بندی کر رکھی تھی۔

تین چار فٹ اونچی اِس باڑ کا سلسلہ ہمیں ایک موثر آڑ پیش کر رہا تھا۔ دائیں بائیں جائزہ لیتے میں نے ایک مخصوص جگہ پر 'بھگوہ' نسب کیا اور جھاڑی کی آڑ لے کر بیٹھ گئے۔

تین فٹ کا یہ بے رنگ کھردرا کپڑا' تیتر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی پوشیدہ قوت رکھتا تھا۔ اِس حکایت کے راوی جناب نثار احمد چوہان تھے جو پڑوسی اور عمر میں مجھ سے کہیں بڑے ہونے کے باوجود نوجوانوں کی صحبت میں بہت خوش رہتے اب یہ محض اتفاق تھا یا بھگوے کی کرامات' کھیتوں کے سامنے اور دائیں جانب واقع چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے تیتروں کے 'ہوکے' گونجنے لگے' شکاری زبان میں 'ہوکا' اُس آواز کو کہا جاتا ہے جو 'کال' دینے سے پہلے نکالی جاتی ہے۔ دل موہ لینے والی اُس دلکش آواز کو قلمبند نہیں کیا

جا سکتا۔ پے در پے 'ہوکوں' کی کان پڑی سنگت میں اکا دکا تیتر ہماری جانب یا پھر واللہ عالم بھگوے کی جانب بڑھتا اور دانہ دنکا چگتا نظر آیا۔

سعید حسن نے خاموشی سے میرا بازو دباتے بائیں جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ چھ سات تیتر نہایت آزادی اور بے پرواہی کے انداز میں پنجوں سے زمین پھرولتے نظر آئے۔ یہ ایک ناقابلِ یقین صورتِ حال تھی۔ اتنی کثیر تعداد کبھی چڑیا گھر میں بھی اکٹھی نہیں دیکھی جا سکتی۔ خیر صاحب بھگوہ نہ ہوا اوڈین سینما میں انگریزی فلم 'باب اینڈ سیلی' ہو گئی جو منتظمین نے 'صرف بالغوں کے لیے' لکھ کر پنڈی کی نابالغ اکثریت میں ایک ایسی ہیجانی کیفیت پیدا کر دی کہ ہر 'ترسا' منہ اٹھائے سینما کی جانب چل دیا۔

میں نے بندوق کی نالی میں 'چار نمبر' کے دو کارتوس لوڈ کرتے سعید حسن کو شوٹ لینے کی دعوت دی۔ موصوف پانچ چھ منٹ شست لیے بیٹھے رہے غالباً اپنے شکار کو گروپ کی صورت میں اکٹھا ہونے کے منتظر تھے۔ پھر آپ نے ایک عجیب حرکت کی..... دونوں 'نالیاں' اکٹھی داغ دیں ایک 'کان پھاڑ' قسم کا دھماکہ ہوا' بندوق چلنے کی پس کشی (Re-Coil) کی وجہ سے بھائی صاحب بمشکل تمام سنبھل پائے۔

سامنے چھ عدد تیتر اس طرح ساکت پڑے تھے گویا بے جان ہی پیدا ہوئے تھے۔ میری ذاتی رائے میں کسی بھی شکاری کا یہ 'ریکارڈ' شکار تھا۔ ہم تیتروں کو ذبح کرنے کے بعد موٹر سائیکل کی طرف چل دیے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ درختوں پر بسیرا کرنے والا لاتعداد پرندوں کی بولیاں ماحول کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ بائیں جانب سے گیدڑ نے ایک 'من ہاؤس' کال دی فوراً ہی 'کورس' کی صورت میں اس کا جواب آیا۔ کوشش کے باوجود موٹر سائیکل کہیں نظر نہ آئی۔ بے شک ہم بھٹک چکے تھے۔ دور جی ٹی روڈ پر رواں ٹریفک کی بتیاں جھلکتی نظر آئیں۔ اگر ہم جوہڑ والے کوٹھے کے پاس پہنچ جاتے تو دوبارہ سمت کا تعین کر سکتے تھے۔ قصہ مختصر اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے بالآخر منزل پر پہنچ گئے۔ ہیڈ محرر' رفیق راجہ آف پولیس چوکی روات' صوبے دار غلام مرتضٰی جی ایچ کیو فیلڈ سکیورٹی سیکشن اور ہمنوا نے بلند آواز سے ہینڈز اپ کا حکم صادر کیا۔ فوجی روایات کا پاس کرتے ہوئے ہم دونوں نے یکلخت ہتھیار اور تیتر وہیں پھینکے اور ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیے۔

بوہڑ کے پہلو میں کھڑے نورٹن موٹر سائیکل اور جیپ ہمارا منہ چڑا رہی تھیں' لال کرتی میں واقع سکیورٹی دفتر پہنچا دیا گیا۔ ایک نہایت لاغر اور قریب المرگ میجر صاحب نے بار بار ہمارے فوجی شناختی کارڈز ملاحظہ کیے اور پھر ایک ایسا منظر نامہ پیش کیا جس نے ہمارے چھکے چھڑا دیے۔ سارے جہاں میں کالز کرتے اور شناختی کاغذات کو اُلٹتے پلٹتے رات کے دس بج گئے۔ اکتاہٹ' جھنجلاہٹ اور طیش ..... میں نے سگریٹ پینے کی اجازت چاہی۔

''NO'' موت کے شہسوار نے اپنا ساتواں وڈہائین کا سگریٹ ایش ٹرے میں نہایت بے دردی سے مسلتے ہوئے کہا۔

پھر ایک اور کال نہ جانے کہاں سے آئی۔

''رائٹ سر......''

''سر......!''

''سر......!''

''سر رائٹ سر......''

ریسیور پٹختے موصوف نے پھونکوں سے سگریٹ کی راکھ کو ڈیسک پر لگے شیشے سے اڑانا شروع کر دیا۔ پھر ہتھیلی سے شیشے پر صفائی کا آخری کوٹ کرتے ہوئے بولے۔

’’آپ لوگ جا سکتے ہیں۔‘‘

☆......☆......☆

’’صابر علی نے آج دو چکر لگائے...... کہہ رہا تھا کل شام پھر آئے گا۔‘‘ والدہ محترمہ نے اکڑے تیتروں کے لاشے شکاری تھیلے سے نکال باہر کرتے عندیہ دیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا‘ پچھلے کئی ماہ سے صابر اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ چھوٹی لتا کے ساتھ جنون کی حد تک لگاؤ جو ابتدائی ایام میں فقط گانے بجانے تک محدود رہا اب عشق کی صورت اختیار کر گیا‘ اس کا کوٹھے پر روزانہ حاضری دینا‘ منتظمین کو ایک آنکھ نہ بھاتا‘ لیکن صابر کے رعب اور دبدبہ کی بدولت کرتو ماسی اور ہمنوا خاموش رہتے۔ مقدس قسم کے اِس عشق میں مبتلا یہ جوڑا شائستگی اور شرافت کی بدولت اپنی مثال آپ تھا۔ بقول سعید حسن ’عجیب عشق‘ ہے سالا‘ بس ایک دوجے کے سامنے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ بقیہ تماش بین جہاں پیسے لٹاتے رہے وہاں حاجی صاحب ’فری پاس‘ پر عشق فرماتے رہے‘ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ابے شادی کر لے بھائی اور گھر بسا‘ یہ کیسی پاک محبت ہے؟ نہ انگلیاں اٹھ رہی ہیں‘ نہ چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں‘ نہ لعن طعن اور نہ ذلت اور نہ رسوائی......

یہ بھی شنید تھا کہ چھوٹی لتا کے ماتا پِتا اور صابر کے مابین شدید نوعیت کی کشیدگی اُس وقت پیدا ہوئی جب صابر نے اصرار کیا کہ لتا کو کوٹھے پر محفل سجانے سے روک دیا جائے۔ یہ سننا تھا کہ شری رامدیو کو روزی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ اتنے کشٹ کے بعد کہیں جا کر پیسے کی ریل پیل دیکھنے میں آئی تھی‘ اسے یوں دن ٹوٹھری ہوتا دیکھ کر اس نے اقلیتی برادری کے بانی‘ حکم چند انند ایڈیٹر ہفت روزہ ’بسنت‘ سے رجوع کیا۔ صابر اس قسم کی صورتِ حال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ جن بازاروں میں اُس کا طوطی بولتا تھا کیا مجال تھی جو حکم عدولی کی جاتی۔ کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آتی‘ اگر نالہ لئی کے کسی گمنام گوشے سے برآمد سربریدہ لاش درحقیقت کرتمن پالی کی ہوتی یا ترنول ریلوے کراسنگ پر نامعلوم کچلی لاش شری رام دیو کی نکلتی‘ بدقسمتی سے جہاں کہیں دل کا معاملہ ہو وہاں کبھی دل بھی دل کے بس میں رہا ہے؟ یہی حقیقت صابر کا المیہ تھا‘ خیر صاحب‘ اگلے روز ٹھیک چار بجے شام صابر علی کی موٹر کار گھر کے سامنے رُکی‘ مختصری ہارن کی آواز سنتے میں باہر آیا اور ہم سعید حسن کی طرف چل دیے۔

شاہ صاحب گویا گھر کے پھاٹک کے پیچھے تیار ہی کھڑے تھے آہٹ پاتے فوراً ہی باہر آ گئے۔ شامت اعمال تعاقب میں اماں بھی چلی آئیں۔ گاڑی میں ناپسندیدہ افراد پر نظر جو پڑی‘ تو غم و غصے کا اظہار کرتے پھاٹک زور سے دے مارا۔

’’ابے تیری اماں نالاں ہیں کیا ہم سے۔‘‘

شکایتاً میں نے وہی پرانا رونا رویا۔

’’بس چاہتی ہیں کہ گھٹنے کے ساتھ لگا بیٹھا رہوں۔ کل ڈانٹ پلائی کہ اتنی دیر سے کیوں لوٹے اب تم دونوں بے غیرتوں کو دیکھا تو تلملا اٹھیں۔‘‘ شاہ صاحب نے حقیقت پر مبنی اپنا دکھڑا رو دیا۔ دورانِ سفر میں اور سعید حسن گزشتہ شب کی مہم کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جہاں شاہ صاحب سکیورٹی کے قرب المرگ میجر صاحب کی

عجیب و غریب شخصیت کو یاد کر کے محظوظ ہوتے رہے وہاں بجھا بجھا سا صابر علی خاموش گاڑی چلاتا رہا۔ میری تشویش کے اظہار پر فقط اتنا کہا کوئی خاص بات نہیں۔ باتوں باتوں میں ہمیں یہ گمان بھی نہ رہا کہ اس وقت ہم دسہرا گراؤنڈ کے قریب ایک بوسیدہ سی عمارت کے تلے کھڑے تھے۔ نہ جانے کہاں سے ایک منحوس سیاہ کالا کردار یکلخت نمودار ہوا۔ داہنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں عقیق اور فیروزہ کی جڑاؤ انگوٹھیاں‘ کالے دھاگے میں پرو دیا گلے میں لٹکا چاندی کا تعویذ‘ اور دندا سے زدہ مسوڑھوں اور سیاہی مائل لبوں پر سرخ رنگ کے مستقل نشان...... یہ استاد پیڈرو تھا۔ صابر کا سیکنڈ اِن کمانڈ! ’’کے حالات نے؟‘‘

(کیا حالات ہیں؟)

’’حاجی صیب...... دو پارٹیوں کے علاوہ آل کلیئر ہے۔‘‘

’’ایہہ پارٹیاں کیڑھیاں نے واے؟‘‘ (یہ کون سی پارٹیاں ہیں؟)

’’حاجی صیب اعظم ملکو تے شہزاد ڈمی۔‘‘ (اعظم ملکو اور شہزاد ڈمی)

’’کنے دیہاڑے اُتے ہوئی گئے نے۔‘‘ (کتنے دن اوپر ہو چکے ہیں)

’’تن چار ہفتے۔‘‘ (تین چار ہفتے)

’’ٹھیک‘ وارننگ دے اناں کی جے کل تکر کلیئر نہ ہویا‘ تاں اڈے بند کری چھوڑ۔‘‘ (اِن کو وارننگ دیں ورنہ اڈے بند کر دیں)

’’نالے اشاک اشفاقے ہیجڑی نے گھر شفٹ کری چھوڑ۔‘‘ (اشاک اشفاق ہیجڑی کے گھر شفٹ کر دو)

’’ایہہ شہزاد ڈمی کیڑا اے؟‘‘ (یہ شہزاد ڈمی کون ہے؟)

’’وڈہ قصائی‘ حاجی صیب۔‘‘ (بڑا قصائی)

’’اچھا...... ٹھیک اے۔‘‘ (اچھا ٹھیک ہے)

’’اساں چلے آں...... رب راکھا۔ (ہم جا رہے ہیں‘ اللہ حافظ)

ابے سی آئی اے کے ایجنٹ‘ یہ کاہے کا لین دین یہ کیسا سودا؟ حرام ہے جو سالے کوئی بات بھی پلے پڑی ہو۔ سعید حسن نے حسب معمول ہائے ہائے کی۔

خاموش رہتے صابر نے گاڑی گھمائی اور رخ اندرون شہر کر دیا۔ بازار کلاں کے کونے پر گاڑی پارک کرتے صرف اتنا کہا کہ اترو اور قصائی گلی کی طرف چل دیا۔ دلالوں کی ٹولیاں ہماری پارٹی کو بازار میں آتا دیکھ کر اِدھر اُدھر کھسکنے لگیں۔

صابر کی کوہاٹی تلے والی چپل کی مخصوص چرچراہٹ‘ دائیں بائیں کھوکھوں میں بیٹھے تاجروں کو اس کی آمد کی پیشگی اطلاع کر دیتی۔ خوش آمدیدی کلمات کو نظر انداز کرتے‘ بازو اکڑائے ناک کی سیدھ میں چلتا صابر یکلخت کرتو ماسی کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سعید حسن نے میری جانب معنی خیز نظریں دوڑائیں۔ چند سیڑھیاں چڑھتے ہی چھوٹی لتا کی مدھر آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ سارنگی‘ ستار اور طبلے کی تھاپ کا سنگت نغمہ سرائی کو چار چاند لگا رہا تھا۔

یوں حسرتوں کے داغ محبت میں دھو لیے
خود دل سے دل کی بات کہی اور رو لیے
گھر سے چلے تھے ہم تو خوشی کی تلاش میں
غم راہ میں کھڑے تھے وہی ساتھ ہو لیے

اُس دور کے مشہور و معروف نغمے کو چھوٹی لتا کی آواز میں سنتے میرے ذہن میں دو باتیں آئیں۔

پہلی تو یہ کہ اگر کہیں لتا منگیشکر اس آواز کو سن

لیتی تو شاید یہ ہی سمجھتی کہ اُسی کی آواز کا ریکارڈ بج رہا ہے' اور دوسرے اس خاص وقت پر جبکہ صابر آیا چاہتا تھا کیا یہ گیت سوچی سمجھی چال تھی یا اتفاق؟ بہرکیف جو کچھ بھی تھا گانے کے یہ چار بند بہت معنی خیز تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ آج یہ دونوں ایک دوسرے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ 'غم راہ میں کھڑے تھے وہی ساتھ ہو لیے' کی فلاسفی جب سعید حسن کی سمجھ میں آئی تو کچھ افسردہ ہوگئے۔ گیت کے خاتمے پر چھوٹی لتا نے فرداً فرداً ہم تینوں کو آداب پیش کیا اور پھر اگلے گانے کے پہلے بول دھیرے سے گنگناتے سازندوں کو خبردار کیا۔

تجربہ کار کاریگروں نے چند ہی لمحوں میں سر اور تال سیدھے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی تیاری کا عندیہ دیا۔

پندرہ بیس تماش بینوں میں سے تجسس زدہ چند ایک گاہے بگاہے ہم تینوں پر اچٹتی سی نظر ڈالے نہ جانے کیا جاننا چاہتے تھے۔

میں نے صابر کی جانب دیکھا۔

اس کے چہرے پر انتہائی اضطرابی کیفیت دیکھتے پریشان ہوگیا۔

اجازت ہے؟

چھوٹی لتا نے دایاں ہاتھ دھیرے سے ماتھے تک لے جاتے صابر سے نغمہ سرائی کی اجازت چاہی۔

صابر شاید ایسی ادا کے لیے تیار نہ تھا۔

پس منظر کی موسیقی نغمے کی دھن الاپتی رہی۔

چھوٹی لتا دلفریب مسکان سجائے صابر پر ٹکٹکی باندھے بیٹھی تھی۔

''شروع کیجیے نا......'' سعید حسن نے تعطل کی سی کیفیت کا جمود توڑنے کی ابتدا کی۔ مسکراتی لتا نے نفی میں سر ہلایا اور صابر کی طرف ہاتھ کرتے اپنی بند مٹھی کھولی۔

(غالباً التجا کی کہ بس بھی کیجیے)

''سرکار بٹیا اجازت کی طلب گار ہیں۔''

چیف سازندے نے از خود نوٹس لیتے صابر سے درخواست کی۔

بالآخر سر کی خفیف سی جنبش نے لتا کے چہرے پر اطمینان کی اِک لہری دوڑا دی۔ کسی تماش بین نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''شکریہ......''

کوٹھا جیسے جاگ اٹھا...... سازندوں نے سر چھیڑے اور چھوٹی لتا نے گیت

یہ شام کی تنہائیاں ایسے میں تیرا غم
پتے کہیں کھڑکے' ہوا آئی تو چونکے ہم
جس راہ پہ تم آنے کو تھے
اُس کے نشان بھی مٹنے لگے

گانے کے دوران محفل عروج پر تھی تو صابر نے سرگوشی کرتے مجھے اُٹھنے کا مشورہ دیا۔

''یار گانا تو ختم ہونے دے۔''

''مجھے ماحول سے دحشت سی ہو رہی ہے۔ بس اٹھ چلو ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔'' بادل نخواستہ نشست چھوڑی' چلتے چلتے میں نے اِک نظر لتا پر ڈالی۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے اُس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

میرے دل میں اُس کے لیے ایک عجیب سی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ خاموشی سے سیڑھیاں اترتے ہم پھر بازار میں آگئے۔

ماحول بے کیف اور سوگوار ہوگیا۔

''اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا یار؟''

سعید نے صابر سے سوال کیا۔

کسی اور خیال میں کھوئے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ اگرچہ بازار ہے لیکن یہاں سانس لیے کردار کسی نہ کسی طرح اُن ہنگاموں سے جڑے ہیں جن کے پیچھے ہزاروں سچی کہانیوں کا ورد ہے۔ کچھ لوگ ان حادثوں کا شکار ہوتے ہیں کچھ حادثے برپا کرتے ہیں جبکہ اکثریت خاموش و مجبور رہ کر ناسازگار حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ محبت دل لگی' شادی بیاہ یہ سب افسانوی قصے کہانیاں ہیں' نقطہ سات سو گز پر محیط عیش و عشرت کا یہ بازار بھیانک ماضی میں گزرے لمحات' محرومیوں اور نامرادیوں کی وہ ہزار داستان ہے جہاں پر ہر فرد پابہ زنجیر ہے۔ یہاں بدنصیبی اور بدنامی آپ کے پیش پیش چلتی ہے۔'' صابر کی فلسفیانہ سوچ نے ہم دونوں کو ششدر کر دیا۔

حالات کی نزاکت کو سمجھتے میں نے فوراً اپنے غیر سنجیدہ رویے پر معذرت چاہی اور کہیں مل بیٹھ کر حالات کا احاطہ کرنے کا مشورہ دیا۔

اگلے چند روز کسی قسم کی پیش رفت نہ ہوئی۔ نہ صابر آیا اور نہ ہم نے کوشش کی۔ تعطیلات اختتام پذیر ہوئیں۔ سعید مجھ سے تین دن پہلے رسالپور روانہ ہوگیا۔ اکیڈمی پہنچنے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد صابر کا ایک خط آیا جس کا متن کچھ یوں تھا۔

''توفیق بھائی۔''

آداب......!''

آپ لوگوں کے جانے کے بعد حالات نے بڑا عجیب پلٹا کھایا۔

چھوٹی لتا غائب کر دی گئی ہے۔ اُس کی گمشدگی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ لگتا ہے اُس کے والدین اس سازش میں شریک ہیں۔ میری سر توڑ کوشش کے باوجود کوئی سراغ یا کھوج نہیں مل رہا۔ ایسے مشکل وقت میں آپ دونوں کی غیر موجودگی بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ سعید کا اور اپنا پروگرام جلد از جلد واضح کریں کچھ فیصلے اور کچھ باتیں کرنا اشد ضروری ہیں۔

جہاں بھونچال بنیاد فصیل در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

صابر علی

ایک ماہ بعد چار ہفتے کی ٹرم بریک ہونے والی تھی۔ سعید سے رابطہ تو نہ ہو سکا لیکن صابر کے حالات جان کر تشویش ضرور ہوئی۔ میرے مطابق صابر ایک نہایت خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔ دھندے سے منسلک بے روزگار لوگوں کی مدد کرنا' اُن لوگوں سے دشمنی مول لینے کے مترادف تھا جو بطور پیشہ ان سے یہ کام کرواتے تھے۔ آخر روزی روٹی کا مسئلہ بھی تو تھا۔ نہ جانے کیوں صابر علی بلاوجہ خدائی خدمت گار بنا' گمراہ' لچے لفنگوں' اور علاقہ غیر سے تعلق رکھنے والے جرائم پیشہ لوگوں سے لڑتا بھڑتا رہا۔ اب چھوٹی لتا کو ہی لے لیجیے والدین کے لیے تو وہ سونے کی چڑیا تھی لیکن صابر علی کے نزدیک وہ اپنی مرضی کے خلاف قصائی گلی میں بٹھائی گئی تھی کھلے عام اس بات کی مذمت کرتے جب لتا کے ماتا پتا پر مزید دباؤ ڈالا گیا تو اِن کا بہت شدید ردعمل آیا۔ معاملہ اب سیاسی نوعیت کا بن چکا تھا۔ ہندو پنچائیت نے اِسے اقلیتوں سے ناانصافی ڈیکلیئر کرتے ہوئے صابر اور اس کے حواریوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا۔

ایسے ہی جذبے سے سرشار لاوارث خواتین کو بردہ فروش مافیا کے چنگل سے آزاد کرانے کی پاداش میں صابر تین چار گروہوں کی ہٹ لسٹ پر آگیا۔ موصوف تازی کتوں کی مدد سے خرگوش کے شکار کے بھی شوقین تھے۔ ایسی ہی ایک مہم

جولائی کے اختتام پر فتح جنگ کے قریب عیسیٰ خان آفریدی گینگ نے شکار پارٹی کو گھات لگا کر حملہ کیا۔ دونوں جانب سے شدید فائرنگ کے تبادلے میں صابر کے تین آدمی گھائل ہوگئے جبکہ آفریدی اپنے ہتھیار چار جنگجو مردہ حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس گینگ وار کو میڈیا نے بہت اچھالا۔ انگریزی روزنامہ دی پاکستان ٹائمز نے تو صابر کو ماڈرن رابن ہڈ کا درجہ دیتے آدھے صفحے کا اداریہ تک لکھ ڈالا۔

پاکستان ٹائمز کے اُسی اداریے کے آخر میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ گینگ وار کے باہمی تصادم میں محمد خان گینگ نے صابر کو بھرپور سپورٹ کیا' کیونکہ اُنہی کی دعوت پر تو وہ شکار کھیلنے آیا تھا۔

ملٹری اکیڈمی ایک ماہ کے لیے بند کردی گئی سعید مجھ سے چند روز پہلے کے آچکے تھے۔ صابر علی سے رابطہ کیا گیا۔ 'ٹوپی راکھ' میں میٹنگ طے پائی۔ میں اور سعید مچھلی تالاب کے بائیں جانب سڑک سے منسلک ایک پلی پر بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرنے لگے۔ زرد رنگ کی اوپل ریکارڈ کسی وقت بھی آیا چاہتی تھی کہ سڑک کی پچھلی جانب ایک موریس ٹیکسی نے عجیب خفیہ انداز میں پہلے ہمیں تیزی سے پاس کیا' پھر چند منٹ کے وقفے سے واپس لوٹتے ہمارے نزدیک زور سے بریک لگائی 'گاڑی کی اڑائی دھول نے ایک سموک اسکرین سی بنادی' جس کے بیٹھنے سے پہلے پچھلی سیٹ سے صابر نمودار ہوا۔ سر پر افغانی ٹوپی جسم پر لوئی اور ہاتھ میں سٹین گن جس کی فٹ رولر کی طرح سیدھی دو میگزین ڈوری کی مدد سے اک دوجے کے ساتھ منسلک کردی گئی تھیں۔ نہ جانے کیوں صابر کے تیور اور حلیہ دیکھ کر ایک انجانے سے خوف نے مجھے آن لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپاتے صابر سے ہتھیار لیا اور جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ یہ بکٹی ہے' کرٹسی چاچا محمد خان' مختصر سا تعارف کرواتے صابر نے شکرے کی طرح چوطرفہ نظر دوڑائی اور پکی کے 'ہوم جینک' کی طرف اشارے کرتے بیٹھنے کو کہا۔ میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میرے چہرے کو بغور دیکھتے کہنے لگا۔

''گھبراؤ نہیں حفظ ماتقدم کے طور پر کبھی معمول سے ہٹ کر بھی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ تمہاری گھبراہٹ ایک فطری امر ہے اگر آپ دونوں تھوڑے صبر کا مظاہرہ کریں تو آپ لوگوں کے جانے کے بعد اب تک جو کچھ ہوتا رہا وہ بتائے دیتا ہوں۔''

اسی اثناء میں ہمارے عقب میں بھورے تیتر نے 'ہوکا' لگایا۔

پھر جوابی 'ہوکے' دائیں بائیں سے ایک ساتھ لگے۔

اور پھر نقطہ عروج' کہ کہ کہ...... کہ کہ کہ کی پے درپے من موہنی یلغار ماند پڑی تو صابر بولا۔

''تم لوگوں کے جانے کے بعد احساس تنہائی شدت سے تنگ کرنے لگا۔ دل جیسے اُچاٹ سا ہوگیا ہو۔ شام ڈھلتے ہی نہ جانے کیوں میرے قدم اُس بازار کی جانب اٹھنے لگتے۔ چھوٹی لتا کو یوں کوٹھے پر بیٹھا دیکھ کر میرا خون اندر ہی اندر کھولنے لگتا۔

ایک دن میں نے اُس سے تنہائی میں ملنے کا ارادہ کیا۔ کرتو نے حامی بھرتے ہی صدر روڈ پر واقع اپنی ماسی کی بیٹھک میں یہ ملاقات کروائی مجھے کبھی اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ میری محبت میں اتنی بری طرح گرفتار ہوچکی ہوگی۔ مسلسل آنسو بہاتے

اور ہاتھ جوڑتے ایک ہی التجا' بس مجھے یہاں سے کسی طرح نکال لے چلو۔ آخر کب حرکت میں آؤ گے جب نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا؟ اس کی جگر سوز کیفیت کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کرپایا۔ جاتے ہوئے صرف اتنا ضرور کہا کہ مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔ آئندہ کئی روز سخت پریشانی میں گزرے۔ احساس جرم تھا یا اپنی بے بسی' مجھے خود سے وحشت سی ہونے لگی۔ کئی مرتبہ بے توجہی میں بازار کی جانب ہولیتا۔ پھر اُسے تصور میں تماش بینوں کے جمگھٹے میں بیٹھا دیکھ کر...... اُلٹے پاؤں لوٹ آتا۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ پوری زندگی اس طرح کی خرافات سے دور رہا اور اب دل و دماغ میں اُس کی سوچ کے علاوہ اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔''

یہ سب کچھ کہتے صابر یکدم خاموش ہوگیا۔

تیتروں کی ہاہاکار ماند پڑگئی۔

تھکا ماندہ نڈھال آفتاب ڈوبنے کی تیاری پکڑنے لگا۔ بدنما کردہ چمگادڑیں سورج کی کشمکش موت سے لاتعلق نیچی پرواز کرتی ماحول کو مزید سوگوار کرنے لگیں۔ معاً بکٹی چند لمحوں کے لیے جھاڑیوں سے باہر نکلا' صابر کی طرف سے کسی قسم کا ردعمل نہ پاکر دوبارہ کمین گاہ میں چھپ گیا۔

صابر نے سر سے ٹوپی اتاری اور بالوں کو سنوارتے کہنے لگا۔

''میں نے بازار کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔'' دو ماہ گزر گئے۔

ایک دن کھدو میراثی نے چھوٹی لتا کا پیغام دیا کہ ملنے کی آرزو کر رہی ہیں۔

میں سوچ میں پڑ گیا' پھر نہ جانے کیوں شام کو 'بازار' جا نکلا۔

چار پانچ روز سے مسلسل گرتی برکھا نے ہر چیز کو افسردہ کر ڈالا' بازار کی رونقیں بے رونق ہوگئیں۔ رنگ برنگے پیشوں سے تعلق رکھنے والے پھیری باز' ریڑھی بان' دکانوں اور کھوکھوں کے سائبانوں تلے دبکے کھڑے رہتے۔ 'ہارمو جیے وے' کی تیز چبھتی للکاریں نہ جانے کیا ہوئیں؟

تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے میں تماش بینی کے مرکزی ہال میں آگیا۔

میرے بالکل سامنے بنی ٹھنی اداس لتا کھڑی تھی۔

ویران کوٹھے کا سرسری جائزہ لیتے میں نے کرتو کی جانب دیکھا؟

''سرکار...... پچھلے کئی دنوں سے بی بی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ محفل بھی لگنے نہ دی۔ دھندہ چوپٹ ہوکے رہ گیا سرکار!''

میں نے سو سو کے دس نوٹ نکالے اور ماسی کے ہاتھ میں دے دیے۔ کرتو کی باچھیں کھل گئیں۔

بے ڈھنگے پن سے میری بلائیں لیتے اُس نے روپیہ وصولا اور زنان خانہ نکل گئی۔

ایک بیمار سی مسکراہٹ ڈالتے لتا نے سازندوں کو چند ہدایات دیں۔ پھر میری طرف دیکھتے بولی۔

''اب یہاں کوئی نہیں آئے گا!''

سازندوں نے ساز چھیڑے اور نغمہ سرائے نغمہ......!

خیام کی موسیقی میں فلم 'شگون' کا مشہور گیت گلوکارہ جگجیت کور نے گایا تھا۔ بہت کم مدت میں اس کی نغماتی شاعری نے بے انتہا شہرت پائی۔

تم اپنے رنج وغم
اپنی پریشانی مجھے دے دو

تمہیں اس غم کی قسم
اس دل کی ویرانی مجھے دے دو
یہ مانا میں کسی قابل نہیں ہوں ان نگاہوں میں
تھوڑا سا ہے اگر یہ دکھ یہ حیرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو سہی دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو
وہ دل جو میں نے مانگا تھا مگر غیروں نے پایا
تھا

اس نغمے کی ادائیگی کے دوران میں بار بار اُس کا معصوم چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دکھ اور غم کی کیفیت میں شدت آتی چلی گئی۔ ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

میں نے تہیہ کرلیا اسے اب یہاں ہرگز رہنے نہیں دوں گا۔

پھر غیر محتاط رویے کا مظاہرہ کرتے اعلانیہ میں نے چھوٹی لتا کو دو گھنٹے کا ٹائم فریم دیا اور انتظام و انصرام کی خاطر نکل گیا۔

میری اس فاش غلطی کا فائدہ اٹھاتے میرے واپس لوٹنے سے کہیں پہلے چھوٹی لتا کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کردی گئی۔

چند ہفتے خوب ہاتھ پاؤں مارے اللہ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ بہت کھوج نکالی کوئی نشان نہ ملا بدلے میں لاتعداد لوگ اٹھائے گئے۔ ظلم و تشدد بھی ہوا۔ لیکن کوئی سن گن نہ ملی۔

دل کا معاملہ تو اپنی جگہ لیکن جس طریقے سے میری بدمعاشی میری قدر اور تڑی کو دھچکا لگا اس نے مجھے ذلیل اور شرمسار کر دیا۔

چند روز پہلے استاد پیڈرو نے ایک Lead فراہم کی جس کے مطابق غائب ہونے سے اب تک چھوٹی لتا کو کم از کم چھ مختلف مقامات پر رکھا گیا۔



سائے میں تیرے حسن کے جب تک میں جیوں گا
وعدہ ہے مرا تجھ سے ، تجھے پیار کروں گا

اے جانِ غزل ! اور ذرا دیر ٹھہر جا
میں دیکھ کے تجھ کو ابھی کچھ اور لکھوں گا

رہنے دے ابھی چہرے کو تو سامنے میرے
میں حسن مجسم کی کتاب اور پڑھوں گا

اے جانِ ترنم ! میرے کچھ شعر سنا دے
خود اپنا ہی میں سازِ نفس آج سنوں گا

تو ' اے ورقِ زیست ابھی ختم نہ ہونا
کچھ اور لکھوں گا ابھی کچھ اور لکھوں گا

اٹھوں تیری محفل سے کہاں مجھ میں ہے جرأت
ہاں تو جو اٹھائے تو بصد شوق اٹھوں گا

باتیں ہیں بہت کہنے کو اس سے مجھے نازش
جب سامنے پہنچوں گا تو کچھ بھی نہ کہوں گا

نازش رضوی

آخری اطلاعات کے مطابق کل شام اسے محلہ وارث میں شفٹ کیا گیا ہے۔ پیڈرو کے ہرکاروں نے وہ گھر بھی دیکھ لیا ہے لیکن تصدیق کل ہوگی۔

تو پھر کیا ارادے ہیں؟

وہ کیا ہے کہ......

راستے بند کیے دیتے ہو دیوانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

یہ کہہ کر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"دیکھو بھائی اُسے ہر صورت اس فضا سے الگ کرنا ہے جو چیز مجھے پریشان کیے دے رہی ہے وہ اُس کی سیفٹی ہے۔" لتا کے اغواء کے بعد 'کرتو' ماسی کو ہم نے اٹھالیا تھا تین چار روز کی مسلسل پٹائی کے بعد اس نے بالآخر دو چیزوں کی نشاندہی کردی۔

"منھے گجر کا ہاتھ"

"اٹھائے جانے کی صورت میں 'خلاص'۔"

سر پر ٹوپی اوڑھتے صابر نے حلق سے عجیب سی آواز نکالی جس طرح گیدڑ بھونکنے سے پہلے کھانستا ہے۔

"کل صبح گھر رہنا ہے دس بجے تمہیں لینے آؤں گا۔" صابر نے گاڑی میں بیٹھتے ہدایت کی۔

اگلی صبح عین وقت پر صابر نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور لیاقت باغ کی طرف چل دیا۔ بارہ دری کے قریب گاڑی روکی اور سیڑھیاں چڑھتے چھت پر پہنچ گیا۔

چاروں طرف نظر دوڑاتے بولا۔

"لتا کا سراغ مل گیا ہے اُس سے رابطہ کرنا نہایت ضروری ہے۔"

میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ اُسے خفیہ طریقے سے ملا جائے۔

حالات کچھ یوں بن رہے ہیں کہ آپ دونوں حضرات اُس سے رابطہ کریں گے۔ پہلی ملاقات میں اُسے ہدایات پہنچائی جائیں۔ علاوہ ازیں اُس کی نگہداشت پر مامور لوگ اور ان کی تعداد اور لوکیشن معلوم کی جائے۔ دوسری ملاقات میں اُس کا ردعمل اور رضامندی۔ احتیاطی تدابیر یا کوئی اور معلومات حاصل کی جائیں۔

اور آخری ملاقات میں ہدایات کو دہرانا اور ذہن نشین کروانا ہوگا۔

یہ ہماری اسکیم کا خاکہ ہے اگر آپ لوگوں کے کوئی تحفظات ہیں تو ان پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن یہ خیال رکھیں کہ بہت سی باتوں کا جواب فی الوقت نہیں دیا جاسکتا۔ صورتِ حال اس وقت واضح ہوگی جب اُس سے رابطہ ہو جائے گا۔

ہم بارہ دری سے اتر کر گاڑی کے پاس آگئے۔ صابر نے ڈگی کھولتے بیگ سے ایک برقع نکالا۔

"سعید اسے پہن کر دو قدم چل کر دکھاؤ۔"

شاہ صاحب نے جھٹ برقع اوڑھا اور چند قدم لیے۔

"نہیں آپ بیس پچیس قدم چل کر ہماری طرف آئیں۔"

صابر نے ایک منجھے ہدایت کار کی طرح سنجیدگی سے سعید کے چلنے کے انداز کو ملاحظہ کرتے ہدایت دی۔

بار بار چلنے کا یہ مظاہرہ دیکھتے اور ہر بار نفی میں سر ہلاتے صابر نے بالآخر شاہ صاحب کی 'کیٹ واک' مسترد کردی۔

"سعید بھائی آپ کا بنیادی مسئلہ آپ کی چال کا سو فیصد فوجی پن ہے' ہوسکتا ہے میرے شعور میں چونکہ آپ کی اصلیت جانی پہچانی ہے۔

لہٰذا آپ کو اسی تناظر میں دیکھنے پر مجبور ہوں۔‘‘

’’ہاں بھئی.....فوجی جوان اب ذرا تو صغراں بی بی بن کر دکھا۔‘‘ صابر نے مسکراتے میری جانب دیکھا۔

سعید کی کوتاہی سے سبق لیتے میں نے پوری کوشش کی کہ صابر کی توقعات پر پورا اتروں۔

ایسے لگا جیسے فیصلہ محفوظ کرلیا گیا ہو۔

خاصی دیر اِدھر اُدھر بے مقصد وقت ضائع کرتے کہنے لگا۔

’’ٹھیک ہے لیکن برقعے میں تمہارا ڈیل ڈول ایک دم دُوگنا ہوگیا ہے۔ راہ گیروں میں یہ تجسس پیدا کرنے کے علاوہ خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے۔ بہرکیف ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ لیکن تم لوگوں کے بازوؤں کی حرکت کا فوجی انداز بہت پریشان کن ہے' اُس کو قابو میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔‘‘

لیاقت روڈ اور ڈی اے وی کالج روڈ کے سنگم پر واقع علی بابا ہوٹل کے سامنے رُکتے کہنے لگا۔

’’آؤ کھانا کھالیں۔‘‘

’’آنہ روٹی دال مفت‘‘ کی مشہوری کا ’’بل بورڈ‘‘ ہوٹل کی چھت پر کچھ ایسے زاویے سے لگایا گیا تھا کہ دور دور سے گاہکوں کی توجہ مبذول کرائی جاسکتی تھی۔ اچھے وقت تھے۔ غریب آدمی تین آنے یومیہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتا تھا۔

جگا ٹیکس' شراب کی ڈسٹری بیوشن کا وسیع نیٹ ورک اور بھتے سے وصول شدہ آمدنی کے باوجود صابر عموماً یہیں کھانا کھاتا' یاد رہے ناجائز ذرائع سے کمائی دولت ستم رسیدہ خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی۔ ہوٹل کے اوپر والی منزل شام کو چار آنے فی یومیہ' منجی بسترا' بھی فراہم کرتی' اُس کی سیڑھیاں چڑھتے صابر ایک چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوگیا۔ یہ غالباً دفتر تھا جہاں بیٹھ کر آپ راجہ بازار' ڈی اے وی کالج روڈ' لیاقت روڈ اور گوالمنڈی تک نگرانی کرسکتے تھے۔

حسب عادت چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر اگلے دن کا ایکشن پلان واضح کردیا گیا۔ آدھا پون گھنٹہ خوب بحث و مباحثہ ہوا اور موقع کی مناسبت سے ہر مرحلہ اور ہر کارروائی کا طریقہ کار جب عیاں ہوگیا تو میٹنگ برخاست کردی گئی۔ جاتے جاتے کہنے لگا۔

’’اپنا خیال رکھیں اور خدارا کوئی چوک نہ ہونے پائے۔‘‘

رات بھر عجیب سا خوف ذہن پر سوار رہا۔ ایک اندیشہ' ایک غیر یقینی کیفیت یا پھر مونچھیں منڈوانے کا دکھ'

اگلے روز سعید ساڑھے نو بجے صبح ویسپا اسکوٹر پر سوار گھر کے سامنے آن پہنچا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی میں نے شیشے میں اپنے وجود پر فائنل نظر ڈالی' ابلے ہوئے چھلے انڈے کا سا چہرہ دیکھ کر بڑی کراہیت آئی۔ پیدائش سے لے کر ملٹری اکیڈمی میں شمولیت تک کبھی مونچھیں نہ منڈوائیں۔ آج اندازہ ہوا کہ بنا مونچھ میرا چہرہ کتنا خواجہ سرائی ہوجاتا ہے۔

’’محلہ‘‘ کے اشارے سے چہرے پر لعنت بھیجتے' برقعے کے بٹن بند کیے چہرے پر نقاب ڈالتے گلی سے باہر نکل آیا۔ چند پڑوسی لاتعلقی سے میرے پاس سے گزر گئے۔

فحش انداز میں ٹانگ اٹھا کر اسکوٹر پر بیٹھنے والا ہی تھا کہ یاد پڑا میں عورت ہوں فوراً لاحول پڑھی۔

اسکوٹر کے ایک جانب بیٹھنے پر خاصی دقت پیش آئی۔

’’کیسی ہو ڈارلنگ؟‘‘ سعید حسن نے اسکوٹر گیئر میں ڈالتے پوچھا۔

’’ابے نکل لے سالے یہاں سے..... کیوں بدنامی کو دعوت دے رہا ہے یار؟‘‘ شارٹ کٹ مارتے سعید براستہ نقشبندی گلی مری روڈ پر جانکلا۔ اسکیم کے مطابق مجھے شاہ کی ٹاہلیاں قبرستان کے نزدیک اُتار دیا گیا۔ یہاں سے پیدل لتا کے ٹھکانے کا فاصلہ آٹھ سے دس منٹ کا تھا۔ پلاسٹک کی ڈوری سے بُنی ٹوکری جس میں پیاز' آلو اور ٹماٹر وغیرہ رکھے تھے ہاتھ میں تھامے میں آگے بڑھا۔

میرا غیر معمولی جثہ کسی راہ چلتے کے لیے باعث کشش نہ تھا اور یا پھر سارے لوگ مولوی ہی تھے۔ جنہوں نے عورت کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ پیاز اور آلو اور ٹماٹر دکھاوے کے لیے رکھے تھے۔ بازوؤں کی غیر معمولی حرکت کو مخفی رکھنے کی چال تھی۔ آدھے نقاب کے باوجود کسی نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ یہ کیسا بے غیرت محلّہ تھا؟

تقریباً آٹھ منٹ بعد لکڑی کے ٹال کے بالمقابل اُس چھوٹی سی حویلی کے سامنے پہنچا جس کے مرکزی دروازے کے ساتھ ٹھیلے والا شکر قندی بیچ رہا تھا۔ دو تین کنگلے بچے للچائی نظروں سے شکر قندی پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہدایت کے مطابق میں بائیں جانب مڑ گیا سامنے انگور کی بیل سے متصل ایک کوٹھڑی کے کواڑ سے لٹکتے پنجرے میں میاں مٹھو کو لتا کچھ کھلا رہی تھی۔

حیران کن بات یہ تھی کہ میرا چہرہ دیکھ کر اس کو بالکل اچنبھا نہ ہوا۔ میرے کوٹھڑی میں گھستے اُس نے خط وصول کیا اور کل اسی وقت دوبارہ آنے کا کہا۔ باہر ایک بڑھیا نلکے پر برتن مانجھ رہی تھی۔ حرام ہے جو میرے آنے جانے کا اُس نے نوٹس تک لیا ہو۔

میری واپسی ایک دوسرے راستے سے تھی۔ گھوڑا اسپتال کے سامنے سعید اسکوٹر پر بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا۔

‘‘Mission Accomplished’

میں نے اسکوٹر پر بیٹھتے کہا۔

صابر سے رابطہ کیا گیا۔

تبادلہ خیال کے دوران میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ لتا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ سے کام لے رہا ہے۔ جب کہ اُس کو باآسانی اِس گھر سے لے جایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک اُس کی حفاظت یا پابندی والا کوئی عنصر نظر نہیں آیا۔ لہٰذا مزید وقت ضائع کیے بغیر جلد سے جلد ایکشن کرلیا جائے۔

مسکراتے صابر نے کل تک صبر کرنے کی تلقین کی اور صرف اتنا کہا۔

’’یہاں ایکشن بالکل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اغواء کرنا ہمارے لیے مزید پریشانی کا موجب ہوگا۔‘‘

دوسرے دن بھی وہی عمل دہرایا گیا۔ ماں کی سفید ساٹن کی شلوار زیب تن کی۔ قمیض کا سائز کیونکہ بہت چھوٹا تھا لہٰذا کل کی طرح آج بھی میں نے بنیان پر اکتفا کیا۔ باقی رہا سینڈل کا مسئلہ تو '10 سائز' کا زنانہ جوتا تو شاید عجائب گھر میں بھی دستیاب نہ ہوتا' اس لیے ہوائی چپل منظور کی گئی۔

مری روڈ پر چڑھتے ہی بادل امنڈتے نظر

آئے۔ ہوا کی شدت بارش کا عندیہ دے رہی تھی۔ اُس روز لتا کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ رقعہ دیتے کہنے لگی۔

''باہر ہوشیار رہیے' گلی کے درمیان لگے پتھر پر بیٹھا شخص 'اُن' کا ہے اور شاید لکڑی کی ٹال پر بھی دو آدمی اسی کے ساتھی ہیں۔ (دو سے تین فٹ اونچا یہ پتھر گاڑیوں کی آمدورفت کو روکنے کے لیے نصب کیا جاتا تھا) میری مشکل یہ تھی کہ آج کا 'روٹ آؤٹ' وہی گلی تھی جس کے سرے پر چوکیدار بٹھایا گیا تھا۔ وہاں سے گزر کر میں نے ایک اور دوسری گلی میں سے نکلنا تھا جس کے سرے پر سعید میرا منتظر تھا۔

لتا کے رقعے کو شلوار کے نیفے میں اڑستے میں باہر نکل آیا۔ پتھر پر بیٹھے شخص نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔ سڑک عبور کرتے میں نہایت اعتماد سے اُس کے پاس سے ہوتے گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی چالیس پچاس گز کے دائیں بائیں اور سامنے نکل جاتی' اچانک ہوا کا ایک تند جھونکا کاغذ کے ٹکڑے اور کچرے کو اڑاتا اس شدت سے ٹکرایا کہ برقع بٹن کھلنے کے بعد پیراشوٹ بن گیا۔

میرا بہروپ افشاں ہو چکا تھا میں نے تیزی سے پیچھے دیکھا نگرانی پر مامور شخص ہکا بکا منہ کھولے گھڑا رہا' پھر بجلی کی مانند میری طرف لپکا سبزی کی ٹوکری پھینکتے میں نے دوڑ لگا دی۔ ٹی جنکشن سے بائیں جانب مڑتے ہی میں نے ایک گھر کی چھوٹی سی ڈیوڑھی سے منسلک زینہ اوپر جاتا دیکھ کر اُس پر چڑھ گیا آٹھ دس سیڑھیوں کے بعد لینڈنگ ایریا پر میں نے برقع اُتار کر گول کیا اور وہاں پڑے کوڑے دان میں ڈال دیا۔

باہر گلی میں ایک ہاہاکار مچی تھی۔ دو تین منٹ کے توقف کے بعد نیچے اترا اور دوبارہ ٹال کی طرف چل دیا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ حفاظتی ٹولہ اِدھر اُدھر گلیوں کی خاک چھان رہا تھا۔ لیکن وہاں میری توقع نہیں کی جا رہی تھی جہاں سے میں نے اب واپسی اختیار کی تھی۔

اللہ کی طرف سے یہ ایک غیبی امداد تھی کہ میں بچ نکلا۔

کم سے کم ایکسپوژر کی خاطر میں نے ایک تانگہ پکڑا اور گھر پہنچ گیا۔ میری پہلی ترجیح صابر کو حالات سے آگاہی دینا تھی۔ خوش قسمتی سے وہ بذات خود خط وصول نے گھر پہنچ گیا۔

لتا کا خط پڑھا۔

میری روداد سنتے بولا۔

''اس حادثے کے بعد اُس کو آج یقینی طور پر وہاں سے منتقل کر دیا جائے گا۔''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''میں اب چلتا ہوں۔''

''دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔''

اُس وقت' یہ آخری بات تھی جو صابر نے مجھ سے کی۔ دیگر تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا البتہ اتنا ضرور پتا چلا تھا کہ صابر نے چھوٹی لتا کو نجات دلوا دی تھی۔

وقت کے بے رحم دھارے نے ہم دونوں کو جدا کر دیا فوج کی نوکری نے گھر سے دور کیا ہی تھا رفتہ رفتہ یار دوست بھی چھوٹے۔ پھر ایک وقت آیا جب پنڈی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتے لاہور آن بسا۔

کبھی کبھار پنڈی آنا ہوتا تو مرحوم منیر نیازی کا وہ شعر کانوں میں گونجتا ہے۔

واپس نہ جانا وہاں کہ تیرے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

☆☆.....☆☆



بہت کٹھن تھی منزل

علی آذر کا خیال

> غزال شب نے مجھے ایک بات بتلائی
> کہ تیرگی کو کسی حال میں دوام نہیں

جمیل میمن

میں امریکہ پینسلوانیا اپنے بیٹے اور بہو کے پاس رہائش پذیر تھی اور وہاں اپارٹمنٹس کے سامنے روزانہ واک کے لیے نکل جایا کرتی تھی اور سوچتی رہتی تھی کاش کوئی پاکستانی یا انڈین مل جائے جس سے اردو میں بات کرسکوں' کیونکہ میں پینسلوانیا میں اردو بولنے کو ترس گئی تھی' ویسے بھی جب پردیس میں زیادہ عرصہ رہنا پڑ جائے تو دل اپنوں کے لیے اُداس ہو ہی جاتا ہے۔

اس روز بھی میں یہ ہی سب سوچتے ہوئے واک کررہی تھی کہ کسی نے مجھے سلام کیا۔

میں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کیونکہ میرے سامنے ایک انگریز لڑکی کھڑی تھی' اُس نے پھر مجھے سلام کیا...... ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بہت خوشی ہورہی ہے آپ کو دیکھ کر۔''

''اور مجھے بھی......'' اُس نے جواب دیا۔

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں پاکستان سے آئی ہوں۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''مجھے پاکستانی بہت اچھے لگتے ہیں اور اب ایک پاکستانی کے ساتھ ہی شاید ہمیشہ کے لیے پاکستان چلی جاؤں گی۔'' اُس کے لہجے میں گرم جوشی تھی۔

''اچھا...... اچھا...... بہت اچھا۔'' میں نے مزید خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے...... آپ کون سے فلیٹ میں رہتی ہیں؟'' اُس نے دو تین سوال ایک ساتھ پوچھ لیے۔

میں نے کہا۔

''میرا نام جمیل ہے اور میں ایل 12 میں رہتی ہوں۔''

''اوہ...... واؤ......'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوئی۔

''میں ایم تھری میں رہتی ہوں آئیں میرا ہاسٹل ساتھ ہی تو ہے' میں والمارٹ اسٹور سے کچھ گروسری لینے گئی تھی۔ میں نے آپ کو کل بھی دیکھا تھا۔ آپ یہاں روز واک کرتی ہیں؟''

''ہاں جب میں فارغ ہوتی ہوں تو واک کرتی ہوں مگر ٹائم مقرر نہیں ہے......'' میں نے اُسے بتایا۔

''ویسے تم نے تو اپنا نام بتایا ہی نہیں۔''

''میرا نام میرین تھا' اب مریم ہے۔'' اُس نے بتایا۔ اتنے میں بوندا باندی شروع ہوگئی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں شاید بارش ہونے والی ہے پھر ملیں گے۔''

''اچھا...... بائے...... بائے۔''

اس طرح ہمارا ملنا جلنا شروع ہوگیا کبھی وہ آجاتی کبھی میں اس کے ہاسٹل چلی جاتی' ایل ایم دونوں اپارٹمنٹ آمنے سامنے ہی تھے اور ہر لائن میں 20-20 فلیٹ تھے ایک روز میں میرین یا مریم کے ہاسٹل گئی ہوئی تھی تب اس نے میرے پوچھنے پر مجھے اپنے ماضی' حال اور مستقبل کے حوالے سے جو کہانی سنائی' آپ وہ کہانی اُسی کی زبانی سن لیں۔

☆......☆......☆

''میرا نام پہلے میرین تھا' اب مریم ہے میں اپنی ماں کے پہلے شوہر کی بیٹی ہوں میں نانی کے فلیٹ میں رہتی تھی' میری نانی ماں بہت خوبصورت اور مہربان طبیعت کی مالک تھیں' انہوں نے مجھے بہت پیار سے پالا' میرے نانا بھی بہت اچھے تھے مگر وہ بھی میری ماں کی طرح بگڑے ہوئے تھے' گھر میں نہیں ٹکتے تھے کچھ دن نانی کے ساتھ رہتے پھر کہیں چلے جاتے۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے' ورنہ نانی ماں سے محبت بہت کرتے تھے'

کیونکہ نانی ماں کی اور اپنی شادی کی سالگرہ کبھی نہیں بھولتے تھے' وہ اس دن ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر گھر پہنچ جاتے تھے۔

اس لیے نانی اماں بھی اُن کا انتظار کرتیں' اُن کی پسند کے کھانے بناتیں' اُن کے کپڑے پریس کرتیں اور پھر وہ دونوں شام کو اپنی سالگرہ مل کر مناتے خوب گھومتے پھرتے' اور رات کو تھک ہار کے واپس آتے' نانی یہ باتیں مجھے روزانہ ہی رات کو سوتے وقت بتاتیں' انہیں یہ سب بتانا اچھا لگتا تھا' اسکول سے آنے کے بعد وہ مجھے پڑھاتیں' میرے ڈریس کا خیال رکھتیں وہ بہت سلیقہ مند تھیں۔

میری ممی بس مہینے دو مہینے بعد آتیں' مجھ سے پیار کرتیں کچھ دن رہتیں اور چلی جاتیں' مجھے ان کے آنے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا میری اور نانی کی دنیا ساتھ ساتھ تھی۔ اور نانا بھی پانچ سال تک ہمارے ساتھ تھے' پھر وہ اس دنیا سے چلے گئے تھے۔

اُن دنوں نانا مسلسل چھ ماہ تک ہمارے ساتھ رہے' شاید اُن کو پتہ تھا کہ موت اب اُن کے تعاقب میں ہے۔ کبھی کبھی نانی ہنستیں اور کہتیں۔

''کیا اب تمہاری مٹر گشتی ختم ہوگئی ہے؟'' تو وہ نانی کی طرف دیکھ کر کہتے۔

''میں اب کچھ دن تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے جیسی عورت مجھے کہیں نہیں ملی۔''

اور نانی محبت سے شرما جاتیں...... حالانکہ شرمانا لجانا ہمارے مغربی معاشرے میں ہے ہی نہیں' لیکن نانی کے چہرے پر عجیب سی سرخی آجاتی جو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

نانا کے دنیا سے چلے جانے کے بعد نانی بہت دنوں تک اُداس رہیں۔ گھر میں خاموشی سی چھا گئی تھی' تب میں بھی پہلی مرتبہ دکھ سے دوچار ہوئی' نانا میرے بھی تو دوست تھے ہم دونوں ہی اپنے بیسٹ فرینڈز سے محروم ہوگئے تھے اس لیے دکھ تو ہونا ہی تھا' ممی کا وہ ہی اصول' آئیں نانی کو تسلی دی ایسے جیسے غیر دیتے ہیں کچھ دن رہیں اور چلی گئیں۔

میں نے نانی سے کہا۔

''ممی کو کچھ دن رہنا چاہیے تھا آپ کے پاس۔''

''اب مجھے دکھ نہیں ہوتا۔'' نانی نے کہا۔

''مگر جب وہ پہلی مرتبہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھی' تب میں بہت روئی تھی' لیکن کیا کریں ہمارا کلچر ہی ایسا ہے' اٹھارہ سال عمر ہونے کے بعد اولاد کی مرضی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ رہے یا نہ رہے اُسے کوئی رہنے کو مجبور نہیں کرسکتا پتا نہیں یہ قانون کس نے کیا سوچ کر بنایا تھا' یہ ہی وجہ ہے کہ ہماری نسل بھٹک رہی ہے' جن کو سمجھانے والے نہیں ہوں گے وہ تو بھٹکیں گے ہی نا۔'' نانی نے تفصیل سے بات مکمل کی۔

''لیکن نانی میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی زندگی بھر۔'' میں نے نانی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''پرامس...... تم بہت اچھی ہو میری بچی۔'' نانی نے مجھے محبت سے چومتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم پڑھنا پھر اپنی فیملی بنانا' میں بہت پیار سے تمہاری شادی بناؤں گی کسی اچھے لڑکے کے ساتھ' خدا نے چاہا تو تم بہت خوش رہو گی۔''

زندگی اسی طرح بہت مزے میں گزر رہی تھی میں نے اسکول پورا کرلیا تھا اور کالج ٹیسٹ کی تیاری کررہی تھی انہی دنوں نانی کو کھانسی رہنے لگی تھی' اور برف باری بھی ہورہی تھی' موسم سرما پورے عروج پر تھا۔

دوائیں میں نے خود نانی کو لا کر دی تھیں اور پابندی سے کھلا بھی رہی تھی' لیکن کھانسی میں کچھ خاص فرق نہیں آرہا تھا۔ نانی نے ممی کو بھی کال کر کے بلالیا تھا' وہ دو تین دن سے ہمارے ساتھ ہی تھیں' میں اور نانی ساتھ ہی سوتے تھے...... نانی منع بھی کرتیں کہ تم الگ سوؤ' لیکن میں نہیں مانتی تھی وہ کہتیں۔

''تمہیں بھی یہ کھانسی نہ لگ جائے۔'' پھر بھی میں دوسرے بیڈ پر نہ سوتی۔

اُس دن بہت ٹھنڈ تھی باہر ہر طرف برف ہی برف تھی اور ہیٹر چل رہے تھے' لیکن گھر گرم ہی نہیں ہورہے تھے' میں اچانک سوتے سے جاگی تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا جیسے نانی پتھر کی ہوچکی ہوں' میں نے گردن گھما کر دیکھا' ممی ساتھ والے بیڈ پر سو رہی تھیں۔

میں نے اٹھ کر نانی کو ہلایا...... جلایا...... اِک خاموشی سی تھی جیسے ہر طرف' پھر میں نے ممی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا...... وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔

''کیا ہوا؟ ڈراؤنا خواب دیکھا کیا؟'' انہوں نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ...... وہ...... نانی......'' میں بمشکل اتنا ہی بول پائی...... ممی جلدی سے اٹھ کے نانی کے پاس آئیں۔ انہیں ہلا جلا کے دیکھا پھر سینے سے کان لگایا۔

''اوہ...... شی از ڈیڈ۔'' یہ سنتے ہی میں چیخ پڑی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔

مرنے والے کتنے ہی پیارے کیوں نہ ہوں اُن کے ساتھ مرا نہیں جاتا' مگر یہ درد جدائی پل پل کی یادیں انسان کو ادھ موا ضرور کردیتی ہیں' میں بھی بس جی رہی تھی اسی جینے کے لیے مجھے ممی کے ساتھ آنا پڑا' اب میں ان کے ساتھ ہی رہنے لگی' رہنا کیا تھا وہ میری ماں تو کبھی بن ہی نہیں سکیں انہوں نے کہہ دیا۔

''تمہاری زندگی ہے جیسے چاہے اپنی مرضی سے جیو' باہر نکلو اور لائف انجوائے کرو جیسے میں دوستوں میں جیتی ہوں تم بھی جیو۔''

اسی رات کو نانی خواب میں آگئیں اور کہا۔

''خبردار...... اپنی ماں کی طرح مت رہنا' محنت کرنا...... پڑھائی کرنا اور فیملی بنانا۔''

میری آنکھ کھلی تو ایسا محسوس ہوا کہ نانی حقیقت میں میرے پاس ہیں اور مجھے پیار کررہی ہیں' صبح کو میں نے ممی سے کہا۔

''میں پڑھنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا......'' ممی کو جیسے فکر ہوئی۔

''تم ٹیسٹ کی تیاری کرو میں کوشش کرتی ہوں۔'' اور وہ نوکری پر چلی گئیں میں نوکری میں نہیں کرسکتی تھی کہ ابھی میرا کارڈ بننے میں دو سال دیر تھی۔ اور میں یہ دو سال پڑھنا چاہتی تھی۔

ممی کا فلیٹ دو بیڈ روم کا تھا' جس میں ایک میں' میں تھی دوسرے میں میری ممی، رات کو میں دیر تک پڑھتی رہتی' اُس روز بھی پڑھ رہی تھی کہ ممی آگئیں' لیکن وہ کسی مرد کے ساتھ بات کررہی تھیں۔

جب سے میں آئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ ممی کسی کو ساتھ لائی تھیں۔ میں حیرت و تجسس کے باعث کمرے سے باہر آئی۔

ممی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میری...... یہ مائیکل ہے...... یہ فلیٹ اسی

نے مجھے لے کر دیا ہے' کبھی کبھی آ جاتا ہے یہ میرا بہترین دوست ہے۔''

مائیکل ایک لمبا تڑنگا موٹا سخت چہرے والا آدمی تھا' مجھے تو وہ بالکل ہی اچھا نہیں لگا...... اُس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا جب میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تو اس کا ہاتھ مجھے بہت سخت محسوس ہوا' یا پھر اس نے خود سختی سے میرا ہاتھ پکڑا تھا' میں دل ہی دل میں مائیکل سے ڈر سی گئی تھی' اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''مجھے مائیکل بالکل اچھا نہیں لگا آپ کو اس سے برا آدمی نہیں ملا دوست بنانے کے لیے۔'' میں نے مائیکل کے جانے کے بعد ممی سے کہا۔

''اچھائی برائی میں کیا رکھا ہے دولت مند ہے مجھ پر بہت خرچ کرتا ہے دیکھو یہ فلیٹ اِس کا کرایہ میں اپنی سیلری سے بھلا دے سکتی ہوں؟''

''ساری زندگی آپ خوشیوں کے پیچھے بھاگی ہیں کیا سب خوشیاں مل گئیں آپ کو؟'' مجھے ممی پر غصہ آ رہا تھا۔

''جو میں چاہتی ہوں وہ تو مل جاتا ہے نا۔'' ممی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''میری طرف دیکھیں......'' ممی نے میری طرف دیکھا۔

اب میں ممی کو کیا بتاتی کہ مجھے اُن کے چہرے اور آنکھوں میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں نظر آ رہا تھا۔

''چلو اب تم اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو' اور یہ بڑی بڑی باتیں مت سوچا کرو' مائیکل نے کہا ہے کہ وہ تمہارا سب خرچ اٹھائے گا ہاسٹل کی فیس سمیت۔''

''مائیکل...... مائی فٹ......'' یہ کہتی ہوئی میں غصے سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

اب مائیکل تقریباً روز ہی آنے لگا تھا اور مجھ سے قریب ہونے کی کوشش بھی کرتا تھا وہ میرے لیے تحفے اور چاکلیٹ بھی لاتا مگر میں کچھ نہ لیتی بلکہ وہ آ جاتا تو میں وہاں سے چلی جاتی۔

ایک دن ممی نے مجھے کہا۔

''دیکھو مائیکل کے ساتھ بنا کر رکھو ورنہ؟'' وہ چپ ہو گئیں۔

''ورنہ وہ میرا خون پی جائے گا' وہ ڈریکولا ہے کیا؟ ویسے لگتا تو بالکل ویسا ہی ہے۔'' میں نے غصے اور نفرت سے کہا۔

''ممی آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔''

''نہیں چھوڑ سکتی۔'' ممی کی آواز میں اک بے بسی تھی۔

''وہ مجھے پسند ہے۔''

''اچھا آپ کو پسند ہے تو اسے میرے سر پر مت مسلط کریں' نہ مجھے اس کے پیسوں سے پڑھنا ہے نہ اس کی کوئی مدد لینی ہے۔ یہ بات آپ آج اچھی طرح سن لیں۔''

''اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو ہم دونوں کے لیے مشکل ہو سکتی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں حیران ہوئی۔

''میں پولیس کے پاس جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''پولیس ثبوت مانگے گی کیا کوئی نشان ہے کہ اس نے تم پر تشدد کیا ہے۔ وہ تمہیں بچوں کے ہاسٹل چھوڑ آئے گا (ایک قسم کی بچوں کی جیل) جہاں لاوارث بچے ہوتے ہیں' اور بہت خطرناک جگہ ہے وہاں بچوں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں' تم تو بہت نازک ہو۔''

ممی نے مجھے گلے لگایا اور اُن کے آنسو بہہ

نکلے۔ سچ اُس وقت مجھے ممی کی محبت کا احساس ہوا تھا۔

میں اُس روز صبح سے اپنے اسکول کی ایک سہیلی کی طرف گئی ہوئی تھی' جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو ممی کے کمرے سے مائیکل کے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے تھوڑا سا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اف میرے خدا...... مائیکل نے ممی کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور اذیت سے امی کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ میں تو جیسے خوف سے جم سی گئی تھی۔

''پولیس کے پاس جاؤ کی' جاؤ جاؤ شوق سے' جب پولیس کو تمہاری ڈرگ سپلائی والی ویڈیو ملیں گی تب تمہیں پتہ چلے گا کہ کیسے پولیس کے پاس جاتے ہیں۔'' مائیکل نے ممی کو جھٹکا دیا۔

''وہ تو تم نے مجھے پھنسایا ہے۔'' ممی نے کراہتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے پھنسایا ہے کیا...... بہت بھولی ہے تُو۔'' اُس نے ممی کو دھکا دیا۔

''اپنی بیٹی کو سمجھا لے آج آخری بار کہہ رہا ہوں...... کتیا کی بیٹی بھی کتیا ہی ہے' لیکن میں بھی شکاری ہوں شکاری...... ایسا دبوچوں گا کہ وہ ساری اکڑ بھول جائے گی تیری طرح۔'' وہ ہنسا اور میں جھرجھری لے کر اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ اب یہ کمرہ میرے لیے بھی خطرہ بن چکا تھا۔ اُف ایسا تشدد تو میں نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں یہی سوچ رہی تھی اور جب میں یہ سب سوچ رہی تھی تب میں اپنے بیڈ کے تقریباً نیچے کی طرف تھی' اس طرح لیمپ کی روشنی مجھ پر نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے مگر کہاں جاؤں؟

ایکدم کمرے کا دروازہ کھلا' وہ مائیکل ہی تھا' میں نے اُس کے جوتے دیکھ لیے تھے۔

''ٹھیک ہے میری' آج میں تمہارا یہیں انتظار کرتا ہوں' بہت تڑپایا ہے تم نے مجھے......'' وہ میری تصویر سے جو میرے بیڈ کے سرہانے رکھی تھی' باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میں یہ سب بیڈ کے نیچے دبکی ہوئی اپنی الماری کے شیشے میں دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ مکمل لیمپ کی روشنی میں تھا۔

''اے گاڈ میری مدد کر' اے میری نانی کی نیک روح' تو میری مدد کر مجھے اس ظالم سے بچا۔'' میں سانس روکے جتنی دعائیں یاد تھیں وہ سب مانگ رہی تھی۔

''میں روشنی کی طرف جانا چاہتی ہوں...اے گاڈ مجھے بچا لے...... اگر مائیکل میری ہلکی سی بھی آہٹ سن لے گا تو وہ مجھے بیڈ کے نیچے سے نکال کر کسی چڑیا کی طرح دبوچ لے گا۔'' میں نے پھر سے دعائیں مانگنا شروع کیں' اتنے میں میرے باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا اور پھر بند ہو گیا میں نے فوراً مائیکل کی طرف دیکھا' وہ بھی اُسی طرف دیکھ رہا تھا کہ اندر سے کسی چیز کے گرنے کی ہلکی سی آواز آئی' چند ثانیے اس نے کان آواز کی طرف لگائے اور پھر وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ جیسے ہی وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا......

میں چھپاک سے بیڈ کے نیچے سے نکلی اور ایک ہی چھلانگ میں بغیر آواز کیے کمرے سے باہر نکل آئی' باہر نکلتے ہی میں نے کمرے کو لاک کیا تھا جو کہ چابی لاک میں لگی ہوئی تھی۔ میں سیدھی ممی کے کمرے میں گئی ممی کا کوٹ اور پرس لیا جو گرز ہاتھ میں لیے اور باہر کی طرف بھاگتے

ہوئے میں نے ممی کو دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑی تھیں' انہوں نے ہاتھ میں گلاس تھاما ہوا تھا' میں دوڑ کر باہر آ گئی اور گلی میں بھاگتی چلی گئی پھر کچھ دیر بعد میں سانس لینے کو رُکی تو میں نے چاروں طرف دیکھا میں اپنے گھر سے کافی دور آ چکی تھی۔

اُف میرے پیر گندے اور ٹھنڈے ہو چکے تھے کیونکہ باہر بہت ٹھنڈ تھی۔ پارہ منفی ڈگری پر جا رہا تھا۔ ایسے موسم میں گھروں میں تو آٹو میٹک ہیٹر چلتے رہتے ہیں اس لیے بس ہلکی ٹھنڈ محسوس ہوتی تھی' ویسے بھی اب برف باری شروع ہونے والی تھی' میں نے ایک تاریک سے کونے میں بیٹھ کر اپنے سوکس اتارے جو گندے ہو چکے تھے' ممی کے جوگرز جو کہ میرے ہاتھ میں تھے وہ پہنے اور سوکس اپنے پرس میں رکھ لیے جو کہ ممی کا تھا' اُسی پرس میں ایک ٹوپی بھی رکھی تھی وہ بھی میں نے سر پر اس طرح پہن لی کہ میرا چہرہ کافی حد تک اُس میں چھپ گیا' اب میں تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگی بس اسٹاپ پر پہنچ کر جو بھی بس آئی میں اس میں بنا دیکھے سوار ہو گئی' میں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھی' بس کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی حالات کے دھارے پر چلنے لگا۔

اُس وقت مجھے اپنی نانی بہت یاد آ رہی تھیں' ہاں یاد آیا آج بھی تو میری مدد میری نانی کی نیک روح نے ہی کی تھی نا...... مجھے یقین تھا کہ اُن کی روح ہی باتھ روم میں داخل ہوئی تھی' اور مائیکل کو بھی اسی نے اندر آنے پر مجبور کیا تھا' ورنہ بند باتھ روم میں کون تھا' یقیناً وہ نانی کی روح ہی تھی۔ جو مجھے مائیکل جیسے شیطان سے بچانے آ گئی تھی۔ نانی کا لاڈ و پیار یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جہاں بس رُکی وہ آخری اسٹاپ تھا سب اترنے لگے میں بھی اتر گئی اور یہ دیکھ کر تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہ تو وہ علاقہ تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا' مجھے اپنی نانی اور بچپن یاد آنے لگے' کتنا محفوظ بچپن تھا میرا...... نانی نے مجھے زمانے کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی' انہیں یہ قانون بالکل پسند نہیں تھا کہ بچے ماں باپ کو چھوڑ کر چلتے بنیں۔

اسی لیے تو مغرب میں نوجوان نسل بے راہ روی کا شکار ہے' اخلاقی قدریں دن بہ دن گرتی جا رہی ہیں' یہ سب نانی کہتی رہتی تھیں۔

''دیکھو میری! خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رکھنا ہمت نہیں ہارنا۔'' یہ سب سوچتے ہوئے میرے آنسو گالوں پر بہنے لگے جن کو صاف کرتے ہوئے میں نے اپنی ایک اسکول کے زمانے کی سہیلی کے گھر جانے کا سوچا اور جب اسے میں نے فون ملایا تو مل گیا۔

''ہیلو ٹریسی......''

''ہیلو...... ہیلو...... کون؟'' دوسری طرف ٹریسی ہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

''ارے...... میں میری...... ہوں...... تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''اچھا چلی آؤ......'' پھر اُس نے مجھے اپنا ایڈریس سینڈ کیا تھا۔

میں جب ٹریسی کے پاس پہنچی تو وہ مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملی ہم بہت دیر باتیں کرتے رہے' اسکول کے زمانے کی باتیں' میں نے ٹریسی کو بتا دیا کہ میں اب اس کے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہوں' اور گھر سے بھاگنے کی وجہ بھی بتا دی' اُسے بھی میرا حال جان کر بہت دکھ ہوا اُس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''جب تک چاہو...... رہو...... تم میری بہترین فرینڈ ہو اور اچھے فرینڈ ہمیشہ برے وقت میں کام آتے ہیں۔'' ٹریسی نے مجھے تسلی دی۔

اب میں ٹریسی کے فلیٹ میں رہنے لگی میرے پاس ممی کے پیسے تھے' لیکن ایک دن تو وہ ختم ہو جاتے' اسی لیے میرے کہنے پر ٹریسی نے جہاں وہ کام کرتی تھی' وہیں اپنی ضمانت پر مجھے بھی کام پر لگا دیا' پیسے کم تھے لیکن اس طرح میں مصروف ہو گئی تھی اور میں ٹریسی پر بوجھ بھی نہیں بننا چاہتی تھی۔ کام بھی نہایت آسان تھا بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر رکھے کارٹنز کھول کر ان میں سے مختلف اشیاء نکال کر ٹرالی میں رکھتی' جسے دوسری لڑکی اوپر اسٹور میں رکھ آتی۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے ایسا لگتا کہ کہیں سے مائیکل آ جائے گا' اس خدشے کا اظہار میں نے ٹریسی سے بھی کیا تھا...... تو اس نے کہا تھا۔

''ایسے ڈرتی رہو گی تو زندگی کیسے گزرے گی تمہاری' بس محتاط رہو کسی کو کیا پتہ کہ تم یہاں ہو۔'' لیکن میرا دل خدشوں میں ہی ڈوبا رہتا۔

اُس روز میرا آفس سے آف تھا۔ ٹریسی کے فلیٹ پر اُس کی فرینڈز اور بوائے فرینڈ جمع تھے مجھے بخار چڑھا ہوا تھا' میں نے دوا لے لی تھی لیکن پھر بھی سر میں ہلکا ہلکا درد تھا' لڑکے لڑکیوں نے مختلف کاسٹیوم اور ماسک لگائے ہوئے تھے' خوب ہلا گلا ہو رہا تھا' میں بھی ماسک چڑھائے ہوئے بیڈ روم میں بیٹھی تھی کہ ٹی وی لاؤنج میں شور کچھ زیادہ ہی ہو گیا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ میری تو جان نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ ابھی جن لوگوں کی وہاں انٹری ہوئی تھی ان میں مائیکل بھی تھا۔

''اُف میرے خدا یہ یہاں بھی پہنچ گیا۔''

میں نے فوراً ٹریسی کو ایس ایم ایس کر کے بیڈ روم میں بلایا وہ فوراً آ گئی۔

''کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟'' اُس نے میری پیلی رنگت دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اُسے کہا۔

''خاموشی سے میری بات سنو ابھی جو لوگ آئے ہیں نا اُن میں براؤن بالوں والا مائیکل ہے تم بھی اُس سے ہوشیار رہنا...... میں تو اب یہاں سے جا رہی ہوں۔''

''کہاں جاؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''بس اِس وقت تو جانا ہو گا زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اپنا خیال رکھنا خدا تمہاری بھی حفاظت کرے بائے۔''

میں نے وہاں سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہی گلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر طرف رش تھا' لوگ مختلف کاسٹیوم پہنے گھوم رہے تھے' سنو فال شروع ہو گئی تھی تو لوگوں نے بار روم کا رخ کیا تھا' گلیاں رستے سنسان ہونے لگے تھے' ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ٹھنڈ اور خوف کی وجہ سے میرے سر کا درد بھی بڑھنے لگا' یا شاید پھر مجھے بخار ہو رہا تھا کیونکہ مجھ سے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا تھا۔ اور پھر یکایک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک نرم گرم بستر میں تھی' میں نے ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن بدن تو جیسے پتھر کا ہو چکا تھا' میں نے اپنی کیفیت سمجھنے کی کوشش کی' لیکن ذہن بجھنے لگا تھا اور میں پھر اندھیروں میں ڈوب گئی میری آنکھ دوبارہ کسی کی آواز پر کھلی تھی میں نے جب آواز کی طرف دھیان دیا تو پتہ چلا کہ وہ الیکٹرک ہیٹر تھا جو کمرہ گرم کرنے کے لیے چلایا جاتا ہے' گرم کمرہ نرم آرام دہ بستر یہ سب مجھے ایک خواب لگ رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ میں ابھی [illegible] آرام [illegible]

رہوں۔ اور ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' ایک دھیمی سی مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی تھی' میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں سامنے گورا رنگ کالے بال ہلکی کالی داڑھی' مونچھ' ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر کے چشمے میں سے جھانکتی شفیق کالی آنکھیں موجود تھیں۔ سامنے والا بہت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔

''زیادہ حیران مت ہوں میں آپ کا ڈاکٹر ہوں...... آپ آج سے دو دن قبل برف پر بے ہوشی کی حالت میں ملی تھیں' ڈاکٹر ہونے کے ناطے میں آپ کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا۔ اسی لیے آپ کو یہاں لے آیا۔'' اُس نے بات مکمل کی۔

میرے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس خارج کی' کیونکہ سامنے جو ڈاکٹر تھا وہ بہت مہربان لگ رہا تھا۔ میں خاموش رہی تب وہ پھر بولا۔

''دیکھو اچھی لڑکی! اب یہ ڈرپ ختم ہو جائے گی تو تم میں اتنی انرجی ضرور آ جائے گی کہ تم مجھ سے بات کر سکو' اور اپنے گھر جا سکو۔'' ڈاکٹر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''گھر......'' یہ لفظ سنتے ہی میرے آنسو خود بخود نکلنے شروع ہو گئے حالانکہ میں رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر شاید میں بھاگتے بھاگتے ہمت ہار چکی تھی۔

''ارے ارے...... رُو کیوں رہی ہو؟ تم مجھے اپنا پتہ بتاؤ میں تمہارے والدین کو خود ہی لے آؤں گا۔'' وہ مجھے روتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

والدین کا نام سنتے ہی میں اور زور زور سے رونے لگی تھی۔

''اچھا...... اچھا...... اب میں نہیں پوچھوں گا جب تک تم خود نہیں بتاؤ گی' تم بہت اچھی لڑکی ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پھر سے بیمار ہو جاؤ' اپنی انرجی رونے میں ضائع مت کرو۔'' ڈاکٹر نے مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

میں نے پانی غٹاغٹ پیا' اور گلاس اُسے لوٹا دیا' گلاس لیتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا جبکہ میں کافی گھبرائی ہوئی تھی' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔

ڈاکٹر نے ڈرپ کی طرف دیکھا وہ خالی ہو چکی تھی وہ ڈرپ اتارتے ہوئے بولا۔

''میں یونیورسٹی جا رہا ہوں' رات دیر سے آؤں گا سامنے واش روم ہے اور کچن میں فرج رکھا ہے جو سمجھ میں آئے کھا لینا' اوون بھی موجود ہے اگر بھوک لگی ہے تو اس وقت میں تمہیں چائے بسکٹ دے سکتا ہوں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جلدی سے نہیں میں گردن ہلا دی' کیونکہ میری زبان اور گلا میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ چاہنے کے باوجود میرے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا تھا۔ اور میں پھر بستر میں دبک گئی تھی اور سوچنے لگی تھی کہ اُسے کہوں گی کہ مجھے کچھ دن اپنے گھر میں رہنے دے تاکہ میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر سکوں' وہ بہت مہربان اور خدا ترس لگ رہا ہے۔ ضرور میری بات مان لے گا۔

میں نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بیڈ روم کا فلیٹ تھا' لیکن تھا کافی خوبصورت میں ٹی وی لاؤنج میں بستر پر تھی' شاید یہ میرے لیے

عارضی بستر لگایا گیا تھا۔ تاکہ گرم بستر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا جا سکے۔ ساتھ ہی ایک جانب سنگل صوفہ اور میز رکھی تھی' شاید ڈاکٹر یہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔

جب ڈاکٹر کی واپسی ہوئی تو میں نے اُسے ساری بات بتا دی تھی اور یہ التجا کی تھی کہ مجھے کچھ دن اپنے یہاں رہنے کی اجازت دے دے۔ اس دوران وہ میری آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو بار بار ٹشو پیپر سے صاف کرتا رہا۔ اُس کا نام ذیشان وقار تھا جبکہ اس کے نام کی طرح اس کی شخصیت بھی بردبار اور پُروقار تھی' اس نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی جس کے بعد میں وہاں رہنے لگی' ہمارے مغربی معاشرے میں نامحرم کوئی لفظ نہیں ہے اگر کوئی لڑکی لڑکا ساتھ رہے تو اُسے فرینڈ شپ کہا جاتا ہے۔

میں وقار کے ساتھ رہتے ہوئے اسے جوجو کے نام سے پکارنے لگی تھی' جب سے میں نے جوجو کے ساتھ رہنا شروع کیا' تب سے میں اُس سے کافی متاثر ہو چکی تھی' وہ روزانہ صبح سویرے میٹھی آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا تو ماحول پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا' مجھے یہ جوجو نے ہی بتایا تھا کہ اس مقدس کتاب کو قرآن پاک اور اس کو قرأت کے ساتھ پڑھنے کو تلاوت کہتے ہیں' پھر وہ ترجمہ پڑھتا تب میں کھو سی جاتی' وہ پانچ وقت کا نمازی تھا میں اُسے دیکھ کر حیران ہوتی کہ اس کے چہرے پر ایک نور کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے جو اُسے اور پُروقار بنا دیتا ہے۔

وہ مجھے بہت عزت و پیار سے مخاطب کرتا جس کی وجہ سے میں اس کے ساتھ بہت سکون سے رہ رہی تھی۔

ایک رات میں خواب میں بری طرح ڈر گئی، میں اکثر خواب میں ڈر جاتی تھی اُس رات بھی میں اسی طرح ڈر گئی' جیسے ہی آنکھیں بند کرتی لگتا کوئی میرے سرہانے کھڑا ہے اور میرا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے' میری سانس بند ہونے کو تھی کہ میری آنکھ کھل گئی' میری سرہانے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی' میں نے جوجو کے بیڈ روم کی طرف دوڑ لگا دی اور اُس کا کمبل اوپر کر کے اس کے کمبل میں گھس گئی جوجو کی میری طرف پیٹھ تھی وہ بیدار نہیں ہوا گہری نیند میں تھا۔ پھر اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا صبح جب میں جاگی تو وہ چائے بنا رہا تھا۔ میں شرمندہ تھی کہ وہ سوچ رہا ہوگا کہ شاید میں بھی کوئی بری لڑکی ہوں جو بغیر اجازت اُس کے بستر میں گھس گئی' میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا کیا؟'' جوجو نے پوچھا۔

میں نے ''ہاں'' میں گردن ہلا دی۔

''اِس میں ڈرنے والی کیا بات ہے۔ میں ہوں نا' اچھا کیا جو میرے پاس آ گئیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میرا چھوٹا بھائی بھی رات میں جب ڈر جاتا ہے تو وہ بھی میرے بستر میں آ جاتا ہے اور میرے ساتھ لپٹ کر سو جاتا ہے۔ تم نے آج مجھے گھر کی یاد دلا دی۔'' اس کے شفاف چہرے پر پاکیزہ سی مسکراہٹ اور لہجے میں گھر والوں کی محبت نظر آ رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دی۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ مجھے بھی بچہ ہی سمجھتا تھا' حالانکہ اُس کی اور میری عمر میں اتنا زیادہ فرق تو نہیں ہوگا

ن [illegible] ہیم حاصل کرنے کے [redacted]

[illegible]

[illegible]

[illegible] یہاں [illegible] میرے [illegible] قرض ہیں کہ جنہیں میں مر کر بھی [redacted] اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کا سب سے بڑا بیٹا ہے' ایک بہن ہے پھر چھوٹا بھائی ہے وہ سب مجھے بہت چاہتے ہیں اس کے علاوہ میری منگیتر بھی ہے جس کے ساتھ اب میری شادی ہو جائے گی۔

''وہ تمہیں پسند ہے؟ کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہ بھی تمہاری طرح معصوم سی ہے اور مجھے پسند بھی۔'' وہ اطمینان کے ساتھ سب کچھ بتا اتھا جبکہ اس کی اس بات سے میرے دل میں [illegible]

[illegible] ایسا [illegible] زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں مضبوط اور [illegible] ہو رہی تھی' وہ میری ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی [illegible] رہا تھا' وہ مجھے زمانے میں زندگی گزارنے کے اصول [illegible] اور ہر طرح کی اونچ نیچ سمجھاتا تھا اب مجھے اس کی عادت سی پڑ گئی تھی لیکن......؟ اس سے آگے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی جاتے ہوئے وہ اپنے فلیٹ کی چابی مجھے دیتے ہوئے بولا تھا کہ جب میں جاؤں تو چابی فلیٹ کے مالک کو دے جاؤں۔

جوجو کے جانے کے بعد میں نے بہت سوچا [illegible] چلی جاؤں کسی ادارے یا کسی ہاسٹل میں [illegible] کر رہوں اور اپنے کاغذات' کارڈ وغیرہ بنوالوں' کیونکہ اب میں اٹھارہ سال کی کافی پُراعتماد لڑکی تھی' میں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کافی سوچا اور فیصلہ کیا کہ جب جوجو آئے گا [illegible] اپنے اسکول سے سرٹیفکیٹ لے کر اس کے [illegible] گی اور کاغذات بنواؤں گی۔

جوجو ایک دن بالکل اچانک واپس آ گیا۔ وہ شادی کر کے آیا تھا اس نے آتے ہی مجھے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی تصویریں دکھائیں' شادی کی ویڈیوز اور فوٹوز دکھائے۔ ان تصویروں اور ویڈیوز میں وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی بہن کے بچوں کے ساتھ بھی بہت فرینک تھا تصویروں میں کہیں بچے اُسے گھوڑا بنا کر سواری کر رہے تھے تو کہیں وہ اُن کے ساتھ فٹبال یا کرکٹ کھیل رہا تھا' بہت خوشی اور آسودگی تھی جوجو کے چہرے پر' آخر میں اُس نے اپنی دلہن کے فوٹو دکھائے واقعی وہ سادہ سی لڑکی بہت پیاری لگ رہی تھی جوجو بھی بہت جچ رہا تھا دولہا بن کر' میرے لیے پاکستانی شادی کے فوٹو بہت امیزنگ تھے' ان کی شادی میں مایوں' مہندی' برات' کی رسمیں بہت اچھی اور مختلف لگ رہی تھیں اور وہ پورے خاندان کا مل کر ناچنا گانا' مذاق وغیرہ خوشیوں کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ تصویریں اور ویڈیوز دکھاتے ہوئے تفصیل بھی بتاتا جا رہا تھا اُس کے چہرے پر روشنی کا ایک ہالا سا دکھائی دے رہا تھا۔

اگلی صبح جوجو یونیورسٹی جانے لگا تو میں نے اُس سے کہا۔

''جوجو تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے کہ میں تو تمہارے گلے پڑ گئی ہوں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ اُس کی پشت میری طرف تھی' میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے' میں جو تھوڑی دیر پہلے چہک رہی تھی بالکل خاموش ہو گئی۔ تو وہ مڑا۔

''ارے...... میں تو مذاق کر رہا تھا...... مجھے یقین تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی اسی لیے تو میں نے تم سے جانے نہ جانے کا پوچھا تک نہیں...... اور مجھے خوشی ہوئی تمہیں موجود پا کر سچ......''

میں روتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا دی اُس نے مجھے کسی بچی کی طرح سینے سے لگا کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''جب تک میں یہاں ہوں تم بے فکر ہو کر رہو میں تمہیں کبھی جانے کو نہیں کہوں گا۔''

جوجو کی مدد سے ہی میں نے اپنے ڈاکومنٹس اور این آئی سی وغیرہ بنوائے اور اسی کی مدد سے اس چھوٹے سے قصبے میں ایک اسٹور پر مجھے نوکری مل گئی تھی' اب میں آزاد و خود مختار اور برسرِ روزگار تھی' اس کے ساتھ ہی میں نے جوجو کی اجازت سے یہاں پنسلوانیا میں اس ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لی۔ اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کے لیے بھی میں نے جوجو سے مشورہ کیا تو اس نے کہا۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے...... مجھ سے جو مدد چاہو گی میں حاضر ہوں۔''

''جوجو مجھے شرمندہ مت کرو...... تم ہی نے تو مجھ کو مجھ سے ملایا ہے میرے اندر یہ اعتماد تمہاری ہی وجہ سے تو ہے۔'' میں سچ مچ اُس کی ممنون تھی۔

''بابدولت تم سے خوش ہوئے تمہاری خوشامد ہمیں پسند آئی۔'' جوجو کی آنکھوں میں شرارت تھی' اور میں مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے

غزل

محفل کا ایک رنگ مرے دل میں رہ گیا
پھر دل کہاں کہ دل اسی محفل میں رہ گیا

خوش تھا بہت خیال کی وسعت میں دل مرا
جو آج صرف تیرے مقابل میں رہ گیا

وہ درد جو قرار کی صورت نہ پا سکا
وہ خواب جو خیال کی منزل میں رہ گیا

مت پوچھ اختیار کی بے اختیاریاں
شور فغاں بھی شور سلاسل میں رہ گیا

ایسا ہی بے ہنر ہے کہ دل راہِ عشق کی
مشکل میں آ گیا تھا سو مشکل میں رہ گیا

دنیا کی دست بُرد سے جو بچ گیا تھا دل
وہ بھی نواحِ کوچۂ قاتل میں رہ گیا

مصروف تھا کبھی جو تمنا کے باب میں
وہ دل' وہ دل بھی حیرت حاصل میں رہ گیا

اجمل سراج

ہوئے سوچ رہی تھی۔
''کتنا اچھا ہے میرا یہ دوست......''
اس کے بعد میں نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسلام کی حقانیت سے متعلق کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دیں' کلام پاک کا انگریزی ترجمہ بھی پڑھنا شروع کیا۔ جس کی بدولت میرے دل میں ایک سکون کا دریا بہنے لگا اب میں نے اسلامی درس بھی لینا شروع کر دیا۔ پڑھائی' جاب' اور اسلامی درس مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی' ہر ہفتے کی شام کو جوجو واشنگٹن سے چار گھنٹے کی ڈرائیو کر کے مجھے یہاں لینے آ جاتا تب میں فرصت کے چند گھنٹے نکال کر اس کے ساتھ کہیں گھومنے چلی جاتی ہم ڈنر ساتھ کرتے اور لیٹ نائٹ واپس لوٹتے کبھی کبھی وہ میرے ساتھ درس سننے بھی چلا جاتا۔
اتوار کو میں اپنے بہت سے چھوٹے موٹے کام نمٹایا کرتی پتہ نہیں کیوں ان دنوں مجھے ممی بہت یاد آتی تھیں' کبھی کبھی تو میرے آنسو نکل آتے' کاش ایک بار میں ممی کو دیکھ لوں' ان گزرے سالوں میں ممی کا نہ معلوم کیا حال ہوا ہوگا۔ وہ نیویارک میں نہ معلوم کہاں ہوں گی۔
پنسلوانیا آنے سے پہلے میں نے اُن کو ایک بوتھ سے فون کیا تھا' انہوں نے شکر ادا کیا کہ میں زندہ اور خوش تھی' انہوں نے مجھے ملنے اور فون کرنے سے منع کر دیا تھا کہا تھا کہ اب میں مائیکل کے ساتھ نیویارک میں ہوں' تم اپنا بہت خیال رکھو اور مجھے بھول جاؤ خدا حافظ۔'' انہوں نے جلدی سے فون رکھ دیا تھا اور میں حسرت و افسوس سے فون کو دیکھتی رہ گئی تھی جو کہ کب کا بند ہو چکا تھا۔
میں نے آخری بار جب ممی کی آواز سنی تھی اُس کو دو سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میں دل سے مسلمان ہو چکی تھی' بس ظاہری طور پر اظہار کرنا باقی تھا' میں نے حجاب بھی لینا شروع کر دیا تھا' مجھے اپنے معاشرے کی روش بالکل پسند نہیں تھی یہ کیسی آزادی تھی کہ جس میں گھر' خاندان' ماں باپ کچھ بھی نہ تھا بس انفرادی طور پر ہر کوئی اپنی زندگی جی رہا تھا حالانکہ انسان اس طرح جی نہیں سکتا اُسے دکھ سکھ بانٹنے کے لیے دوسروں کے سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی سب سوچتے سوچتے پھر میرے اندر تھکن اترنے لگی تھی۔ اور ساتھ ہی اُداسی بھی کہ جوجو نے مجھے جلد ہی اپنی پاکستان واپسی کے بارے میں بتا دیا تھا۔
اُس روز ویک اینڈ تھا اور میں صبح سے اُس کا انتظار کر رہی تھی' جب وہ آیا تو میں اُداسی میں گھری ہوئی تھی' اس نے مجھے بہت سیر کروائی' پھر ہم ڈنر کرنے حسب عادت ریسٹورنٹ میں آ گئے' وہ بھی چپ سا تھا۔
''تم کیوں چپ ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''تم جو چپ ہو تو میں خوش کیسے ہو سکتا ہوں۔ ویسے کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' جوجو نے پوچھا۔
''ہاں...... کیا تم میرا یہ مسئلہ حل کر سکو گے؟''
''کیا بہت مشکل مسئلہ ہے؟'' جوجو نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔
''پتہ نہیں' میں تذبذب کا شکار تھی۔
''کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گے؟'' میں نے سنجیدگی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
چند ثانیے وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
''دو باتیں ہیں...... ایک تو تم یہاں جن آسائشوں کی عادی ہو وہ میرے گھر میں بالکل نہیں ہیں' کیونکہ ہم دیہاتی لوگ ہیں' وہاں پکی

سڑکیں ہیں نہ بجلی کی سہولت' پانی بھرنے سے لے کر گھر کے تمام کام سب ہماری عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں' ہمارے ہاں مرد گھر کے کام نہیں کرتے صرف کماتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے اپنے گھر والوں سے خصوصاً اپنی بیوی سے جو کہ اب میرے بچے کی ماں بھی ہے' اجازت لینی پڑے گی' اگر انہوں نے اجازت دی تب یہ شادی ہو سکے گی ورنہ نہیں' میں تمہیں اندھیروں میں رکھنا نہیں چاہتا۔'' اُس نے صاف گوئی سے کہا تھا اور مجھے بھی اُس کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی تھی۔
''مجھے سب منظور ہے بس تم اجازت لے لو' آئندہ ویک اینڈ تک میں انتظار کروں گی۔''
''اللہ بہتر کرے گا۔'' جوجو نے کہا تھا۔
دو سال آپ کسی کے ساتھ رہ لیں تو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ جوجو کے لیے میرے خیالات یہی تھے کہ وہ بہت سچا اور اچھا بندہ ہے اب اِس سچے اور اچھے بندے کے ساتھ شادی کر کے میں اپنی فیملی بنانا چاہتی تھی' مسلم معاشرے کی یہ ہی بات مجھے بہت پسند تھی کہ اس میں خاندان و برادری سسٹم ہے' کیونکہ گھر چاہے کتنا ہی پُرآسائش اور بڑا ہو لیکن اگر اس میں رشتے نہ ہوں تو وہ ایک سرائے لگتا ہے جہاں صرف رات گزاری جا سکتی ہے۔ اب میں اپنے خدا سے یہ ہی دعا مانگ رہی تھی کہ جوجو کی فیملی والے مان جائیں اور میری زندگی میں سکون آ جائے۔
بعد ازاں ایک ماہ تک جوجو کے گھر والے مجھ سے اور جوجو سے بات چیت کرتے رہے اور پھر انہوں نے جوجو سے کہا۔
''جب تم پاکستان آؤ تو اُسے بھی ساتھ لے آنا' ہم تمہاری دوسری شادی اپنی رسم و رواج کے مطابق خود اپنی برادری کے سامنے کریں گے۔''
یہ خبر سن کر میں بہت خوش ہوئی تھی اور خوشی سے رونے لگی تھی۔ اس رونے دھونے کے دوران ہی شدت جذبات سے مغلوب ہو کر جوجو کو میں نے گلے لگا لیا تھا۔ اور خود ہی شرما گئی تھی جوجو کی آنکھوں میں بھی محبت کے جگنو جگمگا رہے تھے۔ اسی ہفتے میں نے درس والی مسجد میں جوجو کے ساتھ جا کر دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور میرا نام میرین سے مریم رکھ دیا گیا جب جو مجھے مریم کہتا تو میں خوشی سے پھولی نہ سماتی' اور اب کچھ روز بعد میں اور جوجو پاکستان چلے جائیں گے۔
کوئی ایک ماہ بعد مجھے پاکستان سے مریم وقار کی میل موصول ہوئی تھی۔ جوجو کے والدین اور عزیزوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا' اور بڑے دھوم دھام سے میں مریم وقار بن گئی' اس سارے کام میں وقار کی پہلی بیوی مہر بانو کا سب سے بڑا ہاتھ تھا' اسی کی کوششوں سے ہماری یہ شادی ہوئی تھی۔ اس نے ہی وقار کے والدین سے میری اور وقار کی شادی کی بات منوائی تھی۔
وہ بہت محبت کرنے والی خاتون ہے۔ گاؤں میں وقار اور اس کے والدین کی بے انتہا عزت و توقیر کی جاتی ہے اُن کی کافی زمینیں اور باغات ہیں نوکر چاکر بھی ہیں لیکن چھوٹے موٹے کام ہم عورتیں اپنی مرضی سے کر لیتی ہیں۔ ہم سب نہایت عزت و احترام اور محبت سے رہتے ہیں' میں انتہائی خوش ہوں کیونکہ یہ میری آئیڈیل زندگی ہے۔ میرا اور وقار کا عہد ہے کہ ہم اپنے گاؤں کو ایک جدید اور ترقی یافتہ گاؤں بنائیں گے اور اس جدوجہد میں...... میں جوجو کے شانہ بشانہ رہوں گی۔
☆☆......☆☆

چیچہ وطنی سے دوسری جیتی جاگتی کہانی

ایک گاؤں کی کہانی

جون ایلیا کی فکر

> تھی کسی آدمی کی تلاش مجھے
> میں نے خود کو ہی انتخاب کیا

عبدالغفار عابد

انسانوں کی غالب اکثریت بدعملی اور گناہوں سے بے پروا ہوکر وقتی مفادات اور خواہشات کو پورا کرنے میں لگی رہتی ہے۔ انسان اپنے تئیں یہ گمان کرتا ہے کہ وہ شاید اس دنیا میں



ہمیشہ رہے گا اور اس عارضی دنیا کی تمام نعمتیں اور عروج سدا اس کے ساتھ رہے گا۔ بے خبر انسان کو خبر نہیں کہ پروردگار نے اسے کس عظیم مقصد کے لیے اس دنیا میں بھیجا' ساڑھے نو سو سال حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو یہ مقصد بتانے کے لیے تبلیغ کی پر وہ قوم نہ مانی۔ اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوم کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کردیا۔ قوم عاد کے لوگ اپنی طاقت اور صلاحیتوں پر گھمنڈ کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت ہودؑ کی بامقصد باتوں کو ماننے سے انکار کردیا۔ پھر یہ لوگ بھی اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی پر اصل بات ان کی سمجھ میں نہ آئی اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک چنگھاڑ کو مسلط کردیا اور وہ قوم اس کے نتیجے میں تباہی و بربادی کا نشانہ بن گئی۔ اسی طرح حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کی اصلاح کرنے کی بہت کوشش کی۔ بدقسمتی سے وہ لوگ بھی حضرت لوطؑ کی بات کو نہ سمجھ سکے وہ ہم جنسیت جیسے قبیح فعل پر اصرار کرتے رہے پھر اللہ نے بدکرداروں کی پوری بستی کو الٹا دیا۔ حضرت شعیبؑ اپنی قوم کو بڑے خلوص اور تحمل کے ساتھ اللہ کا پیغام سناتے رہے مگر آپؑ کی قوم کے لوگ نصیحت نہ پکڑ سکے پھر رب تعالیٰ نے اُن کو بھی قوم ثمود کی طرح برباد کردیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نافرمان بادشاہ نمرود کو حق کی دعوت دی تو وہ حضرت ابراہیمؑ کا دشمن بن گیا پھر جب نمرود اللہ کی پکڑ میں آیا تو اس کا وقتی عروج اس کو عذاب الٰہی سے نہ بچا سکا۔ اسی طرح فرعون کو بھی اپنے اقتدار اور اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ حضرت موسیٰ نے جب اس کی عظیم مقصد کی طرف توجہ دلائی تو وہ نافرمانی کر بیٹھا اللہ نے پھر اُسے دریائے نیل کے حوالے کردیا اور وہ آج تک مصر کے عجائب گھر میں نشانِ عبرت بنا ہوا ہے۔

پاک کتاب میں مذکورہ قوموں اور افراد کے برے انجام کو پڑھ کر اس حقیقت کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ کوئی بھی فرد یا قوم اپنے آپ کو اس وقت تباہی کے گھاٹ اُتارنے پر تیار کرلیتی ہے جب وہ کسی بھی صورت اپنی اصلاح یا اپنے معاملات کو درست کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں' نفسانفسی کے اس دور میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس عارضی دنیا میں آنے کے عظیم مقصد کو سمجھتے ہیں زیادہ تر لوگ اس مقصد کو بھول چکے ہیں' ان کا مقصد اپنی عارضی زندگی کو حسین اور رنگین بنانا ہوتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر رکھی ہے اس حد کو پار کرنے والے لوگ اللہ کے عذاب کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی خواہشات بھی اس دین کے تابع نہ کردے جو دین میں لایا ہوں۔"

ہر ضرورت سے بے نیاز ہوکر عاجزی و انکساری سے دنیا اور آخرت کی کامیابی مل سکتی ہے' دولت اور اقتدار پر گھمنڈ کرنے والوں کو ذلت آمیز انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

☆......☆......☆

حاجی نور احمد ہمارے ساتھ والے گاؤں رنگ پور میں رہتا تھا۔ چار مربع زمین کا مالک حاجی نور احمد ایک خداترس آدمی تھا' دولت ہونے کے باوجود وہ سادہ زندگی بسر کرتا اور فرض سمجھ کر ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تھی جب والد ساتھ چھوڑ گئے۔ مرحوم والد کا غم ابھی تازہ تھا کہ ایک سال بعد والدہ بھی وفات پاگئی' ان دکھوں اور غموں نے اس کی زندگی کو بے ترتیب کرکے رکھ دیا۔ جب آدمی اللہ کی رضا پر

راضی ہو جائے تو پروردگار صبر کی طاقت دے ہی دیتا ہے' حاجی صاحب نے والدین کی جدائی کو اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور عملی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ اپنی زمینوں پر توجہ دینی شروع کی۔ ایک دن زمینوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اکٹھا کر کے کہا۔

''آج سے آپ مزدور نہیں بلکہ میرے بھائی ہو' ہم سب مل کر محنت کریں گے انشاء اللہ اس کا پھل ہمیں ضرور ملے گا۔''

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا' جب روزی حلال کی ہو تو برکت ڈال دیتا ہے' محنت اور ایمانداری سے حاجی نور احمد کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا' اب اناج سے گودام بھرنے لگے' جب بھی کوئی فصل گھر آتی تو گاؤں کی مسجد میں اعلان کرایا جاتا۔

''جو بھی غریب ہو یا جس کے گھر اناج نہ ہو وہ آکر سال بھر کا اناج مفت لے جائے۔''

ضرورت مند لوگ آتے اُن کو ضرورت کے مطابق گندم دی جاتی' کسی کو ایک بوری' کسی کو دو کسی کو چار...... غرض ہر کسی کی ضرورت کا تخمینہ لگا کر اسے اس حساب سے گندم ملتی تھی۔

حاجی صاحب کی کافی زمین غیر آباد پڑی تھی' جس کو آباد کرنے کی کوشش جاری تھی۔ گاؤں کے جنوب کی طرف جو بنجر زمین تھی وہاں خانہ بدوشوں نے اپنی جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں یہ عجیب لوگ تھے مرد سارا دن بیکار رہتے یا پھر تاش وغیرہ کھیلنے میں مشغول رہتے اور فارغ اوقات میں سوئے رہتے' ان میں بیشتر کا مشغلہ مرغ یا پھر کتے پالنا تھا' عورتیں گھریلو کام کاج کے علاوہ محنت مزدوری بھی کرتی تھیں' ان کے ذمہ معاشی حالات کو درست رکھنا اور گھر والوں کا پیٹ پالنا بھی ہوتا تھا' ان میں کئی بھیگ مانگ کر بھی گزارہ کرتی تھیں۔ اب خانہ بدوشوں کو روٹی کی فکر نہیں تھی سال بھر کے لیے اُن کو گندم مل جاتی تھی۔

حاجی نور احمد کی جو زمین غیر آباد پڑی تھی محنت اور غریب لوگوں کی دعاؤں سے تیزی سے زرخیز ہو رہی تھی' اب گاؤں کے غریب لوگوں کے دینے کے بعد بھی گندم بچ جاتی تھی' یہ گندم نزدیکی دیہاتوں کے ضرورت مند لوگوں میں برابر تقسیم کردی جاتی۔

☆......☆......☆

حاجی نور احمد بتیس سال کے ہوئے تو شادی کا خیال آیا' پھر جلد ہی انہوں نے اپنے گاؤں کے ایک چھوٹے زمیندار کی بیٹی نجمہ سے شادی کرلی۔ نجمہ بہت اچھی عادت کی مالک اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ نماز پابندی سے پڑھتی اور اپنا ہر کام وقت پر انجام دیتی۔ اپنے جیون ساتھی کی ہر بات مانتی اور ہر حکم بجالاتی' وہ جہاں اپنے شوہر کے ساتھ مخلص تھی۔ وہاں اس کا رویہ اپنے رشتے داروں سے بھی اپنائیت بھرا اور دوستانہ تھا' غرض وہ ایسی مثالی بیوی تھی جس کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے' حقیقی زندگی میں ایسی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں' حاجی صاحب اپنی بیوی کو بہت اہمیت دیتے تھے' کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اس سے مشورہ کرتے۔ نجمہ کی زندگی کسی جنت سے کم نہیں تھی۔ اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک دیہاتی لڑکی کو ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا' شادی کو چھ سال کا عرصہ ہوگیا' مگر ابھی تک وہ اولاد جیسی نعمت اور رحمت سے محروم تھے' حاجی صاحب اولاد کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے بے فکر تھے' نجمہ کبھی کبھار اولاد کی کمی کو محسوس کر کے پریشان

ہو جاتی تھی ایک دن نجمہ کی ماں اُسے ملنے آئی تو اُس نے اپنی بیٹی کی پریشانی کو محسوس کرلیا' اُس نے اپنی بیٹی کو ایک دربار کے بارے میں بتایا کہ آپ وہاں جائیں اس دربار پر جاکر خیرات کرنے والے بہت سے لوگوں کی مرادیں پوری ہوچکی ہیں' بابا مراد علی شاہ کی دعا کے صدقے اللہ میاں آپ کی بھی گود ہری کردیں گے۔

نجمہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی رات کو حاجی صاحب سے دربار پر جانے کی اجازت مانگی' خفا ہونے کی بجائے بڑے پیار سے حاجی صاحب نے نجمہ کو سمجھایا۔

''نجمہ! بچہ چاہے جتنی بھی آہستہ آواز میں روئے وہ آواز ماں کو فوراً جگا دیتی ہے' پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رب جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ اپنے بندے کی فریاد نہ سنے اور اپنے بندے کی حاجت پوری نہ کرے' اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت کے علاوہ ہر نعمت سے نواز رکھا ہے' دن بدن ہمارا رزق بڑھ رہا ہے' جو بن مانگے ہمیں سب کچھ دے رہا ہے اُس کی ذات تم پر ضرور مہربان ہوگی۔ تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرتی رہا کرو ایک نعمت کا شکر دوسری نعمت کا ذریعہ بنتا ہے' مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہ دو' پروردگار ہمیں اولاد کی نعمت سے بھی ضرور نواز دے گا۔''

اِس بات کے کچھ عرصے بعد دونوں میاں بیوی نے شہر کے ایک قابل ڈاکٹر کے مشورے پر اپنے ٹیسٹ کروائے اور نسخے کے مطابق میڈیسن کھانا شروع کردی' ٹھیک ایک ماہ بعد نجمہ نے اپنے شوہر کو خوشخبری سنا دی' یہ خوشخبری سنتے ہی حاجی صاحب نجمہ کو ساتھ لے کر عمرہ ادا کرنے سعودی عرب روانہ ہوگئے تھے۔

حاجی نور احمد اب بہت خوش تھے' جس نعمت کی دونوں میاں بیوی کمی محسوس کررہے تھے' وہ اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی صورت میں پوری کردی تھی۔ بیٹے کی پیدائش پر انہوں نے دل کھول کر خیرات بانٹی' گاؤں کے اردگرد بیٹھے خانہ بدوشوں کو مالکانہ حقوق پر پانچ پانچ مرلہ زمین تقسیم کی گئی تھی۔

اس بار بھی حاجی صاحب کی فصل پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ ہوئی تھی' حسبِ معمول انہوں نے اپنے گاؤں کے علاوہ نزدیکی دیہاتوں میں بھی اعلان کرایا کہ جس کے گھر اناج نہیں جو اناج خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہو وہ آکر اپنے حصے کی گندم لے جائے...... اُس روز حاجی صاحب ضرورت مندوں میں گندم تقسیم کررہے تھے' ایک آدمی نے چار بوری گندم کا مطالبہ کیا' اس کے گھر کے افراد کی تعداد اور کام کے بارے میں پوچھا۔ تسلی کرنے کے بعد جب حاجی صاحب اسے گندم دینے لگے تو منشی خالق نے کہا۔

''اِسے گندم نہ دو' یہ آدمی دوسری بار آیا ہے صبح مجھ سے بھی چار بوری گندم لے گیا تھا' مجھے شک پڑا کہ یہ آدمی ضرورت مند نہیں ہے' میں اس کے بارے میں معلومات لینے اس کے گاؤں گیا تھا' ابھی میں وہاں سے ہی آرہا ہوں' گاؤں کے لوگوں نے بتایا یہ آدمی مستری ہے شہر جاکر اچھی روزی کما لیتا ہے۔''

منشی خالق کی بات سن کر حاجی صاحب نے اُسے گندم دینے سے انکار کردیا اور کہا۔

''تم جو گندم پہلے لے گئے ہو وہ کل تک واپس کردو تاکہ کسی اصل ضرورت مند کو دی جائے۔'' آدمی نے منت سماجت کی۔

''پہلی والی گندم واپس نہ لو وہ واقعی ہی میری ضرورت ہے میں مانتا ہوں دوبارہ آکر میں نے

غلطی کی ہے' مگر ایک مجبوری تھی جس نے مجھے یہ غلطی کرنے پر مجبور کیا۔''

حاجی صاحب نے اس آدمی کی ایک نہ سنی اور کہا۔

''تم دھوکے باز ہو تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا' جاؤ جاکر گندم واپس لے کر آؤ' اگر تم کل تک گندم واپس نہ لائے تو میرے آدمی خود آکر گندم لے آئیں گے اور تمہارے خلاف دھوکا دہی کا کیس درج کر کے حوالہ پولیس کیا جائے گا۔'' وہ آدمی ڈر کے مارے گندم واپس لینے چلا گیا' گھر جاکر اس نے سارا واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ بیوی نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں' میں ابھی جاکر نجمہ کو اصل صورت حال سے آگاہ کرتی ہوں۔''

''نجمہ میرا شوہر مستری ہے' اس کی محنت سے گھر کا گزارا چل رہا ہے' پچھلے سال روڈ ایکسیڈنٹ میں میری بیٹی کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں' آپریشن کے لیے ہم نے ہمسائے سے کچھ رقم اُدھار لی تھی۔ واپسی کے وعدے والا ٹائم گزرے کافی دن ہو چکے ہیں' وہ بہت تنگ کر رہا تھا۔ صبح اُس نے گھر آکر کہا۔

''اگر شام تک میرے پیسے واپس نہ کیے تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' اس کے ڈر سے میرا شوہر دوبارہ گندم لینے گیا تھا تا کہ وہ گندم فروخت کر کے اس کا قرض ادا کر دے۔''

نجمہ نے اس کی بات سن کر اُسے تسلی دی۔ پھر حاجی صاحب کو گھر بلا کر اُن کی اصل پریشانی سے آگاہ کیا۔ حاجی صاحب نے وعدہ کیا کہ میں خود جاکر تصدیق کروں گا اگر یہ لوگ قرض دار ہوئے تو میں خود قرض کی رقم ادا کردوں گا۔ حاجی صاحب نے جاکر تصدیق کی تو پتہ چلا کہ واقعی وہ آدمی قرض دار تھا' انہوں نے اپنی جیب سے قرض کی رقم ادا کردی تھی۔

☆......☆......☆

رنگ پور گاؤں اور اس کے اردگرد کا علاقہ بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ دور دور تک کوئی اسپتال نہیں تھا۔ لوگوں کو علاج کے لیے کوسوں دور شہر جانا پڑتا تھا' یہی حال تعلیم کا تھا' پانچویں کے بعد بچے مفت تعلیم سے محروم تھے۔ سیاست ایک جاگیردار خاندان کے گرد گھومتی تھی' وہ الیکشن کے دوران اس علاقے میں نظر آتے' کامیابی کے بعد اگلے الیکشن تک پھر دوبارہ کبھی اُدھر کا رخ نہ کرتے' اُن کو عوامی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ علاقے کے لوگ حاجی نور احمد کی عزت کرتے تھے' وہ عوام نواز اور لوگوں کے دکھ درد کے ساتھی تھے' لوگ اُن کو اپنا مسیحا سمجھنے لگے' وہ چاہتے تھے کہ اس سال کے آخر میں ہونے والے الیکشن میں حاجی صاحب حصہ لیں' اور جیتنے کے بعد اس علاقے کی محرومیوں کو دور کر دیں۔

لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حاجی نور محمد نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرلیا جاگیرداروں نے اس فیصلے کا مذاق اڑایا' چند بزرگوں نے حاجی نور احمد کو مشورہ دیا کہ آپ الیکشن میں حصہ نہ لیں' جاگیردار سیاست کی آڑ میں غنڈہ گردی بھی کرتے ہیں۔ تھانے' کچہری میں انہوں نے اپنے آدمی بٹھائے ہوئے ہیں۔ لوگ خوف کے مارے اُن کو ووٹ دیتے ہیں۔ اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اُن کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے گھر کے کسی فرد کو اغواہ کر لیتے ہیں اور اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اُن کے مطالبات کو نہ مان لیں' علاقے میں اُن کی اجارہ داری قائم ہے' ہماری مانیں تو آپ الیکشن میں حصہ نہ لیں' اپنا فیصلہ واپس لے

لیں' اللہ نہ کرے اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔''

بزرگوں کی باتیں سن کر حاجی صاحب بولے۔

''اُن کا عروج ختم ہونے والا ہے۔ تکبر اور غرور اللہ کو پسند نہیں' اُن کا تکبر ہی اُن کی موت ثابت ہوگا' تکبر چاہے دولت کا ہو دوسروں پر آئی مصیبت کو سزا اور اپنے پر آئی مصیبت کو آزمائش سمجھنے کا ہو' طاقت کا ہو' زور تے کا ہو' حسن کا ہو' علم کا ہو' حسب ونسب کا ہو یا تقویٰ اور پارسائی کا ہی کیوں نہ ہو آخر آدمی کو مار ڈالتا ہے۔'' ایک لمحہ توقف کے بعد پھر بولے۔

''وقت کے بادشاہوں نے غریب لوگوں سے جینے کا ہی نہیں اپنی موت آپ مرنے کا حق بھی چھین لیا ہے' میں نے جاگیرداروں کے اقتدار کو چیلنج کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اُن کے خوف سے واپس نہیں لوں گا' آپ دعا کریں انسانیت کے ان دشمنوں کی عارضی جیت اس بار شکست میں تبدیل ہونے والی ہے۔ لوگ اُن کی منفی سیاست سے تنگ آچکے ہیں اب کوئی اُن کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار نہیں کرے گا۔''

جاگیرداروں کے ظلم وستم سے تنگ لوگ حاجی نور احمد کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے' حاجی صاحب کے ساتھ لوگوں کی محبت دیکھ کر' وقت کے خداؤں کو اپنی خدائی خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ اپنی چوہدراہٹ اور عزت بچانے کے لیے انہوں نے ہر حربہ آزمایا لیکن کامیاب نہ ہو سکے' پہلے پیسے کا لالچ دے کر حاجی نور احمد کو اپنے حق میں دستبردار کرانے کی کوشش کی' جب وہ اس لالچ میں نہ آئے تو پھر اُن کے بیٹے راحیل کا اغواہ کرادیا جو ابھی پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ دوسرے دن اغوا کاروں سے فون کرایا کہ اگر اپنے بیٹے کی بحفاظت واپسی چاہتے ہیں تو الیکشن سے دستبردار ہونے کا اعلان کردو۔'' حاجی صاحب نے اُن کی بات ماننے سے انکار کردیا اور کہا۔

''آپ کچھ بھی کرلیں میں جاگیرداروں کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا۔ آپ میرے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جس نے دیا ہے وہ واپس بھی کرے گا۔''

حاجی صاحب نے بیٹے کے معاملے کو اللہ کے سپرد کر کے اپنی توجہ الیکشن مہم پر مرکوز رکھی الیکشن کے دن انہوں نے صبح کی نماز پڑھ کر اپنی کامیابی اور بیٹے کی بحفاظت واپسی کی دعا مانگی' جب مسجد سے گھر آئے تو موبائل فون کی بل بج رہی تھی کال ریسیو کی تو کال کرنے والا کہہ رہا تھا۔

''آپ کا بیٹا میرے پاس ہے' میں شام تک اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا۔'' شام کو جس آدمی کے ساتھ راحیل گھر آیا اسے دیکھ کر حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے یہ وہی مستری تھا جس کا قرض حاجی صاحب نے اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔ تفصیل بتاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''راتوں رات امیر ہونے کا لالچ مجھے اغواہ کاروں کے گروہ میں لے گیا' اس گروہ کا سربراہ جاگیردار کا بیٹا تھا' ہمیں آرڈر ملتا کہ فلاں آدمی کو اغواہ کرنا ہے ہم اسے اغواہ کر لیتے اس کی رہائی پر بھاری رقم مل جاتی' اس رقم کا آدھا حصہ جاگیردار کے بیٹے کا ہوتا باقی رقم ہم برابر تقسیم کر لیتے' جس دن آپ کا بیٹا اغواہ ہوا میں گھر گیا ہوا تھا' واپس آیا تو پتہ چلا کہ میرے ساتھی جاگیردار کے حکم پر آپ کا بیٹا اٹھا لائے ہیں۔ میں نے اُس وقت ناراضی کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ پر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ راحیل کو آپ تک ضرور پہنچاؤں گا۔ جب آپ نے ان لوگوں کی بات نہ مانی تو انہوں نے آپ کے بیٹے

راحیل کو ہمسائے ملک افغانستان کے ایک ایجنٹ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا' بارڈر پار کرانے کی ڈیوٹی میری لگادی۔ میں راحیل کو بارڈر پار کرانے کے بجائے آپ کے پاس لے آیا ہوں' آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کی تھی آج اُس کا بدلا چکا دیا ہے۔''

☆......☆......☆

لوگوں نے کسی ڈر اور خوف کے بغیر حاجی نور احمد کو ووٹ دیے لہٰذا وہ اکثریتی ووٹوں سے الیکشن جیت کر قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ ہر عروج کو زوال آتا ہے جاگیردار خاندان کے اقتدار کا سورج اب ڈوب چکا تھا۔ انسانیت کے دشمنوں کی رسوائی ابھی باقی تھی۔ حاجی صاحب نے راحیل کے اغواء کا مقدمہ جاگیردار اور اس کے بیٹے کے خلاف درج کرایا تھا۔ دوسری پیشی پر ہی دونوں باپ بیٹا جیل چلے گئے تھے۔

لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ الیکشن جیتنے کے بعد بھی حاجی نور احمد نے اُن کی خدمت جاری رکھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ لوگوں کی خدمت کرنے لگے۔ سب سے پہلے انہوں نے اسپتال کی حکومت سے منظوری لی۔ جلد ہی اُس کی تعمیر شروع ہوگئی۔ اس تعمیراتی کام کا ایک اور بھی فائدہ ہوا کہ بہت سے بے روزگاروں کو مزدوری کے لیے کام مل گیا۔ حاجی صاحب نے اس تعمیراتی کام میں ذاتی دلچسپی لی۔ بہت جلد اسپتال بن گیا اب لوگوں کو علاج کے لیے شہر نہیں جانا پڑتا تھا۔

رنگ پور گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہائی اسکول بنوائے۔ اسی طرح دوسرے دیہات میں بھی اسکول اور کالج بنائے گئے اب میٹرک تک بچوں کی مفت تعلیم کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اگلے الیکشن سے پہلے علاقے کے بنیادی مسائل کافی حد تک کم ہوچکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حاجی نور احمد اپنے حلقے سے مسلسل تین بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

راحیل نے گاؤں کے ایک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا' اُدھر منشی خالق کی بیٹی عابدہ نے بھی امتیازی نمبروں میں میٹرک پاس کرلیا تھا اسے بھی شہر کے کالج میں داخل کرا دیا۔ جس کا سارا خرچہ حاجی صاحب دیتے تھے۔ گاؤں سے شہر بہت دور تھا لہٰذا دونوں کی رہائش کا بندوبست ہوسٹل میں کیا گیا۔ راحیل اور عابدہ کو ڈاکٹری شعبہ بہت پسند تھا وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ دونوں ڈاکٹری کے امتحان میں اعلیٰ پوزیشن سے کامیاب ہوکر ڈاکٹر بن گئے تھے۔

ایک روز حاجی نور احمد اور اُن کا سابقہ منشی اور حالیہ پی اے خالق اسلام آباد سے واپس آرہے تھے کہ اُن کی گاڑی سامنے سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا گئی' حادثہ اتنا شدید تھا کہ دونوں موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے۔

☆......☆......☆

راحیل عابدہ سے شادی کرکے اپنے والد مرحوم کی روح کو تسکین پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر نجمہ اس کی شادی کسی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی سے کرانا چاہتی تھی۔ اس نے راحیل کو بہت سمجھایا۔

''بیٹا عابدہ سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو کسی بڑے خاندان کی لائق لڑکی کو اپنی شریک حیات بناؤ جو آپ کے کیرئیر میں آپ کا ساتھ دے۔''

راحیل نے اپنی والدہ کی باتیں سن کر کہا۔

''آپ کے شوہر' میرے والد کی سوچ کیا

تھی؟ اور آپ کی سوچ کیا ہے؟ انہوں نے تو بڑے خاندان میں شادی نہیں کی تھی' آپ کا خاندان بڑا تھا' دولت ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے ہی گاؤں کے چھوٹے گھرانے میں شادی کی' میرے والد مرحوم نے ہمیشہ غریب لوگوں کو گلے لگایا' اُن کو اہمیت دی' آپ بتائیں عابدہ میں کیا کمی ہے؟ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور میرے ہی شعبے سے منسلک ہے' میرے کیرئیر میں میرا ساتھ دے گی۔ اُس کے والد فوت ہوچکے ہیں اور اس کی والدہ بیمار رہتی ہیں' وہ اپنی والدہ کا علاج کرائے گی یا اپنی شادی کے لیے جہیز بنائے گی۔ اس وقت اسے مخلص دوست کی ضرورت ہے جو اسے سہارا دے۔ میں نے اس کا ساتھ نہ دیا تو اور کون دے گا؟ میری شادی صرف اور صرف عابدہ سے ہوگی کیونکہ اس وقت اُسے میری اشد ضرورت ہے۔''

راحیل کی ضد رنگ لائی نجمہ نے اپنے بیٹے کی مرضی کا احترام کیا' یوں راحیل اور عابدہ کی شادی ہوگئی' یہ زبردستی کی شادی نہیں تھی بلکہ دونوں کی پسند کی شادی تھی' جس کو خاندان بھر میں نگاہ رشک سے دیکھا جارہا تھا۔ عابدہ سے شادی ہوگئی تو لگتا تھا راحیل کو دو جہانوں کی مسرتیں مل گئی ہیں وہ بہت خوش تھے' عابدہ بھی راحیل کو پاکر بہت خوش تھی' راحیل کی والدہ بھی مطمئن تھیں کہ بیٹا مسرور ہے ان کی ازدواجی زندگی میں خوشیوں کے گلاب مہک رہے تھے۔

☆......☆......☆

راحیل اور عابدہ رنگ پور گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈیوٹی کررہے تھے راحیل اپنے باپ کی طرح سادہ زندگی گزار رہا تھا اور وہ اکثر غریب اور نادار مریضوں کی اپنی جیب سے مدد کرتا' اس کی یہی بات لوگوں کو اچھی لگتی تھی اور لوگ اس کے اتنے گرویدہ تھے کہ اسے سلام کرتے نہ تھکتے تھے۔

چھٹی کا دن تھا دونوں میاں بیوی نے شہر جانے کا پروگرام بنایا وہ تیار ہوکر گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ اسپتال سے فون آیا کہ آپ جلدی اسپتال پہنچیں ایک ایمرجنسی کیس آیا ہے۔''

دونوں نے شہر جانے کا پروگرام کینسل کیا اور سیدھے اسپتال پہنچ گئے۔

راحیل نے مریضہ کو چیک کیا تو اُسے فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر راحیل نے کہا۔

''اُس کا شوہر فارم پر دستخط کرے۔''

''ڈاکٹر صاحب اس کا شوہر تو اس وقت موجود نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے وہ نہیں تو اس کا بیٹا کردے۔''

''جی وہ بھی نہیں ہے دونوں باپ بیٹا اغواء کے ایک کیس میں جیل میں ہیں۔''

''اچھا تو یہ جاگیردار کی بیوی ہے؟''

اور پھر پتہ لگا تھا کہ وہ مریضہ اُس جاگیردار کی بیوی اور بیٹے کی ماں تھی' جنہوں نے راحیل کو کبھی اغواء کرایا تھا۔

ڈاکٹر راحیل کے ذہن میں اچانک ماضی کی بجلی کوندی تھی اپنے اغواء کا منظر نمایاں ہوگیا تھا' بس ایک لمحے میں شیطان نے اُس کے دل میں نقب لگانی چاہی تھی' لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے مرحوم والد حاجی نور احمد کے خون نے جوش مارا تھا اور ڈاکٹر راحیل نے اپنی تربیت اور فرض کے سامنے شیطان کو مات دیتے ہوئے اپنے دشمن کی بیوی اور ماں کی زندگی بچانے کے لیے آپریشن تھیٹر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

☆☆......☆☆

حیدرآباد سے تیسری جیتی جاگتی کہانی

نئی زندگی

ڈاکٹر نزہت عباسی کی نذر

زندگی	کا	ہو	کوئی	تو	مقصد
زیست	یونہی	بسر	نہ	ہو	جائے

فیضان حسین عثمانی

''اسلام وعلیکم کیسی ہو ماشاءاللہ بہت اسمارٹ اور پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو' اللہ پاک نظر بد سے بچائے (آمین)۔'' میرے اس طرح ایک ہی سانس میں سوالات کی بوچھاڑ



کرنے پر ماہین نے صرف اپنی مخصوص اور دل موہ لینے والی پیار بھری مسکان ہی چہرے پر سجائے رکھی اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھتی رہی۔

''یار سنا تھا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے تم نے تو ہمیں بلانے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی' ہمیں تو کسی کے ذریعے پتہ لگا کہ ہماری پیاری ہردلعزیز دوست اپنے پیا کے گھر چلی گئی ہے تو ہمارے دل سے دعائیں ہی دعائیں نکلیں۔''

''ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں' اس طرح تو مناسب نہیں ہے یا پھر کسی دن تو چکر لگا میرے گھر' پھر بیٹھ کر تفصیل سے بات ہوگی۔'' ماہین پہلی بار اپنے ہونٹوں پر نپے تلے الفاظ کے ساتھ جس طرح وہ بولتی تھی اُسی طرح مجھ سے مخاطب ہوئی۔ تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار ٹھیک ہے' میں چکر لگاؤں گی۔ کچھ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔'' اور یہ کہتے ہوئے اُس سے اجازت لی تھی۔

گھر آ کر میں ماہین کے بارے میں سوچتی رہی تھی کہ ماشاءاللہ وہ شادی کے بعد اچھی ہو رہی ہے' اللہ پاک اُس کی یہ شادی کامیاب کرے' آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ شادی سے میری کیا مراد ہے' تو میں نے یہ شادی کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ یہ ماہین کی دوسری شادی ہوئی ہے' دو سال پہلے بھی اُس کی شادی ہوئی تھی مگر..... ہو سکتا ہے کہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔

میں اور ماہین بہت اچھی دوست ہیں' گھر قریب قریب ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ہمیشہ قریب سے قریب تر رہے ہیں' اسکول' کالج' ٹریننگ سینٹرز' یہاں تک کہ جاب تک ہم دونوں نے ساتھ کی ہے' بس یوں سمجھیں ہمیشہ ماہین جہاں ہوتی وہاں میں ہوتی تھی۔ ماہین ایک ہنس مکھ' ملنسار' خوش گفتار اور خوش لباس لڑکی تھی ہر وقت کسی نہ کسی کی دلجوئی کرنا لوگوں کی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچنا' دوسروں کی باتوں اور مسائل کو چہرے پر بھرپور مسکان سجا کر سننا اور سمجھنا' ماہین کی ہر وقت یہ ہی کوشش رہتی تھی کہ اُس کی بات سے کسی کی بھی دل آزاری نہ ہو جائے' کوئی اُس سے ناراض نہ ہو جائے' ہر وقت اپنے کام میں مگن' گھر کو سجانا' چمکانا' اچھے سے اچھے کھانے پکا کر گھر والوں کو کھلانا اُن کی ہر چھوٹی چھوٹی سی بات اور خوشی کا خیال رکھنا اُس کی زندگی کا مقصد رہا۔

ماہین پورے گھر میں اپنے پاپا بہروز احمد سے بہت زیادہ قریب تھی۔ اُن کا خیال رکھنا' اُن کے کپڑے استری کر کے رکھنا' جوتے موزے' ٹائی ضرورت کی ہر چیز کو سلیقے اور قرینے سے رکھنا اُن کی پسندیدہ ڈشز بنا بنا کر اُن کو کھلانا......

بہروز صاحب بہت اچھی اور نہایت اہم سرکاری پوسٹ پر موجود تھے۔ مگر انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش حلال کے لقمے سے ہی کی تھی۔ کبھی حرام کا نوالہ منہ میں جانے نہیں دیا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ اُن کی اولاد نیک سیرت اور اخلاقی تربیت سے آراستہ تھی۔ جبکہ ماہین کی خوبیوں کی تو بات ہی الگ تھی۔

گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ماہین نے ٹریننگ کے ساتھ دور حاضر کے مطابق کچھ ڈپلومے بھی کیے اور پھر اُسے پاپا سے جاب کی اجازت بھی مل گئی اور وہ ایک اسکول میں جاب کرنے لگی۔ وہاں بھی وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے ساتھ موجود اسٹاف کا ہر دم خیال رکھتی' بچوں

کا تو حد سے زیادہ خیال رکھتی' اُن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی کرتی تھی۔ ماہین کے والدین تو اپنی بیٹی پر جان چھڑکتے تھے۔ صبح جلدی اٹھنا' نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہوکر اسکول کی تیاری کرنا' وہاں مصروف رہنا وہاں سے آکر اپنی ماں کا امور خانہ داری میں ہاتھ بٹانا اور بہن بھائیوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا۔ ماہین کے والدین اپنی بیٹی پر رشک کرتے تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کاتب تقدیر نے اُنکی بیٹی کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ اور اُس کو مستقبل میں کس آزمائش اور تکلیف سے گزرنا ہے۔ وہ تو بس اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے' اسی دوران ماہین کا ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا تھا۔

شاہ میر دیکھا بھالا اچھا خوبصورت پڑھا لکھا نوجوان تھا' خاندان کا ہی لڑکا تھا' اس لیے زیادہ چھان بین کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی' ویسے بھی ماہین کے پاپا بہروز صاحب زیادہ چھاننے کے قائل نہیں تھے' اُن کا کہنا تھا کہ جتنا چھانیں گے اتنے ہی کنکر آئیں گے' اس لیے رشتہ منظور کرلیا گیا تھا۔ ویسے انہوں نے بیٹی سے اِس رشتے کے بارے میں رائے ضرور لی تھی' تو اُس نے باپ کے سامنے سعادت مندی سے سر یہ کہہ کر جھکا دیا۔

''ابو جی آپ نے میرے لیے جو بھی کیا اور سوچا ہے ہمیشہ اچھا ہی کیا ہے' اب بھی آپ نے اچھا ہی سوچا ہوگا۔''

شاہ میر اچھا پڑھا لکھا لڑکا تھا وہ بہترین جاب کر رہا تھا۔ قریب کی رشتے داری بھی تھی' مگر کسی کو یہ کب معلوم ہوتا ہے کہ جب نصیب اور تقدیر پلٹا کھاتے ہیں تو پھر قریب والے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر جلد ہی ماہین کی شادی شاہ میر سے ہوگئی تھی۔ شادی کے بعد ماہین اور شاہ میر کافی دنوں تک تو دعوتیں ہی اڑاتے رہے تھے' اس دوران میں' وہ دونوں جب بھی نظر آتے مسکراتے ہوئے نظر آتے' مگر نہ جانے کیوں شاہ میر کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ مجھے مصنوعی لگتی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتا' کہیں کھوسا جاتا' دوسری طرف ماہین کو دیکھ کر بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے' کوئی ایسی بات ہے جس کو وہ چھپا رہی ہے۔

لوگ خوبصورت چہروں کو دیکھ کر اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خوبصورت چہرہ ہے تو دل بھی خوبصورت ہوگا مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خوبصورت چہروں کے پیچھے کوئی خوبصورت لوگوں کی تکالیف دور کرنے والا دل چھپا ہوا ہو' مگر یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا' شاہ میر جتنا خوبصورت تھا' اُس کا دل اُس سے بالکل الٹ تھا جبکہ ماہین اپنی خوبصورتی کے ساتھ ایک دردمند اور احساس کرنے والا دل بھی رکھتی تھی' اس کے اندر کی خوبصورتی اُس کے چہرے اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ کسی کا دل دکھانا اُس کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا' مگر ماہین کو کیا معلوم تھا کہ اُس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے اُس کے پاپا بہروز صاحب کو بھی کیا پتہ تھا کہ وہ اپنی ہر دل عزیز بیٹی کے لیے جس خوبصورت پڑھے لکھے برسر روزگار خاندانی لڑکے کا انتخاب کر رہے ہیں وہ اُن کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کرے گا' اُن کو کیا معلوم تھا اُن کی اتنی پیاری بیٹی کو کسی کے دل کو ٹھیس پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی' اُس کے اپنے ہی دل کو بہت بڑی ٹھیس لگنے والی ہے۔

شادی کے دو ماہ کے بعد میری ماہین سے ملاقات ہوئی تو مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ بجھی بجھی

سی نظر آئی ایسا لگا کہ جیسے وہ مجھ سے ہی کیا سب سے کچھ چھپا رہی ہے ماہین بہت گہری لڑکی تھی اپنے دکھ کبھی بھی کسی پر عیاں نہیں کرتی تھی' ہاں یہ دیگر بات تھی کہ کبھی کبھی اُس کا چہرہ اِس کی بات کی نفی کر دے تو سامنے والا کچھ جانے' مگر وہ خود سے کبھی نہیں بتاتی تھی' اور اب بھی وہ یہی کر رہی تھی' مگر اُس کا چہرہ اِس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اُس کی پھیکی پھیکی مسکراہٹ اور غم اور تکلیف کو ظاہر کرتی اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر موجود کرب اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اُس سے بہت محبت کے ساتھ کہا تھا۔

''ماہین میں اور تم بچپن کے دوست ہیں' تم مجھ سے اور میں تم سے اپنی دکھ تکلیف خوشی سب شیئر کرتے چلے آئے ہیں تو اب ایسا کیا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو' اور اندر ہی اندر گھٹ رہی ہو' تم نے حالت کیا بنا رکھی ہے' میری دوست' میری جان اب بتا بھی دو کہ آخر تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''میری اور شاہ میر کی علیحدگی ہوگئی ہے' مصباح۔'' ماہین نے میرے سامنے جیسے ایک دھماکہ کر دیا تھا۔ مجھے اُس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی تمہاری شادی کو دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔''

''جو حقیقت ہے وہ ہی تمہیں بتائی ہے۔'' ماہین نے بھیگی بھیگی سی آواز میں کہا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے کانوں کی سماعت ختم ہو چکی ہے' میری پیاری سی خوبصورت اور ہر کسی کا دل موہ لینے والی میری دوست جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے دلہن بنایا تھا' وہ دو ماہ کے بعد بتا رہی تھی کہ شادی ختم ہوگئی ہے۔

''ماہین ایسا کس طرح سے ہوگیا' تم تو اِس رشتے سے بہت خوش تھیں؟''

''مصباح! وہ سب آنکھوں کا دھوکہ تھا میں خوش نہیں تھی بلکہ لوگوں کو خود کو خوش دکھانے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ جس نئی نویلی دلہن کا دل شادی کی پہلی رات ہی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے وہ بھلا کیا خوش ہوگی' بس میرے نصیب میں یہ سب لکھا تھا میرا مقدر یہی تھا مگر مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں' اللہ پاک جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے شاید یہ میری آزمائش ہو شاہ میر بحیثیت کزن تو میرا تھا مگر وہ شوہر نہ بن سکا۔ اُس نے یہ بات ہماری سہاگ رات کو بتا دی تھی کہ ماہین میری اور تمہاری شادی میرے گھر والوں اور خاندان والوں کی مرضی سے ہوئی ہے' میں تمہیں وہ محبت اور مقام نہ دے سکوں گا جس کی ایک بیوی کو اپنے شوہر سے توقع ہوتی ہے' کیونکہ میرے دل و دماغ پر کشف کا قبضہ ہے۔ وہ میری روح میں بس چکی ہے میرے خوابوں اور خیالوں میں بس ایک ہی نام ہے اور وہ ہے کشف کا نام' کشف میری کلاس فیلو ہے' ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور دل و جان سے چاہتے ہیں ہمیں ملنا ہے اور ایک ہونا ہے بس۔''

''میں ایک رات کی دلہن خاموش سناٹے میں بیٹھی تھی اور اپنے شوہر نامدار سے اُن کی محبت کے افسانے سن رہی تھی' میرا دل اندر سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا تھا میں جو اپنے دل میں سینکڑوں ارمان اور آنکھوں میں ہزاروں خواب سجا کر اپنے باپ کے گھر سے اِن نصیحتوں کے ساتھ سسرال آئی تھی کہ مجھے ایک اچھی بہو اور شوہر پرست بیوی بننا ہے اور کسی کو بھی تکلیف یا

دل کوٹھیس نہیں پہنچائی ہے' مصباح میں نے بھی یہ ہی سوچا تھا کہ میں ایک وفا پرست' شوہر پرست بیوی بنوں گی۔ میں نے جو عزت اور مقام اپنے گھر میں بنایا ہے' وہ سسرال میں برقرار رکھوں گی مگر میرے سارے ارمان شاہ میر نے بڑی بے دردی سے کچل دیے مجھے اپنی آنکھوں میں موجود سینکڑوں خوابوں کی اتنی بھیانک تعبیر ملے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

ماہین کی آنکھیں اُس وقت ساون بھادوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

''مصباح! میں نے علیحدگی سے پہلے بہت کوشش کی کہ اُس کو اپنی فطرت اور عادت سے بدل لوں اُس کے دل میں کسی اور کی محبت کا جلتا دیا بجھا کر اپنے خلوص اور محبت کی شمع روشن کروں 'میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے باپ' میرے گھر والوں کو یہ بات پتہ چلے اور وہ دکھ اور تکلیف میں مبتلا ہوں' میں اُن کو اپنے سامنے اِس فیصلے پر شرمندہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لیے مرجھائے ہوئے دل اور بجھے ہوئے چہرے کو روشن رکھنے کی بھرپور کوشش کی' میں نے ہر ممکن شاہ میر کا ساتھ نبھانا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا' میں نے اس کو بہت سمجھایا کہ جو ہونا تھا ہو گیا' اب میں اللہ کی طرف سے آپ کے مقدر میں ہوں' آپ سب بھول کر میرے ساتھ اپنی زندگی ہنستے مسکراتے ہوئے گزاریں' مگر اُس کی زبان پر تو بس کشف کا کلمہ ہوتا تھا' میں اپنے اللہ سے شکوہ کرتی کہ تو نے میرا نصیب میرا مقدر کیسا لکھ دیا' مگر پھر توبہ کرتی کہ نہیں وہ ہمارا رب ہے ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے' وہ ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے وہ ہمیں کیسے مشکلات میں ڈال سکتا ہے' اُس کی طرف سے یہ میری آزمائش ہی ہوگی' اور پھر ایک دن جب میری برداشت نے جواب دے دیا تو میں نے اُس سے کہا تھا۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں اگر آپ کو کسی اور کے ساتھ لائف گزارنی تھی تو یہ شادی کیوں کی' اور اب بھی گزارنا چاہتے ہیں تو اپنے اور میرے گھر والوں کے سامنے سب کچھ کلیئر کریں' مگر یہ سب تماشہ بند کریں۔''

اُس نے میری بات کا بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔

''تم خود بتادو اپنے اور میرے گھر والوں کو۔'' اُس کے بعد شاہ میر نے مجھے چار روز کے لیے میرے پاپا کے گھر بھیجا مگر پھر پلٹ کر خبر نہ لی تو میں نے ایک ایک بات اپنے گھر والوں کو بتادی کہ میں اب تک کس اذیت سے گزری ہوں۔

پاپا اور امی کا صدمے سے برا حال تھا اُن کو کیا پتہ تھا کہ وہ اپنی لاڈلی چہیتی بیٹی کو کس جہنم میں بھیج چکے ہیں۔

''بس اب یہ وہاں نہیں جائے گی' بلاؤ شاہ میر اور اُس کے گھر والوں کو جلد از جلد بلاؤ میں اس مسئلے کا فیصلہ چاہتا ہوں۔'' پاپا کی آواز میں دکھ صاف محسوس ہو رہا تھا۔

شاہ میر کے گھر والے آئے وہ خود نہ آیا اُس کے ماں باپ نے کہا۔

''ہم اپنے بیٹے کے آگے مجبور ہیں۔''

''تو پھر آپ نے ہم سے اور ہماری بیٹی سے کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے؟'' پاپا کے غصے سے بھرے اس سوال کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور اس کے بعد میرے طلاق کے کاغذات آ گئے اس طرح یہ دو ماہ کی مختصر شادی اپنے انجام کو پہنچی۔

میرے آنسو خشک ہو چکے تھے' میں خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی قسمت سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ مصباح یار بس میں تو اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے جس حال میں رکھے طلاق کے بعد جو ٹائم میں نے گزارا ہے وہ بہت مشکل اور کٹھن تھا' اُس وقت صرف ماں باپ نے ہی میرا ساتھ دیا اور کسی نے نہیں لوگوں کی طرف سے بہت باتیں بنائی گئیں' کیونکہ یہ معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں' قصور وار صرف اور صرف عورت کو ہی ٹھہراتا ہے۔ میں بہت ڈسٹرب ہو چکی تھی' لیکن میرے پاپا نے مجھے بہت ہمت دی' اور بہت سمجھایا' دوبارہ زمانے کے ساتھ چلنا سکھایا' انہوں نے کہا۔

''بیٹا! دوبارہ ایڈمیشن لو اپنی تعلیم کو آگے جاری رکھو۔'' پھر پاپا کے ہمت دلانے پر میں نے داخلہ لیا' اپنا گریجویشن مکمل کیا' ٹیچرز ٹریننگ کیں اُس کے ساتھ ساتھ میڈیکل فیلڈ کا تین سالہ ڈپلومہ کیا' پاپا کے حوصلہ دینے اور کہنے پر سب کی مخالفت کے باوجود جاب اسٹارٹ کی۔ پاپا نے مجھے ہر قدم پر حوصلہ اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھایا' پاپا جو کہتے گئے میں کرتی گئی بڑے بھائی وکیل' دوسرے انجینئر' تیسرے بھائی کو پاپا ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر اُن کی فیلڈ دوسری ہو گئی تو میری طرف توجہ ہوئی کہ میں ڈاکٹری والے شعبے میں کچھ بنوں۔ پاپا کا یہ خواب کسی حد تک اس وقت پورا ہوا جب میں ڈپلومہ کر کے ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنے لگی۔ مریضوں کو دیکھنا وزٹ کرنا' تین سال تک یہ کام کیا' میں ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھی' اطاعت گزار بندی بن کر رہنا چاہتی تھی' میرا رب میرے ساتھ ہر معاملے میں اچھا کرتا ہے' جو میرے حق میں بہتر ہوگا وہ کرے گا' میرا رب بڑا کرم ڈالا ہے۔'' ماہین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور میں اپنی جان سے عزیز دوست کی تمام کہانی سن کر خوش بھی تھی اور رنجیدہ بھی۔

اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد میرا رشتہ آ گیا اور میری شادی ہو گئی میں اپنے سسرال آ گئی تھی اور اب دو سال بعد' میری اور ماہین کی ملاقات ہوئی تھی' میں نے سنا تھا کہ اُس کی دوسری شادی ہو گئی ہے اور آج اُس کو اس طرح خوش و خرم دیکھا تو دل سے ہزاروں دعائیں نکلیں۔

ماہین کی دوسری شادی کا احوال مجھے اُس سے اگلی ملاقات میں معلوم ہوا تھا۔ وہ آپ ماہین کی زبانی ہی سنیں۔

''مصباح! زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر رواں تھی۔ میں نے صبر اور شکر کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اپنا ماضی شادی وغیرہ کو یاد کر کے اچانک اداس ہو جاتی تو پاپا کہتے تھے۔

''بیٹا! ہنسا بولا کرو زندگی اسی کا نام ہے' دکھ' تکلیف' خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں' ہو سکتا ہے اللہ پاک نے آنے والے وقت میں تمہارے نصیب میں بہت سی خوشیاں لکھی ہوں' بیٹا! ہر اندھیری رات کے بعد روشن صبح ضرور ہوتی ہے اور پھر اسی دوران کسی کے توسط سے میرے لیے فائز کا رشتہ آیا۔ فائز اچھے پڑھے لکھے اور جاذب نظر تھے۔ اُن کا اسٹیٹ پراپرٹی کا اپنا بزنس تھا۔ جو کہ وہ بہت اچھے طریقے سے چلا رہے تھے' بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور بھائی بھی شادی شدہ تھے' اچھا پڑھا لکھا مہذب خاندان تھا' پاپا امی بھائی سب نے سر جوڑ لیے' فائز کے رشتے کے حوالے سے تمام باتیں اچھی تھیں مگر ساتھ میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اُن کی بھی پہلی شادی ناکام

ہو چکی تھی' مگر اس بات کو نوٹس میں لائے بغیر پاپا امی نے اللہ پر بھروسہ کر کے اپنی رضامندی ظاہر کردی کہ ہماری بیٹی کے نصیب میں جو ہوگا وہ ملے گا اور پھر میں دوبارہ دلہن بن کر اپنے پاپا کے گھر سے رخصت ہوئی' اب کی بار میرا سسرال فائز زندگی کے لیے میرے ساتھ کی دعائیں اور ہزاروں نصیحتیں

یدہ اور کم بولنے والے انسان رکھنے والے اور محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھ سے میری پچھلی زندگی پر بات نہیں کی' بس اتنا کہا۔

''ماہین ہم دونوں اپنا اپنا ماضی بھول کر اپنے حال پر توجہ دیتے ہوئے اپنے مستقبل کو اچھا اور خوشگوار بنائیں گے' بس تم مجھے کبھی شکایت کا موقع نہ دینا' میں بھی تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا' مجھے اپنے ماں باپ سے بہت محبت ہے' اُن کی ذات پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا' اُن کا خیال رکھنا اور اُن کو شکایت کا موقع نہ دینا۔''

میں نے فائز کی یہ باتیں اپنے دماغ میں بٹھالیں' اور میں ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ فائز کو یا اُن کے امی ابو کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہ دوں' میں اپنی عادت کے مطابق ہر کسی کا خیال رکھتی ہوں اور اپنے فرائض اور ذمہ داریاں خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں' یہی وجہ ہے کہ ساس سسر میری نندیں دیور سب میرے گرویدہ ہیں اور میری تعریفیں کرتے ہیں میرے اس عمل سے فائز تو بہت زیادہ خوش ہیں اگر کبھی کسی بات پر اُن کو غصہ آ بھی جاتا ہے تو میں تحمل اور پیار کے ساتھ اُن کو سمجھا کر اُن کے غصے کو ٹھنڈا کر دیتی ہوں ہم اکثر کہیں گھومنے چلے جاتے ہیں' بس یوں سمجھو کہ فائز نے میرے اور میں نے فائز کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے' ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے حد خوش ہیں' میں اللہ پاک سے ہر پل دعا گو اپنی ہوں کہ میں اسی طرح فائز کی سنگت میں زندگی گزارتی رہوں۔ بس اب اللہ پاک کی طرف سے انتظار ہے کہ وہ جلد از جلد ہم دونوں کو اولاد کی خوشی عطا کر دے تاکہ ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط تر ہو جائے آمین۔

مصباح! تم یقین کرو دوسروں کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام رکھنے کی وجہ سے مجھے فائز کے ابو کی شکل میں پاپا نظر آتے ہیں' فائز کی امی مجھے بالکل اپنی بیٹی سمجھ کر ہر بات سمجھاتی اور بتاتی ہیں' جو زخم میرے دل پر لگے ہیں وہ فائز کی محبت سے آہستہ آہستہ بھرتے جارہے ہیں' فائز کی باتیں اور احساس کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ شاید اللہ پاک کو میرا کوئی عمل پسند آیا ہے جو مجھے اس طرح دوبارہ سے خوشیاں عطا کر دیں۔ تعلیم یافتہ ہونے سے لازم نہیں کہ کردار اور سوچ بھی بلند اور اچھی ہو یا کم تعلیم ہونے سے ضروری نہیں کہ کردار اور سوچ بھی سطحی ہو' یہ سب تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

بس اللہ پاک مجھے ہر آزمائش میں پورا اترنے کی ہمت اور طاقت عطا کرے آمین۔

قارئین! میں نے ماہین کی کہانی سن کر اُس کے لیے دل سے دعا کی تھی کہ اب اُس کی زندگی میں کوئی دکھ تکلیف اور غم نہ آئے اللہ پاک وہ ہمیشہ ایسے ہی خوش رہے آمین۔ آپ لوگ بھی میری دوست کے لیے دعا کریں' کریں گے ناں!......

☆☆......☆☆

چاند گرہن

ساجد علی ساجد کی فکر

> محبت اور کیا چاہتی ہے
> لو تو دی متاع زندگی تک

فاطمہ عبدالخالق

یہ 1974ء کی بات ہے جب میں چار سال کی تھی اور ہمارے گاؤں میں رضیہ سردار کے حسن کے چرچے تھے۔ ایک تو وہ بہت ہی حسین تھی، دوسرا ایک سردار کی بیٹی بھی تھی۔ اور سردار بھی وہ



جو اپنی نیک سیرت اور نیک دلی کی بنا پر آس پاس کے گاؤں والوں میں بھی معتبر اور مشہور تھا۔ لیکن اِن تمام تر خوبیوں کے باوجود رضیہ کا رشتہ طے نہیں ہو رہا تھا کیونکہ رضیہ کی زبان توتلی تھی۔ لفظ اُس سے مکمل طور پر ادا نہ ہوتے تھے وہ اٹک اٹک کر گفتگو مکمل کرتی تھی۔

سردارنی کو ہمیشہ رضیہ کی فکر گھیرے رہتی، وہ اندر ہی اندر بے تحاشا پریشان ہوتیں، جبکہ سردار جی حقہ گڑگڑاتے ہوئے سردارنی جی کو تسلی دیا کرتے تھے۔

''بھلیے لوکے، اللہ پر بھروسہ رکھ، جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اللہ نے ہماری رضیہ کا بھی کہیں نہ کہیں کسی سے جوڑ بنایا ہوگا جب اُس کو منظور ہوا اُس کی شادی بھی ہو جائے گی۔''

''سردار جی! پورے اٹھارہ سال کی ہوگئی ہے ہماری بیٹی، اس کی دونوں سہیلیاں بھی بیاہ کر اپنے گھروں میں چلی گئی ہیں۔

گاؤں کی باقی لڑکیاں بھی جو اس کی ہم عمر ہیں اُن کی بھی شادی ہوگئی ہے، ایک ہماری رضیہ ہی ابھی تک کنواری بیٹھی ہوئی ہے۔''

''تو صبر کیا کر، اللہ سب کی سنتا ہے، وہ ہماری مراد بھی سن لے گا، بس اُس کے در سے کبھی نا امید مت ہوئیو اور نہ ہی اس سے کبھی مانگنا چھوڑیو۔''

سردار جی کی باتیں سردارنی کے دل کو لگتیں اور وہ ایک بار پھر زور و شور سے اللہ سے دعائیں کرنے لگ جاتیں۔

''یا اللہ! تُو تو سب جانتا ہے، میرے دل کا حال تجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ میں تجھ سے اپنی بچی کے لیے نیک سیرت خاندان کا سوال کرتی ہوں۔ تُو تو بن مانگے بھی عطا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھ سے سوال کرنا پسند کرتی ہوں۔

تُو، تو جانتا ہے کہ سب لوگ رضیہ کا حسن دیکھ کر سوالی بن کر آتے ہیں، مگر اُس کا توتلا پن سن کر خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں، کوئی بھی میری بچی کا نیک دل نہیں دیکھتا اور یہ سب ہمارے اختیار میں کہاں کہ ہم اس کی زبان کو ٹھیک کر سکیں، لیکن میرے مالک تُو تو ہر چیز پر قادر ہے، تو ہی میرا آخری سہارا ہے، تو ہی میری پہلی اور آخری امید ہے تو بھیج دے نا میری رضیہ کے لیے اچھا جوڑ، بے شک تو کارساز ہے۔''

بیٹی کے لیے دعا کرتے ہوئے سردارنی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔

اور پھر ایک روز سردارنی کی دعا قبول ہوگی اور جمال الدین کا رشتہ رضیہ کے لیے آ گیا۔ رضیہ کی بات پکی ہونے پر سردارنی نے پورے گاؤں کی دعوت کی، دو بکرے منگوا کر صدقے کے لیے دیے اور رب کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرتے ہوئے رو دیں۔

''اب رونے کا نہیں خوش ہونے کا موقع ہے۔'' سردار جی ہنستے ہوئے بولے تھے۔

'' سردار جی یہ تو خوشی کے آنسو ہیں'' سردارنی بھی مسکرا دیں تھیں۔

''دیکھ لے اللہ لوک میں نے تجھے کہا تھا نا کہ اوپر والے سے بس مانگا کر، یہ باتیں اور شکوے شکایات ہم انسانوں کو زیب نہیں دیتے' اِن کا حاصل وصول کچھ نہیں ہے۔

البتہ اُس کے در سے مانگی جانے والی دعائیں ضرور رنگ لاتی ہیں' اور بات تو یقین کی ہوتی ہے' آپ جس قدر سچے دل سے دعا مانگتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو اتنی ہی جلدی اور اسی قدر زیادہ نوازتا ہے۔''

"آپ ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتے ہیں' سردار جی......" سردارنی مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

☆......☆......☆

بالآخر سردار اور سردارنی کی زندگی میں وہ دن آ ہی گیا' جب رضیہ دلہن بنی' دلہن بن کر رضیہ کا حسن مزید دو آتشہ ہو گیا تھا۔

نکاح کے بعد جب رضیہ کو جمال الدین کے پہلو میں بٹھایا گیا تو جمال الدین تو پہلی نظر کا اسیر ہو گیا' اُس پر بھی رضیہ کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولا تھا اور یوں رضیہ سردار ہنسی خوشی بیاہ کر جمال الدین کے گھر آ گئی تھی۔

سردار اور سردارنی ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اُن کی بیٹی اپنے گھر بہت خوش ہے اور جمال الدین محبت اور خلوص سے گندھا شخص ہے جو ان کی بیٹی کا ہر ممکنہ طور پر خیال رکھتا ہے۔ لیکن اگر دنیا میں زندگیاں صرف محبت کے سہارے گزاری جا سکتیں تو دنیا میں باقی چیزوں کی انسان کو کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں تو جمال الدین کے سر پر رضیہ کے حسن کی پٹی بندھی ہوئی تھی' لیکن آہستہ آہستہ یہ پٹی اترنے لگی اور رضیہ کے حسن پر اُس کی زبان کا توتلا پن غالب آنے لگا' جمال الدین اور رضیہ جہاں کہیں بھی جاتے لوگ رضیہ کی باتوں پر ہنسنے لگتے اور کچھ لوگ تو باقاعدہ اظہار افسوس کرنے لگتے۔

"ہائے اللہ نے کتنا حسن دیا مگر توتلی زبان اس سارے حسن کو گہنا دیتی ہے۔"

یوں تو لوگوں کا کام باتیں بنانا ہی ہوتا ہے' وہ تو ہر حال میں کوئی نہ کوئی نقص ڈھونڈ ہی لیتے ہیں' اس دنیا میں ہر کوئی دوسرے کی جانب انگلی اٹھاتے یہ بات بھول جاتا ہے کہ باقی کی چار انگلیاں اُسی کی طرف اٹھتی ہیں' لیکن اگر کوئی یہ بات سوچے گا تو وہ کسی کی طرف انگلی ہی کیونکر اٹھائے گا؟

مگر ایک بات تو کھری ہے کہ ایسے حالات میں جب لوگ آپ کی جانب انگلی اٹھاتے ہیں تب آپ کو اُن کی انگلی یہ ضرور سکھا جاتی ہے کہ کون آپ سے مخلص ہے اور کس کی چاہت صرف دنیا دکھاوے کی ہے؟

رضیہ پر اٹھتی انگلیاں جمال الدین کو اپنی ہتک کا احساس دلانے لگتیں' اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ لوگ اُس کی ہتک کرتے ہیں' لیکن اگر جمال الدین صرف ایک بات سوچ لیتا کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں بندوں کی دخل اندازیاں نہیں چلتیں' تو وہ کبھی بھی انتہائی قدم نہ اٹھاتا۔

کبھی بھی رضیہ سردار کو طلاق نامہ نہ تھماتا مگر جمال الدین کی محبت بھی چڑھتے ہوئے سورج کی طرح تھی' جونہی سوا نیزے پر آیا جسم جلنے لگا تھا اور یوں پورے دو سال بعد رضیہ سردار اجڑ کر سردار جی کی دہلیز پر واپس آ گئی۔ گاؤں میں جس کسی نے رضیہ سردار کی طلاق کے بارے میں سنا اُس نے جمال الدین کے وہ لتے لیے کہ کیا لکھوں' ویسے گاؤں والوں میں سے کوئی بھی تو رضیہ سردار کو اپنانے والا نہیں تھا۔ مگر جمال الدین پر پھٹکار برسانے کے لیے سبھی اپنا حق سمجھتے ہوئے آن پہنچے تھے۔

سردارنی سے رضیہ کا غم برداشت نہ ہو پایا اور وہ اسی رات خالق حقیقی سے جا ملیں' سردار جی نے دونوں صدمے بیٹی کی طلاق اور بیوی کی موت' بہت ہمت سے سہے تھے غم کا پہاڑ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صبر کرنے والوں کے صبر کے سامنے

ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

رضیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ اس سے پہلے کہ اُس کے اندر کا لاوا پھٹ کر باہر آتا' سردار جی نے رضیہ کو اپنے گلے سے لگا کر کہا تھا۔

"رضیہ پتر! جہاں تیری ماں گئی ہے وہ تو ہم سب کا ابدی ٹھکانا ہے' پھر رونے اور واویلا کرنے سے کیا ہوگا' کچھ بھی تو نہیں ہوگا اور تو جانتی ہے نا کہ اللہ واویلا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے' پتر صبر کر۔"

سردار جی رضیہ کا سر تھپتھپاتے ہوئے گھر سے باہر نکل کر مردوں کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔

دکھ کے دن جتنے بھی بھاری کیوں نہ ہوں' صبر کرنے سے کٹ ہی جاتے ہیں' رضیہ سردار نے بھی صبر کا دامن تھام لیا تھا کیونکہ وہ بھی صابر سردار کی ایک صابر بیٹی تھی۔

زندگی اب پھر سے پرانے ڈھب پر گزر رہی تھی' کمی تھی تو صرف سردارنی کی' باقی سب بالکل پہلے جیسا ہی تھا۔

لیکن زندگی ہمیشہ ایک ہی ڈھب پر نہیں گزرتی' اس میں تبدیلی بہت ضروری ہے' کبھی تو اس کائنات کے اتنے رنگ ہیں' فضائیں بھی رنگ بدلتی ہیں اور یونہی ایک دن رضیہ کی زندگی میں ایک بار پھر بدلاؤ آیا تھا۔

رضیہ کے لیے ایک اور رشتہ آیا تھا' مگر رضیہ رشتے سے انکاری تھی' اُس کے لیے پہلا تجربہ ہی بہت تلخ تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس تجربے کو پھر دہرایا جائے۔ لیکن سردار جی ایسے انسان تھے جو رضیہ کو قائل کر سکتے تھے' کیونکہ وہ اس ہنر سے بخوبی واقف تھے۔

"دیکھ رضیہ پتر' اللہ کی رضا میں راضی رہنا ہی روح کا سکون ہے' کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا تھا کہ اللہ کسی بھی جان پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ' تکلیف نہیں ڈالتا؟ گھر آئے رشتے سے انکار کرنا بھی اللہ کی ناشکری ہے' ناشکری مت کر پتر' اللہ سوہنا سب چنگیاں کرے گا۔ اُس پر بھروسہ رکھ۔"

اور یوں رضیہ مان گئی اور ایک بار پھر دلہن بنا دی گئی لیکن اس بار رضیہ کا حسن سوگوار تھا' سردار جی کو سردارنی کی کمی اس موقع پر بے تحاشہ محسوس ہوئی' لیکن انہوں نے یہ بات رضیہ پر ظاہر نہیں ہونے دی اور یوں رضیہ سردار' رضیہ رؤف بن کر رؤف حسن کے گھر آ گئی تھی۔

رضیہ کی زندگی اب بہت اچھی گزرنے لگی تھی' کیونکہ رؤف حسن بہت اچھے انسان تھے' اور ان کے گھر والے بھی اچھے لوگ تھے' سردار جی رضیہ کو شاد اور آباد دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتے تھے وہ کبھی کبھار آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے اور کہتے۔

"دیکھ لے سردارنی' اللہ نے ہماری رضیہ کو کتنا اچھا جوڑ عطا کیا' تیرا دل بھی کتنا چھوٹا تھا غم برداشت ہی نہ کر پایا' کتنی جلدی تھی نا تجھے اللہ سوہنے کے پاس جانے کی' کاش تو دیکھ سکتی کہ تیری رضیہ اپنے گھر میں کتنی خوش ہے۔"

رضیہ کی زندگی یونہی ہنستے مسکراتے گزر رہی تھی جب رؤف حسن کے گھر والوں کو رضیہ کی سونی گود کھٹکنے لگی' وہ بجائے اللہ سے مانگنے کے رضیہ کو مورد الزام ٹھہرانے لگے اور پھر دن بدن گھر کا ماحول خراب ہونے لگا تھا۔

رؤف حسن نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گھر والوں کو سمجھا سکیں کہ اس معاملے میں رضیہ کی کیا غلطی' یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے'

لیکن رؤف حسن کے گھر والوں نے اُن کی ایک نہ سنی‘ اُن کی ایک ہی رٹ تھی رضیہ کو طلاق نامہ تھماؤ اور نئی شادی کی تیاری پکڑو‘ رؤف حسن از حد پریشان تھے‘ وہ رضیہ کو بالکل بھی اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتے تھے‘ مگر گھر والے دن بدن چڑھتے جا رہے تھے۔

رضیہ نے جب فضاؤں کا رخ بدلتے دیکھا تو رؤف حسن کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”مجھے طلاق مت دیجیے گا‘ لیکن آپ دوسری شادی کر لیجیے‘ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

رؤف حسن بالکل بھی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تھے‘ لیکن گھر کا ماحول اِس حد تک خراب ہو گیا تھا کہ جس کی کوئی حد نہیں تھی‘ ہر وقت ایک ہی رٹ تھی‘ اس چخ چخ سے تنگ آ کر رؤف حسن بھی دوسری شادی کے لیے اِس شرط پر راضی ہوئے کہ وہ رضیہ کو خود سے ہرگز جدا نہیں کریں گے اور یوں رؤف حسن کے گھر والوں نے اجازت پاتے ہی لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔

رضیہ نے مزید صبر کا دامن تھام لیا تھا اور مزید اللہ کی عبادتوں میں مصروف ہو گئی تھی اب رضیہ نے اللہ سے مکمل طور پر لو لگا لی تھی وہ یہ جان گئی تھی کہ یہ دنیا ایک سراب کے سوا کچھ نہیں‘ کچھ بھی سدا باقی نہیں رہتا‘ نہ محبتیں نہ انسان اور نہ ہی کوئی مال و دولت‘ یہ سب فانی ہے اور اس لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھونے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور کھو جانے پر واویلا نہیں صبر کرنا چاہیے۔

رؤف حسن کے گھر والوں کی شد و مد سے کی جانے والی کوششیں بالآخر رنگ لائیں‘ انہیں مطلوبہ لڑکی مل ہی گئی اور رؤف حسن کی دوسری شادی طے کر دی گئی۔

رضیہ نے خوشی خوشی رؤف حسن کی دوسری شادی میں شرکت کی‘ لوگ سردار کی بیٹی کا صبر دیکھ دیکھ کر انگشت بدنداں تھے کہ کیا کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ جیسی رضیہ سردار تھی۔

رؤف حسن کی زندگی میں رضیہ کی اہمیت دوسری شادی کے بعد بھی وہی تھی‘ جو پہلے تھی مگر یہ سب اب رؤف حسن کی دوسری بیوی اور گھر والوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا‘ اس لیے سب موقع کی تلاش میں تھے کہ کب کوئی ایسا وار کیا جائے کہ رؤف حسن‘ رضیہ کو طلاق نامہ تھما کر چلتا کریں اور بالآخر دو سال بعد جب رؤف حسن کی دوسری بیگم کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو سب کو موقع مل گیا۔

رؤف حسن کی دوسری بیگم نے شوہر کے سامنے یہ شرط رکھ دی تھی۔

”اگر بیٹی کا منہ دیکھنا ہے تو رضیہ کو طلاق نامہ تھمایا جائے۔“

رؤف حسن بہت ہی زیادہ کشمکش کا شکار تھے۔

”یہ میری کیسی آزمائش ہے؟ ایک طرف میری معصوم بیٹی اور دوسری طرف‘ معصوم بیوی رضیہ‘ میں کس پر ظلم کروں گا؟ رضیہ نے تو کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی‘ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا پھر اِن لوگوں کو رضیہ کا وجود کیوں کھٹکتا ہے؟ آخر ایسا کیوں؟

اپنی شدید پریشانی میں رؤف حسن ہمیشہ رضیہ کے پاس ہی آتے تھے اور رضیہ بھی اپنے شریک حیات کا چہرہ دیکھتے ہی پہچان جاتی تھی کہ وہ پریشان ہیں۔

اُس روز بھی رؤف حسن آئے اور رضیہ کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

رؤف حسن صاحب کیا ماجرا ہے؟ اتنا پریشان تو میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟“

اِس سوال کے جواب میں بس ایک خاموشی تھی اور رؤف حسن کی خاموشی رضیہ کا دل دہلا رہی تھی‘ رؤف حسن نے کچھ دیر مزید خاموش رہنے کے بعد رضیہ کو سارا ماجرا سنا دیا تھا۔ رضیہ نے صبر و تحمل سے پوری بات سنی تھی اور پھر اطمینان سے بولی تھی۔

”آپ مجھے چھوڑ دیں۔“

رؤف حسن نے تڑپ کر رضیہ کی طرف دیکھا تھا۔

”میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔“

”لیکن اب آپ کو سوچنا ہے اور وہ بھی صرف اپنی بیٹی کے لیے جسے ایک باپ کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے رضیہ نے اپنے سارے آنسو حلق میں اتار لیے تھے۔

”لیکن رضیہ......“

”آپ کو اللہ کا واسطہ ہے رؤف حسن‘ آپ میرے فیصلے کا احترام کریں گے‘ میں صبح اپنا سامان لے کر چلی جاؤں گی‘ آپ طلاق نامہ بھجوا دیجیے گا۔“

”کاش یہ لوگ تمہارا دل دیکھ سکتے رضیہ‘ جس میں اتنا صبر ہے تو کبھی بھی تم سے جدائی کی بات نہ کرتے۔“ رؤف حسن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے‘ پتہ نہیں کون کہتا ہے کہ مرد روتے نہیں‘ رؤف حسن بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور رضیہ صبر کا پہاڑ بنی رؤف حسن کو حوصلہ دے رہی تھی۔

یونہی روتے ہوئے اور حوصلہ دیتے ہوئے کب رات بیتی‘ اور کب فجر کی اذان فضاء میں بلند ہوئی انہیں احساس ہی نہ ہو سکا‘ رؤف حسن اٹھ کر وضو کرنے چل دیے۔ رضیہ نے بھی وضو کیا اور یوں دونوں میاں بیوی جائے نماز بچھائے نماز ادا کرنے لگے۔

رضیہ کا آخری سجدہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا‘ جب کافی دیر تک رضیہ سجدے سے نہ اٹھی تو رؤف حسن کو انجانا سا احساس ہوا‘ انہوں نے رضیہ کو سجدے سے اٹھانا چاہا مگر رضیہ کی روح تو پرواز کر چکی تھی۔

اُسے رؤف حسن سے جدائی برداشت نہ تھی‘ تبھی خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔

رؤف حسن رضیہ کی جدائی پر دھاڑیں مار مار کر رو دیے تھے‘ رضیہ اپنے صبر کا ہی نہیں‘ باپ کی محبت کا بھی بھرم رکھنا چاہتی تھی‘ وہ سردار جی کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی‘ تبھی تو سب کو اکیلا چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئی۔

جب وہ کفن میں لپٹی پڑی تھی تو اُس کے چہرے پر اِس قدر نور اور سکون تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور میں اس چہرے کو آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہوں‘ اور نہ ہی رؤف حسن بھی رضیہ کو بھول پائے‘ اِس وقت اُن کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں‘ وہ ہر جمعہ اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ رضیہ کی قبر پر جاتے ہیں فاتحہ پڑھتے ہیں‘ اور گھر واپس لوٹ آتے ہیں۔

برسوں سے اُن کا یہی معمول ہے‘ یہ کہتے ہوئے میری چھوٹی خالہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے کیونکہ وہ بھی رضیہ سردار سے بے تحاشا محبت کرتی تھیں اور یوں میری یہ کہانی بھی اختتام کو پہنچی۔ جو کہ ایک ایسے چاند کی کہانی تھی جسے گرہن لگا ہوا تھا۔

☆☆......☆☆

آزمائش

زحمت عباس شاہ کی فکر

یاد آتا ہے مقدر جب بھی کپکپاتی ہے دعا ہاتھوں میں

ڈاکٹر الماس روحی

اُس نے خدا کا رنگ اختیار کیا تھا یہی رنگ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اب اُسے کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ دل مطمئن تھا اسے دیکھ کر لوگ بے اطمینان تھے۔ اور اس کی فکر میں گھل رہے تھے۔



لیکن وہ تھا جو بے نیاز تھا۔ اللہ کا نور اس کی محبت دل میں اترتی جا رہی تھی۔ اسے نہیں خبر تھی کہ سامنے کے لاک اپ میں جو قیدی ہے وہ اس سے کیونکر اور کس قدر خائف ہے اور وہ اسے کیا کیا سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ تو بس بیٹھ کر بچپن میں یاد کی گئی سورتیں اور کلمے دہراتا رہتا تھا۔

قید خانے کے در و دیوار کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا تھا اس در و دیوار کا تو بڑا احسان ہے مجھ پر جس خدا کو میں بھول چکا تھا وہ مجھے یہاں یاد آیا جب میں بے بس ہو گیا۔ کتنا میری ماں میرے لیے چاہتی تھی کہ میں حافظ بنوں۔ قرآن حفظ کروں مگر میں گلی میں 'گلی ڈنڈا' 'کنچے' 'پٹو گرام' 'چور سپاہی' کھیلتے ہوئے اکثر ماں کی پکار کو اَن سنا کر دیتا تھا۔ ماں ہر رات اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر میرا سر پیار سے سہلاتے ہوئے کہتی۔

''میرا بیٹا قرآن حفظ کر لے دیکھ جو قرآن حفظ کرتا ہے اس کو بڑا اجر ملتا ہے۔ ساری زندگی تو آفتوں سے محفوظ رہے گا' دل میں دنیا گھر نہیں کرے گی' رب رہے گا۔'' میں ماں کی باتیں سن کر واقعی کوشش کرتا۔ مگر پھر دل اچاٹ ہو جاتا اور کھیلنے دوڑ جاتا۔

زندگی کے بیس برس گزر گئے' بچپن سے لڑکپن' لڑکپن سے جوانی کے اس سفر نے سارے کام کروائے لیکن میں نہ پڑھ سکا تو قرآن نہ پڑھ پایا چند پارے پڑھے تھے۔ پھر جی اچاٹ ہو گیا۔

میں نے پارچہ بانی کا کام شروع کیا تھا' میں فیصل آباد جاتا تھا اور کپڑوں کی لاٹ کی لاٹ لاتا تھا۔ میرے لائے ہوئے کپڑے خواتین کو بہت پسند آتے تھے میں نے مہنگے بازار میں کپڑوں کا بوتیک کھولا میری دکان کی چمک دمک ہی الگ تھی۔ دوسرے مجھے خدا نے اچھی شکل و صورت سے بھی نوازا تھا۔ گفتگو کا طریقہ مجھے آتا تھا۔ اس لیے میرا کاروبار ترقی پر تھا چند سالوں میں میری' دو چار بڑے بازاروں میں کئی دکانیں بن چکی تھیں۔ جہاں میں نے اپنے ملازم رکھے تھے۔

میں ملازم رکھتے ہوئے شکل و صورت کے ساتھ تعلیم اور انداز بیان بھی دیکھا کرتا تھا۔ تاکہ وہ جب کپڑا فروخت کریں تو گاہک کو عزت و احترام سے مخاطب کریں۔ میری دکانوں سے کوئی گاہک خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ دیدہ زیب رنگ' ڈیزائن اور کپڑے کا معیار انہیں میری دکانوں کا رخ دکھاتا تھا۔ صبح جب میں کاروبار کے لیے نکلتا تو میری ماں مجھ پر سورتوں اور آیتوں کا حصار کرتی اور دعائیں دیتی تھی بے شک ماں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا جو اللہ نے مجھے اتنا عطا کیا تھا۔

ایک روز میں ڈیفنس کے بوتیک پر تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا کم لوگ بازار میں تھے۔ ڈیفنس کی گلیاں رات کو جاگتیں ہیں وہ سیاہ برقعے میں تھی جس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

'' سنیے پلیز ذرا یہ پرنٹ دکھا دیجیے۔'' میں نے اس کا اشارہ دیکھتے ہوئے تھان نکال دیا۔

''جی یہ......''

'' بہت خوبصورت ہے یہ پرنٹ [illegible] ڈیزائن ہے اور کھلا کھلا رنگ ہے۔'' میں [illegible] کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بڑی [illegible] ابھری ہوئی تھیں اور اس میں [illegible] چمک تھی۔ [illegible] نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے [illegible]

'' پلیز اس میں سے ایک سوٹ کاٹ دیجیے۔''

میں اُس رات نہ سویا۔ مجھے جانے کیوں وہ اتنی اچھی لگی ڈیفنس کے علاقے میں خواتین جس حلیے میں بازاروں میں نظر آتی ہیں وہ بیان سے باہر

ہے۔ دولت اور بے تحاشہ دولت کا ہونا گھر کی خواتین کو خواتین نہیں عجوبے بنا دیتا ہے۔ عمر رسیدہ خواتین پارلروں کے چکر لگا لگا کر شکل ہی بگاڑ لیتی ہیں۔ اکثر بوڑھی خواتین کو دیکھ کر مجھے تو اپنی ماں کا سفید دوپٹے کے حلقے میں لپٹا پُر نور چہرہ یاد آ جاتا تھا اور میں ایسی خواتین پر افسوس کیے بغیر نہ رہتا تھا جو بکھرے بال کھلے بازو بڑے بڑے گلے دوپٹوں سے بے نیاز چپٹی جینز اور اونچی اونچی ہیل پہنے نہ جانے خود کو کیا سمجھ کر مردوں کے آگے چلتی تھیں۔ ایسے ماحول میں میں نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا جو بہت سادہ تھی جس کی پسند بھی سادہ تھی۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوتی تھی۔

مہینے دو مہینے بعد وہ ضرور نظر آتی تھی۔ سردیاں آ چکی تھیں موسم بدلتے ہی کپڑے بھی بدل جاتے ہیں۔ اس دفعہ اس نے کھدی کے دو سوٹ خریدے تھے۔ اس کے ڈرائیور نے گاڑی میری دکان کے قریب لا کھڑی کی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بوتیک کے دوسرے پورشن میں بیلیں وغیرہ دیکھ رہی ہے۔ میں باہر گیا اور ڈرائیور سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا تو باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا وہ پچھلے پندرہ سال سے اس گھر کا ڈرائیور ہے۔ خیابانِ شمشیر میں رہائش ہے۔ اس لڑکی کا نام عائشہ ہے جو ایک مدرسے کی معلمہ ہے۔

گھر میں میری ماں کا اصرار شادی کے لیے بڑھ چکا تھا۔ جب میں نے اپنی ماں کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ زندگی میں اللہ نے مجھے اچھی ماں کی [illegible] نیک اور خوبصورت بیوی [illegible] بھی نوازا۔ [illegible] کا ماحول بالکل الگ تھا۔ مگر خدا نے دین کی [illegible] سمجھ اسے دی تھی۔ وہ بہت پارسا تھی۔ پاکیزہ اور معصوم اُسے ایک بیوی کے سارے وظائف بخوبی ادا کرنے آتے تھے۔

اُس نے میرا اور میری ماں کا بہت خیال رکھا تھا۔ وہ روز صبح سویرے اٹھتی نماز فجر پڑھتی اور قرآن کی تلاوت کرتی۔ نہ جانے کیوں بچپن ہی سے قرآن کی تلاوت اگر زور سے کوئی بھی کرتا تو میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ میں اللہ کے کلام کی تعظیم کرتا تھا۔ میں نے اپنے ملازمین کو خاص کر ہدایت کر رکھی تھی دکان کھلتے ہی صفائی ستھرائی کے دوران ٹیپ پر تلاوت قرآن پاک لگا دی جاتی تھی مگر میرے پہنچنے سے پہلے ملازموں کو یہ کام کرنا پڑتا تھا۔

عائشہ جب تلاوت کرتی تو میں سننا چاہتا تھا مگر شیطان مجھ پر غالب ہونے لگتا اور مجھے غصہ آنے لگتا۔ میں اکثر اس سے کہتا۔

”تھوڑا اور مختصر پڑھا کرو۔“

زندگی ایک مرد اور عورت کی مکمل تب ہوتی ہے جب اولاد ہو جاتی ہے شادی کو دس سال گزر چکے تھے۔ مگر میں اور عائشہ اولاد سے محروم تھے۔ وہ اکثر مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیتی تھی۔

”قاسم زندگی بہت مختصر ہے بہت انتظار کرلیا۔ آپ دوسری شادی کرلیں میں بخوشی اجازت دے رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کسی کے ساتھ حق تلفی نہیں کریں گے۔“

مگر میں اس کی ان باتوں سے چڑ جاتا تھا۔

”کیا اُسے مجھ سے محبت نہیں ہے کس قسم کی عورت ہے جو بٹوارے کی بات کرتی ہے عورتیں تو زمین آسمان ایک کر دیتی ہیں شوہر کی دوسری شادی بجلی بن کر اُن پر گرتی ہے۔ اور ایک عورت ہے بے حس جو میری محبت نہیں سمجھتی۔“

میری ماں مصلے پر بیٹھی مجھے مسکرا کر دیکھتی۔

”بیٹا وہ بے حس نہیں ہے سمجھدار ہے اس کے دل میں رب رہتا ہے اس لیے بے نیاز ہے۔ تو

بہت خوش نصیب ہے جسے عائشہ جیسی مومن بیوی ملی ہے اس کی قدر کر اور دعا کر کہ خدا تجھے اُسی سے فرمانبردار، نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے اُس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔“

ماں کو دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا دیکھ کر میں پُر امید ہو جاتا خدا مجھے ضرور اولاد دے گا یہ آخر میری ماں کی دعا ہے۔

اُس روز میں فیصل آباد میں تھا اور کپڑے لے کر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں مجھے ایک ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ دکھائی دیا میں نے گاڑی روکی وہ صاحب جو مسافر تھے پریشان تھے مجھے کہنے لگے۔ میں انہیں لفٹ دے دوں تو مہربانی ہوگی ان کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ میں نے ازراہ ہمدردی انہیں بٹھا لیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے بس اسٹاپ پر پان لینے کے لیے گاڑی رکوائی اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئے۔

میں انتظار کرتا رہا تھا کہ گھر کی طرف رخ کیا۔ میں بھول چکا تھا اس کا بریف کیس پیچھے پڑے ہیں۔ اچانک پولیس موبائل نے میری گاڑی رکوائی اور مجھے تھانے لے گئے میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ اُس بریف کیس میں ہیروئن تھی۔ میں چیخ چیخ کر کہتا رہا یہ بریف کیس میرا نہیں ہے۔ لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے بے تحاشا مارا گیا دھتکارا گیا اور لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ لمحوں میں زندگی کہاں سے کہاں آ گئی، نیکی یوں گلے پڑتی ہے زندگی تباہ ہوتی دکھائی دے رہی تھی مارے صدمے کے میں کمزور ہوتا چلا گیا اور خاموش رہنے لگا مجھے اس دنیا میں اب کچھ نظر نہیں آتا تھا سوائے دھوکے کے، ایک قیدی کی زندگی عبرت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ یہاں ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے والے درندے رہتے ہیں۔

غزل

فطرت بجا رہی تھی محبت کی بانسری
اور رقص کر رہی تھی اسی لیے یہ زندگی
کس نے خموش کر دیا چنگ و رباب کو
اور کس نے پائے زیست کی پائل بھی چھین لی
کالک ملی یہ کس نے رُخِ ماہتاب پر
کس نے بجھائی مہرِ درخشاں کی روشنی
کس نے سرِ چمن سے ہے کھینچی ردائے گل
کس نے مسل کے رکھ دی ہر ایک نوبہ نو کلی
گلشن کو کس نے ایسے اُجاڑا ہے دوستو
بادِ صبا چلی بھی تو شوریدہ سر چلی
خود باغباں نے لوٹ لیا حسنِ گلستاں
تہمت اگر گئی بھی تو گلچیں کے سر گئی
راشدؔ یوں ختم ہو گیا افسانۂ حیات
اک آرزو میں کٹ گئی یہ ساری زندگی

راشد حسین راشد (کینیڈا)

جاوید بھی ایک ایسا درندہ تھا جس نے ایک گروہ بنا رکھا تھا اس جیل میں اس کی داداگیری چلتی تھی۔ ہر کمزور کو دباتا تھا۔ میں خاموش رہتا تھا' لیکن کمزور نہیں تھا۔ ایک روز اُس نے مجھے بلاوجہ چھیڑا اور میں نے اُسے زمین پر پٹخ دیا۔ اُس دن سے لوگ میرے رفیق بن گئے۔ ہر بڑی طاقت زیر ہوسکتی ہے بس ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگ بلاوجہ اُس سے ڈرتے تھے۔ وہ باتوں کا شیر تھا۔ مجھے اکثر راتوں کو اپنی معصوم بیوی کا غمزدہ چہرہ ستاتا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر سرخ و سفید رنگ کی لکیریں آنکھ مچولی کھیلتی تھیں۔ رخسار پھولوں کی مانند سرخ اور نرم ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک لمبی سفید گردن اور نازک کندھوں پر سیاہ زلفیں ناگنوں کی طرح لہراتی تھیں۔

وہ رات کو بال میرے کہنے پر کھولتی تھی مجھے اس کے بال بہت پسند تھے۔ وہ نسائیت کے تمام جذبات و احساسات اور خصوصیات کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ جس کا حسن بے مثال' گفتگو لاجواب' اور مرمریں پیکر لاثانی تھا۔ مجھے اس کی بڑی فکر تھی اس دفعہ وہ مجھ سے ملنے آئی تو بے تحاشہ روئی وہ بہت دنوں بعد آئی تھی اس نے مجھے بتایا وہ امید سے ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور رو پڑا اس حالت میں اُسے میری کتنی ضرورت تھی۔ یہ قدرت کی کیسی ستم ظریفی ہے۔ اتنے عرصے بعد خوشخبری دی بھی کن حالات میں بے بسی سے میں نے اُسے دیکھا۔

انسان جب مجبور اور بے بس ہوتا ہے تو صرف اللہ یاد آتا ہے۔ میں نے نماز کی پابندی پہلے سے زیادہ کی اور قرآن پڑھنے کی طرف رغبت ظاہر کی مجھے حوالدار نے قرآن دے دیا۔ اب میں صبح سویرے اٹھتا اور نماز فجر پڑھ کر قرآن پڑھتا' تھانیدار صاحب نے ایک مولانا کو میرے قرآن پڑھانے پر مامور کیا۔ اکثر وہ مجھے پڑھا چکتے تو حوصلہ دیتے۔

''پروردگار عالم نے اس کارگاہ فانی میں آرام و تکلیف' رنج و غم' دوست و دشمن' بیماری و تندرستی اور طرح طرح کی صد ہا راحتوں اور مصیبتوں میں پیدا فرما کر انسانوں کو اس میں مبتلا کیا ہے اللہ نے فرمایا......''انسان کو ہم نے مشقت اور تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ نجات کے لیے احتیاطی تدبیریں مقرر فرما دی ہیں۔''

انسان اپنے مسائل حل کرسکتا ہے۔

''مولانا صاحب وہ تدابیر کیا ہیں؟'' میں نے پُرامید ہوکر انہیں دیکھا۔

''بیٹا سب سے قوی تر تدبیر یہ ہے کہ بلاؤں اور مصائب کے اتارنے والے کو پکارا جائے جسے دعا کہتے ہیں بس یقین کے ساتھ دعا کرو دعا ضرور قبول ہوگی۔''

اس روز میں نماز میں بہت رویا۔

''میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے تو دیکھ رہا ہے مجھے سزائے موت ہوسکتی ہے' میں بے گناہ ہوں میں نے وہ گناہ نہیں کیا تو مجھے بچالے اور مجھے میرے اپنوں میں پہنچا دے میری ماں میرے لیے تڑپتی ہے۔ میری بیوی کو میری ضرورت ہے اے رب کریم مجھ پر رحم فرما' مجھے اس آزمائش سے نکال لے۔ میرے گناہوں کو معاف فرما دے۔'' سجدے میں روتا ہاتھ جوڑ کر دعا مانگتے ہوئے خدا سے معافی مانگتا اور پھر قرآن کھول کر بیٹھ جاتا میں گھنٹوں پڑھتا۔ میرے دل بے قرار کو قرار آتا۔ میں نے قرآن حفظ کرلیا تو حوالدار صاحب نے تھانے میں مٹھائی تقسیم کروائی اور انہوں نے مجھ سے کہا۔

''تم ایک نیک انسان ہو خدا تم پر رحم کرے میری دعا ہے تمہیں سزائے موت نہ ملے۔'' میں رو دیا۔

''میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا ہے خدا جانتا ہے میں بے گناہ ہوں۔''

☆......☆......☆

وہ رات میری آخری رات تھی صبح صادق کے وقت میں اٹھا میں نے وضو کیا اپنی ماں بیوی اور بچے کے لیے دعا مانگی آج مجھے اپنی ماں بہت یاد آرہی تھی عائشہ نے مجھے بتایا تھا وہ بہت بیمار ہیں آپ کو یاد کرکے صبح و شام روتی ہیں۔ میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔

عائشہ نے اچھا کیا میری ماں تو مجھے اس حالت میں دیکھ کر مرجاتی۔ اس نے بیوگی کے بعد مجھے بڑی محنت و مشقت سے پالا تھا۔ سارا سارا دن میرے کاموں میں مصروف رہتی میرے لیے جس طرح طرح کے کھانے بناتی مجھے اسکول چھوڑ کر آتی مجھے نہلاتی دھلاتی' مجھے صاف ستھرا رکھتی بیماری میں میری تیمارداری کرتی' اُس کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب میری ذات کے گرد تھا۔ وہ یہ سب کیسے برداشت کرتی۔ غم سے اس کا سینہ پھٹ نہ جاتا۔

ٹھیک آٹھ بجے مجھے سپاہی لینے آگئے۔ لاک اپ میں کھڑے سب قیدی اُداس تھے۔ انہیں مجھ سے اُنس ہوگیا تھا۔ میں نے جاتے ہوئے سب سے مصافحہ کیا۔ ہر آنکھ نمدیدہ تھی۔ اور میں اُداس اور غمزدہ......کیا خدا میرا ساتھ دے گا یہ پل یہ چند لمحے جو میری سانسوں کے رہ گئے ہیں اس میں کوئی کرشمہ خدا دکھا سکتا ہے۔

تھانیدار صاحب ایک جلاد ایک ڈاکٹر اور سپاہی میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ جلاد نے ایک سیاہ رنگ کا کپڑا میرے منہ پر چڑھا دیا۔ میں نے سورۃ یسین دل میں پڑھنا شروع کی تاکہ زندگی سے موت کا سفر آسان ہوجائے۔ اب میری سوچوں میں رشتے ناطے مدھم پڑ رہے تھے۔ اب سانس اکھڑنے والی تھی جلاد نے تختہ دار پر کھڑا کیا اور رسی میرے گلے میں ڈالی۔ میں نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ پھندہ کھینچتے ہی مجھے لٹک جانا تھا اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی......مگر یہ کیا تھانیدار صاحب نے رسی کھلوادی۔ اور مجھے تختہ دار سے اُتار لیا گیا۔

''اصل مجرم پکڑا گیا ہے۔ جس نے بیان دیتے ہوئے پولیس کو بتا دیا ہے کہ اُس نے تمہیں کیسے پھنسایا تھا۔'' آنے والے پولیس اہلکار نے کہا۔ میں سجدے میں گرا بے شک میرے خدا تو ہی آڑے وقت اور مصیبت میں کام آنے والا ہے۔ تو رحیم ہے کریم ہے۔ شکر ہے میرے مولا تو نے مجھے بچالیا۔ میں بے گناہ تھا۔ میرا ساتھ دیا۔

تھانے میں اس روز جشن کا سماں تھا مٹھائیاں تقسیم ہوئیں اور مجھے تھانیدار صاحب نے رخصت کرتے ہوئے دعا دی۔

''حافظ صاحب آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ خدا نے آپ کو پھر سے زندگی دی ہے ہمیشہ خوش رہیں۔''

میں گھر پہنچا میری ماں مجھ سے لپٹ کر بہت روئی' وہ مجھے چومتی رہی اور دعائیں دیتی رہی۔ ہاں یہ میری ماں کی دعا تھی میں واپس لوٹ آیا۔ عائشہ کی گود میں میرا ننھا منا سا بیٹا کھیل رہا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو پیار کیا اور عائشہ کا شکریہ ادا کیا جس نے میری غیر موجودگی میں پردے میں رہ کر کاروبار بھی دیکھا اور گھر میں ای کا بھی خیال رکھا۔

''بیٹا اس کا نام ہم نے محمد اویس رکھا ہے۔''

''اماں یہ نام بہت اچھا ہے۔ اویس کو میں ضرور حافظ بناؤں گا پھر دنیاوی تعلیم بھی دوں گا۔'' میں نے اویس کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ میری ماں مسکرادی۔

اب میں روز گھر سے نکلنے سے پہلے ماں کو قرآن سناتا ہوں تو مجھے دعائیں دیتی ہیں کہ میں نے اُن کی حافظ بننے کی خواہش پوری کردی۔

☆☆......☆☆





مری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجمان نہیں ہے

صدف حبیب

ایمن ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی کیونکہ اگر وہ اب بھی نہ اٹھتی تو یقیناً اماں کی چپل لازمی آتا تھی، اور اس سے پہلے کہ چپل ایمن تک اتی وہ ایک دم بستر سے کود گئی۔



"کمبخت ڈائجسٹوں نے ستیاناس مار دیا ہے اور رہی سہی کسر اس نیٹ نے پوری کر دی ہے۔ منحوس ماری ہر وقت موبائل میں لگی رہتی ہے۔" اماں مستقبل بڑبڑا رہی تھیں مگر ایمن کو کہاں پرواہ تھی۔ یہ تو اماں کا روز کا معمول تھا۔

ایمن کے والد بشیر صاحب ایک نجی ادارے میں ملازمت پیشہ تھے اور ایمن اُن کی اکلوتی بیٹی تھی۔

جہاں آراء بیگم کی سلیقہ مندی سے عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ جہاں آراء بیگم کی بھی ہر ماں کی طرح یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد کوئی شریف خاندان دیکھ کر ایمن کے ہاتھ پیلے کریں، مگر بشیر صاحب ایمن کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اُسے اور پڑھانے کے خواہش مند تھے۔ ایمن پڑھائی میں کافی ہوشیار تھی اور انٹر کے نتائج نے یہ بات اور پختہ کر دی جب ایمن شاندار نمبروں سے کامیاب ہوئی۔

ایمن کو رومانوی ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق تھا اور جب موقع ملتا وہ اماں سے چھپ کے ڈائجسٹ پڑھنے بیٹھ جاتی، جہاں آرا بیگم ایک دین دار خاتون تھیں، اُن کے لیے یہ سب فالتو لغویات تھے، وہ ایمن کو بھی سمجھاتیں کہ دین کی سمجھ حاصل کرو مگر ایمن نادان تھی وہ تو انہی سوچوں میں رہتی کہ ایک دن کوئی 'شہزادہ' آئے گا اور اُس کو بیاہ کر لے جائے گا، ایمن ایک خوبصورت لڑکی تھی وہ کسی بھی لڑکے کا خواب ہو سکتی تھی اور اماں کو روز بروز یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کوئی اچھا سا رشتہ مل جائے، اُن کی دعائیں صرف ایمن تک ہی محدود ہو گئی تھیں۔

بشیر صاحب بھی اپنے والد کے اکلوتے چشم و چراغ تھے اور اُن کے والدین بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، اُن کی پرورش بھی اُن کے منہ بولے چچا نے کی اور جب بشیر صاحب کمانے کے قابل ہوئے تو اُن کی شادی اپنی بیٹی جہاں آراء بیگم سے کر دی، جہاں آراء بیگم بھی قسمت سے اکلوتی تھیں اس لیے ایمن کو نہ خالہ کا پیار مل سکا اور نہ ہی چچا، پھوپیوں کا پیار مل سکا۔

ایمن کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا بہت شوق تھا اور اُس دن بشیر صاحب کو ایمن کا ایڈمیشن کروانے اُس کے ساتھ جانا تھا، جہاں آراء بیگم صبح سے ہی بڑبڑانے میں مصروف تھیں۔

"ستیاناس کر دیا ہے لڑکی کا ارے بس انٹر بہت ہے کون سا شادی کے بعد نوکری کرے گی۔" وہ نہایت غصے کے عالم میں بڑبڑا رہی تھیں اور ایمن اور اس کے والد مسکرا رہے تھے۔

"ارے بھئی جہاں آراء بیگم صبح صبح اچھے کلمات منہ سے نکالو، بچی کو دعائیں دو، اللہ اِسے کامیاب کرے، انشاء اللہ شادی بھی ہو جائے گی ابھی کون سا ہماری بیٹی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔"

"ہاں ہاں جایئے، میری سنتا کون ہے اس گھر میں۔" اُن کا غصہ ہنوز قائم تھا۔

یونیورسٹی سے شام چار بجے کے قریب ایمن اور بشیر صاحب گھر واپس آئے، مگر شکر ہے ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ اب ایمن کی روٹین بہت ٹف ہو گئی تھی صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتی تو واپسی میں پانچ بج جاتے تھے۔

اماں پڑھ پڑھ کر پھونکتیں رہتیں اور ساتھ ہی نصیحتوں کا انبار ایمن کے لیے لگا ہوتا، یونیورسٹی میں ایمن کی یوں تو کافی دوستیاں ہو گئی تھیں، مگر افشاں اُس کی خاص دوست بن گئی تھی۔ دراصل افشاں کا گھر ایمن کے گھر کے قریب تھا اس لیے ساتھ آنا جانا بھی تھا اور دونوں میں دوستی بھی گہری

ہوگئی تھی۔

وقت کا کام ہے گزرنا وہ گزرتا چلا گیا اور یوں کس طرح ایک سال گزر گیا پتہ ہی نہ چلا' ایمن کی وہی روٹین جاری تھی اور جہاں آرہ بیگم کی فکر بھی بڑھتی جارہی تھی' دراصل وہ چاہ رہی تھیں کہ کم از کم ایمن کی پڑھائی مکمل ہونے تک کہیں بات چیت طے کردیں اور اس سلسلے میں آج کل آمنہ بوا کافی اُن کے گھر آرہی تھیں۔

اِس معاملے میں ایمن خاموش تھی' کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر اُس نے اماں سے فی الحال کوئی بحث کی تو پڑھائی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

اُس دن صبح سے ہی اماں کا دل گھبرا رہا تھا' پتہ نہیں کیوں وہ بے چین سی لگ رہی تھیں کیونکہ نہ ہی انہوں نے ایمن کو یونیورسٹی جانے کے لیے اٹھایا اور نہ ہی کمرے سے باہر آئیں ایمن کو الارم لگا کے سونے کی عادت تھی مگر اٹھتی وہ اماں کے اٹھانے سے ہی تھی' مگر جب اماں نہ آئیں تو وہ خود اٹھ کے باہر آئی دیکھا تو اماں برآمدے میں نہیں تھیں' وہ اماں کو آواز دے کر کمرے میں جانے لگی تو ابو نے روک لیا۔

''رہنے دو بیٹا تمہاری اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے' رات سے ہی کچھ بے چین ہیں' ابھی آنکھ لگی ہے تھوڑا آرام کرنے دو انہیں۔''

''خیریت ابو کیا ہوا ہے اماں کو' رات میں تو ٹھیک تھیں۔'' ایمن کو فکر لاحق ہوئی۔

''پتہ نہیں بیٹا' میں بھی فکر مند ہوں چلو تم پریشان نہ ہو ٹھیک ہوجائیں گی' ایسا کرو چائے بنالو میں بیکری سے پاپے وغیرہ لے آتا ہوں اور ایسا کرو آج چھٹی کرلو' اپنی اماں کے پاس رہو ہوسکتا ہے انہیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تم پاس ہوگی تو انہیں اچھا لگے گا۔''

بشیر صاحب کچھ سوچتے ہوئے اٹھ گئے اور بیکری چلے گئے' واپس آکر انہوں نے ناشتہ کیا اور تیار ہوکر آفس چلے گئے۔ ایمن بھی گھر کے کاموں میں لگ گئی' وقفے وقفے سے اماں کو دیکھنے جاتی پتہ نہیں کیوں آج اسے اماں کے چہرے پر سکون نہیں نظر آرہا تھا جیسے ہمیشہ ہوتا تھا پتہ نہیں وہ کس بات کو لے کر اتنی متفکر تھیں۔

شام میں بشیر صاحب جب دفتر سے واپس آئے تو اماں کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی مگر وہ بدستور خاموش تھیں۔

ایمن برآمدے میں ٹہل رہی تھی' پتہ نہیں کیا بات تھی ابو آتے ہی اماں کے پاس گئے اور کافی دیر سے دونوں پتہ نہیں کس مسئلے کو لے کر بحث کررہے تھے' ایمن نے کافی سننے کی کوشش کی مگر نہ سن سکی' مگر تھوڑی ہی دیر میں جب ابو نے آواز دے کر اُسے بلایا تو وہ ڈرتے ڈرتے اندر آئی کہ نجانے کیا کہیں گے' اماں نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا تھا۔

''کیا ہوا اماں اب طبیعت کیسی ہے' آپ اتنی چپ چپ کیوں ہیں؟'' ایمن نے اماں کی گود میں اپنا سر رکھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ اماں مسکرانے لگیں۔

''کچھ نہیں میری شہزادی میں ٹھیک ہوں اب' اچھا سنو مجھے اور تمہارے ابو کو تم سے کچھ پوچھنا ہے تم ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔'' جہاں آراء بیگم نے ایمن کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پیار سے کہا تو بشیر صاحب بھی مسکرانے لگے۔

''اماں میں نے آج تک آپ سے کچھ جھوٹ بولا ہے' جو آپ ایسے کہہ رہی ہیں۔'' ایمن نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''نہ میری بچی میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل میری چندا میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی میں چاہتی ہوں کہ پڑھائی مکمل ہونے تک تمہاری کہیں بات پکی کردوں' مگر تمہارے ابو کا کہنا ہے میں پہلے تم سے پوچھوں کہ تم کیا چاہتی ہو' تمہیں ہمارے اِس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''اماں اتنی جلدی کیا ہے' کچھ نہیں ہوگا آپ کو' کیوں وہم پالتی ہیں آپ۔'' ایمن روہانسی ہوگئی۔

بشیر صاحب بولے۔

''بیٹا! تمہاری اماں کو چین مل جائے گا بس تم اپنی پڑھائی مکمل کرو' ہم شادی تو تمہاری پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ہی کریں گے۔''

ایمن خاموش ہوگئی کیونکہ اُس کی ہاں میں اماں کا سکون تھا' جو اُسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔

اتوار کا دن تھا آج صبح سے ہی اماں بہت خوش تھیں اور ہوتیں بھی کیوں نہ بھئی آج ایمن کو دیکھنے لڑکے والے آرہے تھے' آمنہ بوا نے رشتہ بتایا تھا' خاندانی لوگ تھے' لڑکا C.A کیا ہوا تھا' اُن لوگوں کو بھی تھوڑا وقت درکار تھا' لہٰذا جہاں آراء بیگم نے اُن لوگوں کو گھر آنے پر مدعو کیا۔

ایمن تو تھی ہی پیاری' سادگی میں بھی اُس کا حسن نایاب تھا اب تھوڑا تیار ہوئی تو اور نکھر گئی اماں بلائیں لیے جارہی تھیں۔

''اللہ پاک میری بچی کے نصیب اچھے کرے' نظر بد سے بچائے۔'' اُن کے لبوں پر بس یہی دعا تھی۔

ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں سر پر سلیقہ سے دوپٹہ اوڑھے ایمن جب کمرے میں داخل ہوئی تو دانیال پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا' اتنا مکمل اور سادہ

غزل

☆☆☆

صبر سے کام لو' موسم کو بدل جانے دو
برف حالات کی تھوڑی سی پگھل جانے دو
اپنی کشتی کو ہٹالو ذرا ساحل کی طرف
بس یہ کچھ دیر کا طوفان ہے ٹل جانے دو
اب سجانا ہے سسکتے ہوئے ہونٹوں پر ہنسی
میرے اس خواب کو تعبیر میں ڈھل جانے دو
عہدِ گم گشتہ کے قصے نہ سناؤ مجھ کو
وادی خواب سے اب مجھ کو نکل جانے دو
شاخ امید سے یہ ٹوٹ کے بکھرے ہوئے پھول
ان کی قسمت میں کچلنا ہے کچل جانے دو
سازِ احساس ہے خاموش نہ جانے کب سے
اب تو نغمہ کوئی ہونٹوں پہ مچل جانے دو
ڈھونڈ لے گی نئی امید کا ساحل خود ہی
کشتی زیست کو طوفاں سے سنبھل جانے دو
روشنی کچھ تو سرِ راہگذر ہو فیاض
اس میں کچھ خواب بھی جل جائیں تو جل جانے دو

☆☆☆

فیاض علی فیاض

حسن' اُس نے نہیں سوچا تھا وہ تو اپنی امی کے بہت ضد کرنے پر اِس رشتے کے لیے راضی ہوا تھا مگر اب ایمن کو دیکھ کر اُسے اپنی امی کے فیصلے پر پیار آرہا تھا۔

رضیہ بیگم (دانیال کی والدہ) کو بھی ایمن بہت پسند آئی' دونوں گھرانوں کی آپس میں بات چیت ہوئی اور دانیال کا ایمن کے ساتھ رشتہ طے ہوگیا۔

ایمن کو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اچانک اتنی خوبصورت ہوجائے گی' دانیال واقعی ایک ایسا انسان تھا جو کسی بھی لڑکی کا خواب ہوسکتا ہے' پتہ ہی نہیں چلا وقت کب پر لگا کے اڑتا چلا گیا اور ایمن کی تعلیم مکمل ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں' جہاں آراء بیگم کی سلیقہ مندی کی وجہ سے بشیر صاحب کو اتنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ تھوڑا تھوڑا جوڑ کے بھی کافی سامان جہاں آراء بیگم نے ایمن کے لیے جمع کیا ہوا تھا۔

آخر کار سب کی دعاؤں میں ایمن دانیال کے ساتھ رخصت ہوکر اُس کے گھر آ گئی اور بشیر صاحب کا گھر سونا کرگئی۔

ایمن کی سلیقہ مندی کے سارے گُن جہاں آراء بیگم والے ہی تھے' اُس نے آتے ہی سسرال میں سب کا دل جیت لیا' دونوں نندیں بھابی کی دیوانی تھیں' دیور جیٹھ تو تھے نہیں دانیال اکلوتا بیٹا تھا رضیہ بیگم کا' اور اب بہو بھی آنکھ کا تارا بن گئی تھی۔

ایمن نے اپنے اخلاق ومحبت اور اپنے سلیقے سے سب کو اپنا بنا لیا تھا' دانیال کی تو جان بسنے لگی تھی ایمن میں بہت خیال رکھتا تھا وہ اُس کا' تھوڑی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا ایمن کی' اور ایمن اُس کی محبت میں دن بدن نہال ہوتی جارہی تھی وہ مزید حسین ہوگئی تھی۔

اماں تو لگتا تھا بس ایمن کو گھر میں ہنستا بستا دیکھنے کے لیے ہی زندہ تھیں' چند ماہ بعد ہی اچانک اُن کا ہارٹ فیل ہوا اور وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں' بشیر صاحب بھی تنہائی اور صدمہ برداشت نہ کرسکے اور جہاں آراء بیگم کے چہلم میں وہ بھی چل بسے۔

یکے بعد دیگرے صدموں نے ایمن کو نڈھال کردیا تھا پہلے ماں اور پھر باپ کا سایہ بھی چھن گیا' ایمن بہت ٹوٹ گئی تھی دانیال اُس کا بہت خیال رکھ رہا تھا ہر طرح سے' اُس کی دلجوئی میں لگا ہوا تھا۔

وقت ہر زخم بھر دیتا ہے کچھ وقت بعد ایمن بھی سنبھل گئی۔

اسی دوران ایمن کو بہت بڑی خوشخبری ملی اللہ نے اُسے ماں بننے کی سعادت سے نوازا' رضیہ بیگم اور دانیال کے تو قدم ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے' اُن کا بس نہیں چل رہا تھا ایمن کو کہاں چھپا دیں جہاں اُسے کسی کی نظر نہ لگے۔

ایمن بھی بہت خوش تھی۔ سسرال میں سب ہی اُس کا بہت خیال رکھ رہے تھے کیونکہ میکہ تو رہا نہیں تھا' رضیہ بیگم کی یہی کوشش ہوتی کہ ایمن کو کبھی کوئی کمی محسوس نہ ہو وہ ایک دردمند خاتون تھیں۔

اُن دنوں ایمن کی طبیعت نڈھال سی رہنے لگی تھی' کہنے کو تو وقت ہر زخم بھر دیتا ہے مگر ماں باپ دنیا کی ایسی ہستی ہیں جن کی کمی کبھی پوری نہیں ہوسکتی اور ان دنوں اماں کی یاد ایمن کو پل پل محسوس ہو رہی تھی یہ وقت ہی شاید ہر عورت کے لیے نازک ہوتا ہے جہاں اُس کو پیار اور اپنوں کا سایہ بہت ہمت دیتا ہے۔ رضیہ بیگم اِس بات کو بخوبی سمجھ رہی تھیں اور ایمن کو ہر اونچ نیچ کے بارے میں سمجھا رہی تھیں' یہی وجہ تھی کہ ایمن کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

کہتے ہیں نصیب کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا ہے' شاید بدبختی نے ایمن کا دامن پکڑ لیا تھا' جس روز اُس کی ڈلیوری تھی' صبح سے ہی رضیہ بیگم کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے گھبراہٹ تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی وہ اپنے آپ کو سنبھال رہی تھیں کیونکہ اگر ایمن اُن کی یہ حالت دیکھ لیتی تو شاید وہ اور زیادہ بدحواس ہوجاتی' دنیال دوائیں لینے اسٹور گیا ہوا تھا اور کافی دیر ہوگئی تھی واپس نہیں آیا تھا۔

اُسی اثناء میں ایمن کو لیبر روم میں شفٹ کردیا گیا' رضیہ بیگم کی زبان پر درود شریف کا ذکر اور دعائیں مستقل جاری تھیں۔

''یا اللہ بن ماں باپ کی بچی ہے' اِس کے لیے آسانیاں پیدا کر اور اِس کی تکلیف کو آسانی میں بدل دے میرے مالک۔'' اُن کے لبوں پر بس یہی دعا جاری تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نرس باہر آئی اور رضیہ بیگم کو خوشخبری سنائی کہ وہ دادی بن چکی ہیں۔ ایمن نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا تھا' رضیہ بیگم بہت خوش تھیں مگر دانیال کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا' ایمن بھی کب سے دانیال کے ہی بارے میں پوچھ رہی تھی۔

اِسی اثناء میں ہاسپٹل میں ایکسیڈنٹ کیس لایا گیا ایکسیڈنٹ بری طرح ہوا تھا پورے ہاسپٹل میں بھگدڑ مچ گئی تھی' رضیہ بیگم بھی شور کی آواز سن کر باہر آئیں اور انہوں نے جو دیکھا اُس کو دیکھ کر وہ اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئیں کیونکہ ہاسپٹل میں لایا جانے والا وہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ اُن کا اپنا دانیال تھا۔

ڈاکٹروں نے لاکھ کوشش کی مگر شاید تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا کیونکہ دانیال ڈاکٹروں کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہ بچ سکا اور زندگی کی بازی ہار گیا۔ رضیہ بیگم کے اوپر تو قیامت ہی ٹوٹ گئی اُن کا اکلوتا چشم وچراغ ہمیشہ کے لیے گھر کو اندھیرے میں ڈبو گیا۔ ایمن کی تو حالت اتنی زیادہ خراب تھی کہ آنے والا ہر شخص اشکبار تھا' پے در پے صدموں نے ایمن کو سکتے کی کیفیت میں ڈال دیا تھا۔

اُسے نہ بچی کی خبر تھی اور نہ ہی اپنا ہوش' اتنی سی عمر میں پہاڑ جیسے دکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' مگر شاید زندگی اِسی کا نام ہے یہ نا ہی کسی کے لیے رُکتی ہے اور نہ رُکے گی' وقت ہر زخم پر مرہم رکھ ہی دیتا ہے' مگر کہتے ہیں نا کچھ زخم ناسور بن جاتے ہیں' یہی کچھ ایمن کے ساتھ بھی ہوا زندہ لاش بن چکی تھی وہ' بچی کی قلقاریاں بھی اُس کو زندگی کی طرف واپس نہیں لا پارہی تھیں۔

رضیہ بیگم نے بچی کا نام انمول رکھا کیونکہ وہ اُن کے دانیال کی آخری نشانی تھی اور اُن کے لیے انمول ہی تھی۔

اِس واقعے کو اب دو برس بیت چکے ہیں ایمن آج بھی رضیہ بیگم کے ساتھ ہی رہ رہی ہے اور رضیہ بیگم نے بھی اُس کو اولاد کی طرح ہی رکھا ہوا ہے اور اُن کی یہ خواہش ہے کہ ایمن دوبارہ زندگی کی طرف لوٹے اور اپنے لیے کسی ہمسفر کا انتخاب کرے۔

میری تو یہی دعا ہے اللہ اُس کے نصیب اچھے کرے اور اُسے دائمی خوشیاں دے آمین۔ آپ قارئین سے بھی دعا کی التماس ہے۔

☆☆......☆☆

نئی پیار کہانی

بشیر بدر کا شعر

یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت
اس در سے اٹھو گے تو کوئی در نہ ملے گا

گیتا پانڈے

کہا جاتا ہے کہ عشق میں پڑنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے لیکن رام پور کے رہنے والے محمد جاوید کے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں ہوگا کہ انہیں اپنی ہی ایک پاکستانی رشتے دار سے محبت کرنے کا صلہ یہ



ملے گا کہ دہشت گردی کے الزام میں انہیں ایذائیں دی جائیں گی اور ساڑھے گیارہ برس جیل کی سزا کاٹنی ہوگی۔ عدالت سے بری ہونے کے دو برس بعد جاوید نے اپنی محبت کی اس غیر معمولی آپ بیتی کو مجھ سے شیئر کیا۔

انہوں نے اپنے عشقیہ خطوط دکھائے اور بتایا کہ کیسے انہیں انڈین خفیہ اداروں نے اغواء کرکے ان پر تشدد کیا اور جس پیار کے لیے وہ برسوں قید میں رہے بالآخر وہ بھی نہیں ملا۔ مبینہ سے ان کی پہلی ملاقات سنہ 1999ء میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنی ماں کو لے کر کراچی گئے تھے۔

جاوید کے چچا اور خاندان کے کئی دیگر افراد سنہ 1947ء میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور انہیں لوگوں سے ملاقات کے لیے یہ رام پور سے کراچی آئے تھے۔

جاوید نے بتایا'' ملاقات کے ایک ماہ کے اندر ہی ہم نے ایک دوسرے سے اپنے پیار کا اظہار کردیا تھا۔ ہماری ملاقات خاندان کی ایک شادی میں ہوئی جہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں لڑکے موجود تھے اور شاید انہیں عدم تحفظ کا احساس ہوا۔

وہ مجھے ایک کونے میں لے گئیں اور کہا کہ چونکہ وہ مجھ سے پیار کرتی ہیں اس لیے میں کسی اور لڑکی کی طرف نہ دیکھوں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔'' بس اس طرح کراچی میں جاوید کے ساڑھے تین ماہ کے قیام کے دوران یہ محبت پروان چڑھتی گئی۔

وہ کہتے ہیں'' وہ گھر سے کالج جانے کا بہانہ کرکے نکلتیں اور پھر میں کالج سے باہر ان سے ملتا اور پھر ہم سفاری پارک جاتے اور وہاں بیٹھتے تھے۔'' انڈیا واپس آنے کے بعد سے پیشے کے لحاظ سے ٹی وی کے مکینک جاوید اپنی تنخواہ کی تمام رقم مبینہ کو فون کرنے پر خرچ کردیتے۔

وہ کہتے ہیں'' اس وقت موبائل فون نہیں تھے اس لیے میں ٹیلی فون بوتھ سے انہیں فون کیا کرتا تھا۔ یہ بہت مہنگا ہوتا تھا ان سے بات کرنے کے لیے اس وقت ایک منٹ کے لیے 62 روپے لگتے تھے۔''

ایک برس بعد جاوید نے پھر سے دو ماہ کے لیے کراچی کا دورہ کیا۔ اب دونوں کے اہل خانہ بھی اس پیار و محبت کے چکر سے آگاہ ہوچکے تھے۔

اس رشتے پر تو کسی کو اعتراض نہیں تھا لیکن مبینہ کے اہل خانہ چاہتے تھے کہ جاوید پاکستان منتقل ہوجائیں جبکہ اس کے برعکس جاوید کی فیملی چاہتی تھی کہ مبینہ انڈیا آجائیں۔

جاوید بتاتے ہیں کہ ان کے خطوط دس صفحات پر مشتمل ہوتے اور میں 12 صفحے کا جواب دیتا اسے لکھنے میں مجھے بارہ دن لگتے تھے وہ کہتے ہیں آخری بار جب میں واپس آنے لگا تو اس نے کہا آپ جایئے میں اپنے والدین کو قائل کرلوں گی اور دوسری بار آکر مجھے ساتھ لے کر چلنا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب میں دوبارہ کبھی واپس نہیں آپاؤں گا اور اسے کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاؤں گا۔''

اس کے بعد اگلے دو برس تک جاوید مبینہ سے فون پر رابطے میں رہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو طویل خطوط لکھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جاوید کو اردو زبان بہت کم آتی تھی جس میں مبینہ انہیں خطوط لکھتی تھیں اس لیے جاوید نے خط پڑھوانے کے لیے اپنے دوست مقصود کی مدد لی۔

ان کے ایک دوسرے دوست تاج محمد اردو میں تحریر کردہ خطوط کو ہندی میں ترجمہ کرتے تھے جنہیں جاوید بار بار پڑھا کرتے۔ مقصود ہی جاوید کی طرف سے اردو میں مبینہ کو جواب لکھا کرتے تھے۔

جاوید بتاتے ہیں ''ان کے خطوط دس صفحات پر مشتمل ہوتے اور میں 12 صفحے کا جواب دیتا۔ اسے لکھنے میں مجھے بارہ دن لگتے تھے۔'' اور پھر ایک دن اچانک پوری دنیا ہی بدل گئی۔ جاوید کہتے ہیں۔

''مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے۔ یہ 10 اگست 2002ء کا سنیچر کا دن تھا۔ میں اپنی دکان میں تھا جب ایک آدمی آیا اور ٹی وی درست کرنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں نے کہا میں گھروں میں جا کر ٹی وی نہیں بناتا ہوں۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بہت پریشان ہے اس لیے میں چلنے کے لیے راضی ہو گیا۔'' وہ دکان سے کچھ ہی میٹر دور گئے ہوں گے کہ ایک کار آئی جس کا دروازہ کھلا اور بس انہیں اغواء کر لیا گیا۔

جاوید بتاتے ہیں کہ انہیں پہلے لگا کہ شاید یہ مجرم پیشہ ور افراد ہیں لیکن پھر اُن کی باتیں سن کر وہ سمجھ گئے کہ یہ پولیس اہلکار ہیں اور اُن کی مشکل وہیں کار میں ہی شروع ہو گئی۔ انہوں نے میرا پرس' گھڑی اور دیگر چیزیں لے لیں۔ میرے پاس مبینہ کے دو خط بھی تھے اور وہ بھی انہوں نے لے لیے۔ انہوں نے کہا اگر میں چپ نہیں رہا تو وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔

انہوں نے بتایا کہ میرے خاندان کو بھی اغواء کر لیا گیا ہے اور دوسری کار میں اُن پر تشدد کیا جا رہا ہے۔'' میں رو رو کر چیخ چلا کر ان سے رحم کرنے کی گزارش کر رہا تھا۔''

جاوید کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور جب وہ کھولی گئی تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا جہاں اگلے تین روز تک انہیں ایذائیں دی گئیں۔

انہوں نے مجھے بہت مارا۔ مجھے الٹا لٹکا دیتے اور میرا سر ایک پانی کے ٹب میں ڈبوتے تھے۔ یہ بہت تکلیف دہ تھا۔ جب میری یہ برداشت سے باہر ہو گیا تو میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ مجھے قتل کر دیں۔

جاوید پر پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کا ایجنٹ ہونے کا الزام عائد کیا گیا اور پولیس نے دعویٰ کیا کہ وہ وزارت خارجہ اور دفاع کے خفیہ راز اسلام آباد پہنچاتے رہے ہیں۔ تین روز بعد انہیں رام پور دوبارہ واپس لایا گیا اور ان کے دوستوں مقصود' ممتاز میاں اور تاج محمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے دن ان افراد کو عدالت میں پیش کیا گیا اور صحافیوں کے سامنے خطرناک قسم کے دہشت گرد کے طور پر پیش کیا گیا' جنہوں نے بھارت کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ حکام کا دعویٰ تھا کہ جاوید نے دو بار کراچی کا دورہ آئی ایس آئی کے حکام سے ملاقات اور خفیہ راز پہنچانے کے لیے کیا تھا۔ ان پر پوٹا کے تحت مقدمہ چلا۔

جاوید کو قید تنہائی میں رکھا گیا اور بہت ایذائیں دی گئیں۔ وہ اپنے بہترین دوستوں سے جدا ہو گئے لیکن ان کے پیار کی یادیں ہی جیل کی ساتھی تھیں جن کے سہارے وہ اپنا وقت گزارتے۔ وہ کہتے ہیں۔

''میں جیل میں دوسرے قیدیوں کو مبینہ کی کہانی سناتا تھا۔ کیسے مجھے پیار ہوا' اس کی عادتیں کیسے وہ مجھے چڑاتی تھی۔ اس سے جیل میں مجھے بہت ہمت ملتی تھی' جاوید کے والدین کے لیے بھی یہ بہت مشکل وقت تھا۔ ان کی ماں افشاں بیگم تو اس کے لیے خود کو ذمہ دار مانتی ہیں۔ کہتی ہیں'' اگر کراچی جانے کے لیے میں اس سے اصرار نہ کرتی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس مصیبت سے بچ جاتا۔'' ان کے والد نے اپنے بیٹے کی آزادی کے لیے مقدمہ لڑا جس کے لیے انہیں اپنی زمین' جائیداد اور زیور تک فروخت کرنا پڑے۔ بالآخر 19 جنوری 2014ء کو انہیں رہا کر دیا گیا اور جج نے ان پر عائد تمام الزامات سے انہیں یہ کہہ کر بری کر دیا کہ ان کے خلاف ثبوت نہیں ہیں۔

جاوید کہتے ہیں کہ ان کی زندگی کے قیمتی سال جیل میں گزر گئے۔ گزشتہ دو برس سے وہ اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے گھر کے پاس ہی ایک ٹی وی ریپئر کی دکان کھولی ہے۔

وہ اس بات پر اکثر غصہ کرتے ہیں کہ وہ بے قصور تھے اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سلوک ہوا تو اس کا ہرجانہ کیوں نہیں ملا اور قصورواروں کو سزا کیوں نہیں ملی۔ مبینہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ان سے بہت دنوں سے رابطے میں ہی نہیں ہیں اور شاید ان کی شادی ہو چکی ہوگی۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ مبینہ کو اپنے ذہن سے تو نکالنے میں کامیاب رہے لیکن دل سے نہیں نکال پائے۔

''میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں لیکن کال کرنے سے ڈرتا ہوں۔ کیا ہوگا اگر وہ پھر میرے یا میرے خاندان کے پیچھے پڑ جائیں۔''

☆☆......☆☆

غزل

یقیں میں نقب لگاتا گمان کس کا تھا
فضا میں وہم اُگاتا دھیان کس کا تھا
دلوں میں زخم لگاتی زبان کس کی تھی
خراشتا ہوا زورِ بیان کس کا تھا
وہ میرا گھر تو تھا آبادیوں کے بیچوں بیچ
کھنڈر بنا ہوا خالی مکان کس کا تھا
یہ زخم زخم پرندے کو تھا نہ اندازہ
وہ ہاتھ حاملِ تیر و کمان کس کا تھا
فصیلِ شہر پہ شب خون مارنے والو!
ہمارے در پہ کشیدہ نشان کس کا تھا
وہ ایک سایہ ہمیشہ جو ساتھ ساتھ رہا
تمہارے اور مرے درمیان کس کا تھا
نہ راہبر کا پتا اور نہ منزلوں کے نشان
وہ راستے میں لٹا کاروان کس کا تھا
وہ جس نے صحنِ گلستاں میں لفظ سُلگائے
ہمیں پتہ نہ چلا ترجمان کس کا تھا
خبر نہیں ہے کہ اس شہرِ بے اماں میں نور
ہوا کے دوش پہ وہ سائبان کس کا تھا

نور شمع نور (کینیڈا)

ایسی کہانیاں جن کا انجام دو طرح کا ہے

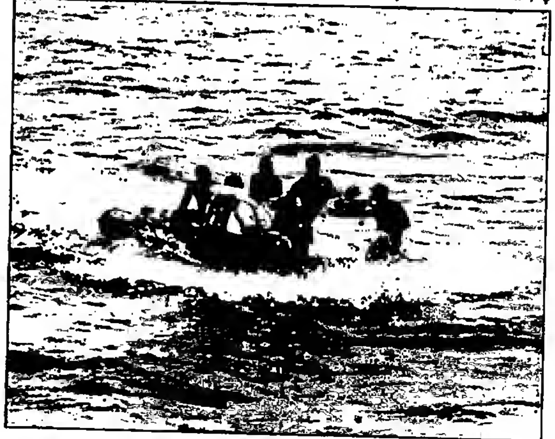
سبز باغ

مصطفیٰ زیدی کا ایقان

بہت سے وہ ہیں جو بار سفر اٹھا نہ سکے
بہت سے وہ ہیں جنہیں راستہ نہیں معلوم

افتخار چوہدری

گھر کے صحن میں لگے ہوئے آم کے گھنے پیڑ پر چڑیوں کی موسیقیت بھری چہکار کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ پیڑ کی گھری چھاؤں میں چارپائی ڈالی گئی تھی، جس پر گھر کے افراد تپتی ہوئی دھوپ



میں اکثر آرام کرنے کی غرض سے بیٹھتے تھے۔ اس وقت بھی حامد اور اس کی والدہ وہاں موجود تھے۔

''ماں جی، آپ کو ایک بات بتاؤں...؟''

حامد نے لاڈلے انداز میں پوچھا۔

وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔

''ہاں بیٹا بتاؤ۔'' دلشاد بیگم نے چونک کر جواب دیا، وہ حامد کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں، کہ اس کی بات سن کر ان کا ہاتھ رُک گیا۔

''آپ اس دنیا کی سب سے اچھی اور پیاری ماں ہیں۔'' حامد نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس پر عقیدت و احترام کا بوسہ ثبت کر دیا۔

''اور تم جیسا بیٹا بھی شاید ہی کسی ماں کو نصیب ہوا ہو۔ اپنے باپ کے گذرنے کے بعد تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں جس طرح دن رات مزدوری کر کے اس گھر کو سہارا دیا ہے، کوئی عام بچہ تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے پروردگار کا جتنا بھی شکر کروں وہ کم ہے۔ میں تو سوچ کر ہی کانپ جاتی ہوں کہ اگر تمہارا سہارا نہ ہوتا تو میں پانچ بیٹیوں کا بوجھ اکیلی کیسے برداشت کرتی۔''

دلشاد بیگم نے پیار بھرے انداز میں کہا، بات کے اختتام تک ان کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

''میں کہاں اچھا ہوں ماں جی۔ بھلا جس ماں کا جوان بیٹا ہو اور اسے پھر بھی لوگوں کے گھروں میں کام کرنا پڑے تو وہ کہاں سے اچھا ہو گیا۔''

حامد نے اس بار قدرے مایوس اور دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''نا، بیٹا، نا ایسے نہیں کہتے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے، پندرھویں سال میں ہو۔ پچھلے تین، چار سال سے تم جس طرح گھر کا نظام چلا رہے ہو وہ کیا کم ہے جبکہ تمہاری عمر کے بچوں کو تو کھیل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر ماں جی، چار سال مزدوری کر کے بھی میں کچھ جمع نہیں کر پایا۔ جب میں جوان بہنوں کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ان کی شادی کیسے کریں گے، دن رات یہی سوچ سوچ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا رہتا ہے۔ اب تو اپنے قریبی رشتے دار بھی کنی کترا کر نکل جاتے ہیں کہ کہیں میں ان سے کوئی سوال ہی نہ کر دوں۔ میری اور آپکی کل آمدن میں بمشکل چولہا جلتا ہے، تو ایسے میں یہ فرض کیسے ادا ہوگا۔'' حامد نے انتہائی دکھی لہجے میں کہا، اس کی آنکھیں چھلکنے کو تھیں۔

''بیٹا تم دل چھوٹا نہ کرو میرا سوہنا رب مسبب الاسباب ہے، وہ ضرور کوئی نہ کوئی انتظام فرما دیں گا۔'' دلشاد بیگم نے اپنے حساس دل بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر خود ان کا اپنا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ماں جی، کیوں نہ میں کسی دوسرے ملک چلا جاؤں اگر ایسا ہو جائے تو چند سال میں ہی ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔'' حامد نے ایک خیال کے تحت کہا۔

''نہیں، بیٹا مجھ میں تمہیں دور بھیجنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر ہی تو جیتی ہوں اور ویسے بھی دوسرے ملکوں میں روپے درختوں پر تو نہیں لگتے، وہاں بھی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔'' دلشاد بیگم نے نفی میں جواب دیا۔

''ماں جی صرف چند سال کی بات ہے جیسے

ہی میری بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی میں واپس آ جاؤں گا۔''

حامد نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے انکار میں سر ہلا کر اس کے خیال کی تردید کر دی۔

''ماں بیٹے میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں' کچھ ہم بھی تو سنیں۔'' حبیبہ نے ہنستے ہوئے پوچھا' وہ ابھی کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تھی۔ وہ دلشاد بیگم کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔

''باجی آپ ہی امی کو سمجھائیں نا۔'' حامد نے التجائیہ انداز میں کہا اور اپنے باہر جانے والا آئیڈیا اسے بھی بتا دیا۔

''نہیں، بھائی ہم روکھی سوکھی کھا لیں گے، مگر تمہیں اپنی آنکھوں سے دور نہیں جانے دیں گے۔ تم نے سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود اس گھر کو جیسے سنبھالا ہوا ہے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

حبیبہ نے بھائی کی بات سننے کے بعد دوٹوک انداز میں اس کی بات رد کر دی۔

''آپ لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ پانچ بہنوں کی شادی کرنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں جو کچھ کما رہا ہوں اس سے تو پیٹ کا جہنم بھی ٹھیک سے نہیں بھرتا تو ان کا جہیز کیسے بناؤں گا۔ کیا ان کو گھر میں بٹھائے بوڑھا کرنے کا ارادہ ہے۔ کسی اچھے ملک میں جا کر کم از کم میری مزدوری کا معاوضہ تو معقول ملے گا اور پھر میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ اپنی گلی کے شیخ صاحب کا بیٹا اویس بھی میرے ساتھ جائے گا۔''

اس بار اس کے لہجے میں دلیل کے ساتھ جذباتی پن بھی موجود تھا۔

دلشاد بیگم اور حبیبہ کے پاس اس کے کڑوے سچ کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''بیٹا تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرنے لگے ہو۔ بہر حال میں تمہیں خود سے دور کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' دلشاد بیگم نے حتمی انداز میں انکار کیا اور کچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اگلے کئی دن حامد اپنی ماں اور بہنوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بلآخر ایک دن ماں اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہار گئی۔

''مگر بیٹا جانے کے لیے اتنے روپے کہاں سے آئیں گے۔'' انہوں نے ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔

''ماں جی ہم یہ گھر فروخت کر دیتے ہیں، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں میں بہت جلد آپ کو ایک خوبصورت گھر بنا کر دوں گا اور بہنوں کے ہاتھ بھی پیلے کر دوں گا۔''

دلشاد بیگم کو اپنے بیٹے کے خلوص میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا، چند دن میں ہی گھر فروخت ہو گیا اور وہ اپنی بیٹیوں کو لیے کرائے کے ایک گھر میں اٹھ آئی۔ حامد اپنے دوست شیخ سہیل کے ساتھ سنہرے خوابوں کی سرزمین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

آج سمندر کا مدوجزر عام دنوں کے مقابلے میں کافی تیز تھا۔ یقیناً آسمان پر موجود چودھویں کا چاند ہی اس تغیر کا ذمہ دار تھا۔ پورے چاند کے ان دنوں میں پیدا ہونے والی مخصوص کشش کے تحت اٹھتی ہوئیں پانی کی طاقت ور لہریں پُرشور آواز کے ساتھ ساحلی چٹانوں کے ساتھ سر ٹکرا کر خودکشی کر رہی تھیں۔ اور یہ عمل ایک تسلسل سے جاری تھا۔

اس وقت جنوب سے شمال کی طرف چلنے والی ہوا نمی سے بھری ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے فضا میں حبس کا تناسب بڑھا ہوا تھا۔ یہ سنسان اور ویران علاقہ ایران کی مشہور بندرگاہ بندر عباس سے محض چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھا۔ یہاں کٹی پھٹی چٹانوں میں بے شمار قدرتی کریک اور کھاڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

یہ کریک اور کھاڑیاں انسانی اسمگلروں اور منشیات کو مشرق وسطیٰ سے لے کر یورپ تک پہنچانے والے ڈیلروں کے لیے جنت جیسی اہمیت رکھتی تھیں۔

اس طرف کوسٹ گارڈز کا عملاً راؤنڈ نہ ہونے کی وجہ سے ان ناجائز دھندا کرنے والوں کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملا ہوا تھا۔

اس وقت ایک گہری کھاڑی میں چند کشتیاں موجود تھیں، ان میں سے ایک کشتی میں درجن بھر نوجوان دبکے بیٹھے تھے۔ کشتی کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا انجن دیسی انداز میں فٹ کر کے اسے بوٹ بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی تھی۔ قریب ہی موجود اونچی چٹان پر ایک لمبا تڑنگا نوجوان آنکھوں سے دوربین لگائے تسلسل ایک ہی سمت میں دیکھے جا رہا تھا، کچھ ہی دیر میں اسے دور سمندر میں جلتی بجھتی ہوئی روشنی دکھائی دینے لگی۔ تو وہ سمجھ گیا کہ اسے راستہ کلیئر ہونے کا کاشن دیا جا رہا ہے۔

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور پھر تیزی سے اترتا ہوا کشتی کے قریب آیا اور ایک طرف بندھی ہوئی رسی کھول کر کشتی میں سوار ہو گیا۔ اسی دوران انجن کے قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے انجن سے منسلک رسی کو ایک جھٹکے سے کھینچا تو انجن ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔

انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد اس شخص نے ڈائریکشن لیور کو سنبھالا اور کشتی کو خطرناک حد تک تیز رفتاری سے کھلے پانیوں کی طرف لیجانے لگا۔ ساحل کی طرف آتی ہوئی دیوہیکل اور طاقت ور لہریں کشتی کے راستے میں مزاحم ہو رہی تھیں۔ کئی بار کشتی بڑی لہروں کی ٹاپ پر جا کر ایک دم سے نیچے آئی تو ایسے محسوس ہوا کہ کشتی ابھی الٹ جائے گی۔ مگر انجن کو کنٹرول کرنے والا ادھیڑ عمر شخص اپنے کام کا انتہائی ماہر ثابت ہوا، اس نے ہر بار عین آخری لمحوں میں کشتی کو بیلنس کرتے ہوئے اسے الٹنے سے بچا لیا۔ اس خوفناک جان لیوا صورتحال سے کئی بار نوجوانوں کی گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں۔

وہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ لہروں نے کشتی کو کئی بار الٹنے کی کوشش میں اٹھا کر پٹخا مگر انجن آپریٹر کے سامنے اُن طاقت ور لہروں کی کوئی پیش نہیں چلی، بالآخر وہ ادھیڑ عمر شخص کشتی کو بپھری ہوئی موجوں میں سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب کشتی کھلے سمندر میں کافی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی، ان لوگوں کا سمندر کے بپھرے ہونے کے باوجود اتنا خطرناک رسک لینے کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ خاص مقصد یہ تھا کہ مدوجزر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے کھلے سمندر میں کوسٹ گارڈز کی کشتی ٹیموں سے مڈبھیڑ ہونے کا چانس تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ ابھی انہوں نے چند ناٹیکل میل کا سفر ہی طے کیا ہوگا، جب غیر متوقع طور پر ایک جانب سے کوسٹ گارڈز کی تیز رفتار لانچ نمودار ہوئی اور سیدھی انہی

کی طرف بڑھنے لگی ۔بوٹ پر ایرانی سرچنگ فورس کی مخصوص رنگ والی فلش لائٹ مسلسل حرکت کررہی تھی۔

شاید سکیورٹی فورس نے ان کی کشتی کو مارک کر لیا تھا اسی لیے سیدھی ان ہی کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔

لانچ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر کشتی میں موجود تمام افراد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے بپھری ہوئی موجوں میں کشتی ڈالنے کا رسک صرف اس لیے لیا تھا کہ آج پکڑے جانے کا چانس نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر ان کے اندازے اور سورس کی طرف سے مہیا کی گئی اطلاع دونوں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔لانچ کسی عفریت کی طرح ان کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔

''یہ بے وقت کہاں سے ٹپک پڑے۔'' اس لمبے تڑنگے نوجوان نے فارسی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے کہا، اور پھر ایک طرف پڑے ہوئے بیگ کی طرف متوجہ ہوگیا' بیگ کی زپ کھول کر اس نے اندر سے جدید قسم کے ماسک نکالے اور سب کو ایک ایک دینے لگا۔

''یہ پہن کر سمندر میں اتر جاؤ کشتی کے نیچے والی طرف لوہے کے ہک لگے ہوئے ہیں انہیں پکڑ کر کشتی سے چپٹے رہنا۔ جب فورس واپس چلی جائے گی تو میں تمہیں واپس اوپر بلا لوں گا۔'' اس بار اُس نے صاف اردو میں بات کی تھی، مگر لہجہ تحکمانہ تھا۔

''مگر مجھے تو تیرنا ہی نہیں آتا۔'' ایک نوعمر معصوم سے لڑکے نے اپنا مسئلہ بتایا۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تم کھلے سمندر میں کود جاؤ، کشتی کے کنارے کو پکڑ کر آرام سے پانی میں اترو اور پھر ہکوں کو پکڑتے ہوئے کشتی کے نیچے کی طرف چلے جاؤ۔بس چند منٹ کی بات ہے ، جیسے ہی فورس مطمئن ہو کر واپس چلی جائے گی، تو میں تمہیں واپس بلا لوں گا ، اور یہ اسپیشل ماسک ہے جو پانی میں سے آکسیجن کشید کرتا ہے، اس سے تمہیں سانس لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی ۔اب جلدی کرو اگر فورس نے تم میں سے کسی کو دیکھ لیا تو میرے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا۔''

کچھ ہی دیر میں سب لڑکے ماسک پہن کر بپھری ہوئی موجوں کے درمیان ڈولتی ہوئی کشتی سے نیچے اتر کر پیندے کی طرف آئے اور ہکوں کو تھام کر انتظار کی سولی سے لٹک گئے۔

''اپنے ہاتھ سروں کے پیچھے رکھ کر کشتی کے فرش پر لیٹ جاؤ۔ اگر کوئی غلط قسم کی حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔'' سکیورٹی فورس کی لانچ سے لاؤڈ اسپیکر کر ذریعے پہلے فارسی اور پھر وہی اعلان انگریزی میں دہرایا گیا۔ لانچ سے ہیوی سرچ لائٹ کی روشنی براہ راست کشتی پر ڈالی جا رہی تھی۔

کشتی میں دو، فرد نظر آرہے تھے، اعلان سنتے ہی دونوں نے اپنے ہاتھ سر کے اوپر رکھے اور فرش پر لیٹ گئے ۔چند لمحوں میں ہی کئی مسلح نیوی سیلر کشتی میں اتر آئے اور ان دونوں کو نشانے پر رکھ لیا۔

''اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی شناخت کرواؤ۔'' ایک سیلر نے بارعب آواز میں حکم دیا ۔اس کے کندھے پر آفیسر کے بیج موجود تھے۔

''سر، میں رضا ہوں اور یہ عزیزی ہے۔'' لمبے تڑنگے نوجوان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اپنا اور کشتی چلانے والے ملاح کا نام بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی دونوں نے اپنے اپنے آئی

ڈی کارڈ نکال کر آفیسر کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ کچھ دیر تک کارڈز کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''رات کے اس پہر کھلے سمندر میں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے ایک گہرا سانس لیکر آئی کارڈ واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ اس دوران چند اہلکار کشتی میں موجود چیزوں کو الٹ پلٹ کر تلاشی لینے میں معروف تھے۔

''سر، میں درگان جزیرے تک جا رہا ہوں۔ میں جاب کے سلسلے میں بندرعباس رہتا ہوں ، جبکہ میرے والدین درگان میں ہوتے ہیں، کچھ دیر پہلے گھر سے فون پر اطلاع ملی کے میری والدہ کی طبیعت انتہائی ناساز ہے تو مجبوراً مجھے اسی وقت نکلنا پڑا۔ برادر عزیزی کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے درگان تک پہنچانے کی حامی بھر لی ورنہ مجھے صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔'' رضا نے آفیسر کو تفصیل سے جواب دیا۔

''مگر بندرعباس سے درگان جانے کا راستہ تو یہاں سے چند ناٹیکل میل مشرق کی طرف ہے تو پھر تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔'' آفیسر نے مشکوک لہجے میں سوال کیا۔ اس دوران اہلکار تلاشی لینے کے بعد اسے بتا چکے تھے کہ کشتی میں کسی قسم کی کوئی غیر قانونی چیز نہیں ہے۔

''سر، انجن میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہوگی تھی ،کوشش کے باوجود انجن اسٹارٹ نہیں ہو رہا تھا۔ سمندر کا مد و جزر تیز ہونے کی وجہ سے لہریں کشتی کو اس طرف دھکیل لائیں۔ اب عزیزی نے بڑی مشکل سے انجن کو درست کیا ہے تو ہم سفر کے قابل ہوئے ہیں۔'' رضا نے بدستور اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں ایسے موسم میں سفر نہیں کرنا چاہیے

غزل

نہ وحشت کا وہ عالم ہے نہ وہ سودا رہا سر میں
کہاں تک کوئی ڈھونڈے موم کے اوصاف پتھر میں

مری ایک ایک دھڑکن پر مجھے آواز دیتا ہے
وہ لمحہ جب کوئی دریا اترتا ہے سمندر میں

وہ اک چہرہ کہ جس کے حسن کی تفہیم کی خاطر
مری بینائی رقصاں ہے ہر اک شاخ گل تر میں

مجھے لگتا ہے پھر تشکیل نو کا مرحلہ آیا
میں جب بھی دیکھتا ہوں کوئی پتھر دستِ آزر میں

ضروری ہے گلوں کا تذکرہ آنگن کی مٹی سے
وگرنہ دشت کی ویرانیاں آجاتی ہیں گھر میں

دلوں کے فاصلوں کو آؤ مل کر کم کریں ہم تم
چلو چلتے ہیں پھر ہم سنگِ اسود رکھ کے چادر میں

سبب کیا ہے یہ ہم پر راز اب تک کھل نہیں پایا
رکھا ہے اس نے کیوں آتش فشاں مٹی کے پیکر میں

رفیع الدین راز

تھا۔ بہر حال میں تمہاری والدہ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔'' افسر نے مطمئن لہجے میں کہا اور اہلکاروں کو واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے سیڑھی کی طرف بڑھ گیا، جو لانچ سے کشتی میں لٹکائی گئی تھی۔

آفیسر نے لانچ کے عرشے پر پہنچ کر واپس کشتی کی طرف دیکھا تو چونک گیا، اسے کشتی کی سائیڈوں میں سائے سے لہراتے ہوئے محسوس ہوئے، گو، وہ سائے پانی میں تھے، مگر اس کی تیز نظروں نے انہیں بھانپ لیا تھا، اور شاید وہ بھی اس لیے کہ لانچ پر سے سرچ لائٹ کی تیز روشنی کشتی پر ڈالی جا رہی تھی، تمام اہلکار واپس لانچ پر پہنچ چکے تو لانچ ہلکی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔

آفیسر عرشے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا کشتی کو دور ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ اور تفکر کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں سکیورٹی فورس کی لانچ آگے بڑھتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو رضا نے کشتی کے نیچے موجود نوجوانوں کو واپس کشتی میں بلا لیا۔ سب شکر کر رہے تھے کہ یقینی گرفتاری سے بال بال بچ گئے۔

''ہمیں مزید کتنا سفر کرنا ہو گا؟'' حامد نے رضا سے مخاطب ہو کر پوچھا، تو رضا چونک کر اس معصوم لڑکے کی طرف دیکھنے لگا، جسے منزل پر پہنچنے کی سب سے زیادہ جلدی تھی۔

''ہم درگان پہنچنے والے ہیں، اور پھر وہاں سے آدھے گھنٹے میں قشم پہنچ جائیں گے، جہاں سے بین الاقوامی سمندر چند ناٹیکل میل دور ہے، جس کارگو جہاز میں تمہیں اٹلی پہنچانا ہے وہ وہاں پہنچنے ہی والا ہے، ویسے حیرت ہے کہ تم اتنی چھوٹی عمر میں گھر سے نکل آئے ہو اور سمندر کا سفر بھی کر رہے ہو، جبکہ تمہیں تیراکی بھی نہیں آتی، اگر کسی وقت کچھ دیر کے لیے تمہیں تیرنا پڑ گیا تو کیا کرو گے؟'' انسانی اسمگلر رضا نے اس معصوم سے لڑکے کو اگلے سفر کی تفصیل بتا کر اس کے تیراک نہ ہونے پر حیرت کا اظہار کیا۔

اس دوران عزیزی انجن کو اسٹارٹ کر کے کشتی آگے بڑھا چکا تھا، اگلے ایک گھنٹے میں وہ جزیرہ درگان اور قشم کو پیچھے چھوڑ کر بین الاقوامی سمندر میں داخل ہو چکے تھے۔

''شاید وہ جہاز ہے جس میں ہمیں جانا ہے۔'' شیخ سہیل نے حامد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے دور کھڑے ہوئے دیو ہیکل کارگو جہاز کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی دھڑکتے ہوئے دل سے جہاز کی طرف دیکھنے لگا، کشتی کا رُخ بھی اس کی طرف تھا، ابھی وہ متجسس نگاہوں سے جہاز کی طرف دیکھ ہی رہا تھا، جب اس کے کانوں میں رضا کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی۔

''بیڑا غرق یہ دوبارہ کہاں سے آ گئے۔''

''عزیزی کشتی کو واپس جزیرہ قشم کی طرف موڑ لو ورنہ یہ ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔''

حامد نے چونک کر اطراف کا جائزہ لیا تو ایک طرف سے نیوی کی وہی لانچ کسی بلا کی طرح ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی، عزیزی نے تیزی سے کشتی کا رُخ موڑا اور دور اندھیرے میں لکیر کی صورت نظر آنے والے جزیرہ قشم کی طرف پوری رفتار سے اندھا دھند کشتی کو بھگانے لگا۔ لانچ کسی عفریت کی طرح اُن کے عقب میں آ رہی تھی، اسی دوران لاؤڈ اسپیکر سے انہیں رکنے کی وارننگ دی جانے لگی، مگر عزیزی پر اس اعلان کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ کشتی کو کسی جہاز کی طرح اڑائے لیے جا رہا تھا۔

لانچ پر سے آخری وارننگ دی گئی، اور اس کے ساتھ ہی کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دی گئی، ٹین سے الٹی شروع ہونے والی گنتی جلد ہی تھری ٹو ون پر پہنچی اور فضا ہیوی مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی، گولیاں کشتی کے اردگرد پانی میں لگ رہی تھیں، شاید لانچ پر موجود اہلکار انہیں صرف ڈرا دھمکا کر روکنے کے موڈ میں تھے اسی لیے گولیاں براہ راست کشتی کو نہیں لگ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب سکیورٹی فورس والوں کو کنفرم ہو گیا کہ کشتی میں موجود افراد ان کی وارننگ کو سنجیدہ نہیں لے رہے تو انہوں نے براہ راست فائرنگ شروع کر دی۔

''عزیزی کشتی روک دو ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار ہیں۔'' حامد نے چیختے ہوئے کہا اور عزیزی کے ہاتھ سے ڈائریکشن لیور چھیننے کی کوشش کی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوسرے لڑکے بھی مرنے کی بجائے گرفتاری دینے کو ترجیح دے رہے تھے۔ لمبے تڑنگے رضا کے ایک ہی تھپڑ نے حامد کی کشتی میں قلابازیاں لگوا دیں۔

''پکڑے جانے کے بعد تم تو کبھی نہ کبھی آزاد ہو ہی جاؤ گے، اگر میں ایک بار بطور انسانی اسمگلر پکڑا گیا تو یہ فورس مجھے موت سے بھی برے حال میں پہنچا دے گی اس لیے آرام سے بیٹھے رہو۔'' رضا نے چیختے ہوئے کہا تو حامد خشمگین نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

اس کا گال پھٹ چکا تھا جس میں سے خون تیزی سے رس رہا تھا۔ اس کی نظروں میں شفیق ماں اور معصوم بہنوں کا چہرہ گردش کر رہا تھا، اسے اب شدت سے احساس ہو رہا تھا، کہ کاش وہ ان کی بات مان لیتا، اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال ابھر رہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کی معصوم بہنوں کا کیا بنے گا۔ اب تو ان کے سر پر چھت بھی اپنی نہیں تھی۔

''حامد نیچے جھک جاؤ۔'' اسکے دوست سہیل شیخ نے اسے زبردستی نیچے جھکاتے ہوئے کہا مگر اس کی یہ ہمدردی کسی کام نہ آئی۔

اسی لمحے ایک گولی کشتی کی باڈی کو پھاڑتے ہوئے ایکسٹرا ڈیزل کی کین میں گھس گئی، جس کی وجہ سے یکدم آگ بھڑک اٹھی۔ ایک نوجوان نے جلدی سے کین کو ٹانگ مار کر سمندر میں گرانا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا کین ایک دھماکے سے پھٹ گیا، اور کشتی تنکوں کی صورت بکھرتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

نیوی سیلرز نے لانچ سے چند بوٹس سمندر میں اتار کر مرنے والوں کی لاشیں اکٹھی کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ چودہ لوگوں میں سے آٹھ کی لاشیں تلاش کر سکے تھے۔ کچھ دیر میں ان آٹھ لوگوں کی لاشیں بندر عباس کی بندرگاہ پر پہنچانے کے بعد انہیں تابوتوں میں منتقل کر دیا گیا۔

شیخ سہیل کی لاش نہیں ملی تھی، جبکہ حامد کی شناخت اس کے لباس میں موجود بٹوے میں تصویر اور ایڈریس کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی۔ اب اس کی لاش پاکستان بھیجی جا رہی تھی۔

اُس نے اپنی ماں سے جلد واپس آنے کا وعدہ بہت جلد ایفاء کر دکھایا تھا، مگر فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر جانے کی بجائے دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔

☆☆......☆☆

میں بے آشنے نہیں ہوں

علی حسین جاوید کا خیال

> کب سے قائم ہے اندھیروں کا تسلط مجھ پر
> کاش بھر دے میری دنیا میں اجالے کوئی

ایس امتیاز احمد

نیاز احمد کو اپنی زندگی میں سب کچھ بہت آسانی سے مل گیا تھا۔ اس کے والد بشیر احمد نے ہوش سنبھالتے ہی اسے ایک دکان کرائے پر لے دی اور اس میں سودا بھی ڈال دیا۔ دکان چل نکلی تو



اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ ماں چاہتی تھی اپنی بھانجی کو بیاہ کر لائے۔ لیکن بشیر احمد چاہتا تھا نیاز احمد کی جہاں مرضی ہو شادی وہیں ہونی چاہیے۔

''نیاز بیٹا! اب تو ماشاء اللہ بیس سال کا ہو گیا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ کیوں نہ تیری شادی کر دی جائے۔'' بشیر احمد نے بیٹے کی مرضی معلوم کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ابا میرے کاروبار میں اتنا منافع شروع نہیں ہوا کہ میں کچھ جمع کر کے اپنی دکان خرید لوں۔'' نیاز نے جھینپتے جھینپتے کہا۔

''میں تیری شادی کی بات کر رہا ہوں تو دکان خریدنے کی بات کر رہا ہے۔''

''دکان تو کاروبار بڑھانی ہے۔'' اور نیاز نے شرما کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''دکان خریدنے کے لیے تو عمر پڑی ہے' انسان ساری زندگی کاروباری جھمیلوں میں ہی گزارتا ہے' لیکن شادی کے لیے ایک خاص عمر مقرر ہے' وہ نکل جائے تو مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' والد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ابا جیسے تمہاری مرضی ہو کر ڈالو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو مگر شادی میں صرف کرن سے ہی کروں گا۔'' نیاز نے چہکتے ہوئے کہا۔ یہ بات سن کر بشیر احمد پہلے تو حیرت سے اُسے تکنے لگا...... پھر یک دم ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

نیاز احمد خاموشی سے اپنے والد کی طرف دیکھتا رہا۔ جب ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو پوچھا۔

''ابا میں نے کون سا ایسا لطیفہ سنا دیا تھا جو تم ہنس ہنس کر دہرے ہو گئے۔''

''بھئی کیا بتاؤں جس بات کے پوچھنے میں ہم اتنا ہچکچا رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا تم اس بات کا جواب دیتے ہوئے شرم اور کشمکش کا شکار ہو جاؤ گے تو ہمیں فیصلہ کرنے میں مشکل ہو گی۔ اس بات کا جواب تو تم نے کھٹ سے بلا دھڑک دے دیا۔ معاملہ ایک فقرے میں طے کر کے رکھ دیا اور کاروباری سلسلے میں یوں شرما شرما کر بات کر رہے تھے جیسے......''

یہ بات سنتے ہی نیاز احمد نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اُسے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اور شرم کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

نیاز احمد کو چاچا حلیم احمد کی بیٹی کرن پسند تھی۔ سگھڑ' گھریلو' سلیقہ مند اور نیاز سے دو جماعتیں زیادہ پڑھی ہوئی' ابھی ابھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ نیاز احمد کے والدین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☆......☆......☆

جٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا' کرن جہیز میں دکان بھی لائی تھی۔ یوں نیاز احمد کی خواہشوں کے پیڑ بغیر محنت اور کوششوں کے ہی ہرے بھرے ہوتے گئے۔ شادی کے بعد وقت کیسے پر لگا کر اڑا معلوم ہی نہیں ہوا اور نیاز احمد تین بچوں کا باپ بن گیا۔ دکان کی مصروفیت نے اسے کئی سال اُلجھائے رکھا۔ اب اس کا کاروبار جم گیا تھا۔ زندگی یکسانیت کے دھارے پر چل نکلی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ کرن کی دلربا اور متنوع شخصیت سے لطف اندوز ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرے' لیکن معاشرتی زندگی کا رنگ ڈھنگ ایسا تھا۔ وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔

اُس روز نیاز احمد دکان سے واپس آیا تو کرن کہیں جانے کی تیاری میں لگی تھی۔ وہ آج بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''تم اور بچے کہاں جا رہے ہو خوب بن ٹھن

کر؟" نیاز نے پیار سے پوچھا۔
"صوفی کی مہندی ہے نا پرسوں' وہیں جا رہے ہیں۔"
"مہندی پرسوں ہے تو کیا آج سے مہندی اُگانے کے لیے بیٹھ جانا ہے وہاں جا کر؟"
"آج ڈھولکی ہے۔" کرن نے مسکراتے ہوئے اور بچوں کو تیار کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے بھی لے چلو برقع پہنا کر۔" نیاز احمد نے بظاہر تو ازراہِ مذاق ایسا کہا تھا' لیکن دراصل وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ گھر آنے کے بعد ہر پل کرن کی اعانت میں گزارے' اس سے باتیں کرے۔ جہاں وہ جائے اس کے ساتھ رہے۔ جو کچھ بھی کرے اس میں نیاز احمد بھی شریک ہو۔ لیکن یہ ایسی خواہش تھی جس کا اظہار ایک شوہر کے لیے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بیوی کے گھٹنوں سے جڑے رہنا ایک کمتر عمل سمجھا جاتا ہے۔ سو نیاز احمد نے اپنی خواہش کا گلا دبا دیا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مزاحیہ انداز میں کہا۔
"کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہی جا سکتا۔"
"اور لڑکیوں میں بیٹھ کر ڈھولکی بجاتے۔"
کرن اُس کی دلی تمنا سے بے خبر اسے چھیڑ رہی تھی۔
"تم لوگ جب تیاری مکمل کر لو مجھے بتا دینا میں چھوڑ آؤں گا۔"
کرن اور بچوں کے جانے کے بعد گھر سونا ہو گیا۔ نیاز احمد نے ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا دل نہ لگا۔ وہ یادوں میں کھو گیا۔ اُسے وہ تمام مواقع ایک ایک کر کے یاد آنے لگے' جب وہ اور کرن ایک ساتھ ہونے کے باوجود بھی ایک ساتھ نہیں ہوتے تھے۔ کسی شادی یا تقریب کے موقع پر ہی نیاز احمد فارغ ہوتا تو اسی موقع پر کرن کے ساتھ رہنے' اس کے ساتھ چھوٹی بڑی مشاہدے میں آنے والی ہر چیز کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ کرن کی رائے اُسے بہت دلچسپ لگتی۔ نیاز احمد کے خیال میں وہ بہت سوچ سمجھ رکھنے والی بیوی تھی۔ جس کے ساتھ وقت گزارنا بہت کارآمد اور پُرلطف ہوتا تھا لیکن بدقسمتی سے شادی بیاہ کے طور طریقے اُس کی آرزو میں ہمیشہ رکاوٹ بن جاتے۔ کرن کو زنانے میں جانا پڑتا اور نیاز احمد کو مردانے میں' یوں تقریب کے اختتام تک دونوں ہی اپنا اپنا وقت ایک دوسرے سے جدا گزارتے' واپسی پر کرن تو چہک چہک کر کچھ باتیں اِدھر اُدھر کی سنا دیتی لیکن نیاز احمد کے دل کی گھٹن دور نہ ہوتی۔ صبح جلدی اٹھنے اور دکان پر جانے کے خیال سے نیند کی فکر میں وہ اپنے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال پاتا تھا۔ اگلے دن گاہکوں میں مغز کھپاتا اور بڑھتی ہوئی مہنگائی پر لوگوں کے برے برے تاثرات کو دیکھنے کے بعد اس کے پاس اس موضوع پر بات کرنے کے سوا دوسری کوئی بات نہ رہتی۔ یہ ایسا خشک موضوع تھا جسے کرن کے سامنے چھیڑ کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے عام طور پر خاموشی ہی اختیار کر لیتا۔
انہی خیالوں میں کھویا وہ اپنے سماج کے رسم و رواج پر غور کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ نیاز احمد نے دروازہ کھولا سامنے پڑوسی کا لڑکا ریاض کھڑا تھا۔
"آؤ ریاض اندر آ جاؤ۔" نیاز احمد نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

"میں آپ کو بلانے آیا ہوں' نالیوں کی کھدائی اور مرمت کا معاملہ ہے سب لوگ انور

چاچا کے گھر پر جمع ہو رہے ہیں' آپ بھی وہیں آ جائیں۔"
نیاز احمد اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ ایک گھنٹہ تک نالیوں کی مرمت کا مسئلہ زیرِ بحث رہا۔ معاملات طے پا گئے تو بزرگ اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ چند نوجوان بڑے تھڑے پہ بیٹھ کر تاش کی بازی لگانے لگے۔ نیاز احمد بھی وقت گزاری کے لیے اُن کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے یہ کھیل بہت دلچسپ لگا اور پھر جلد ہی اسے بھی کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد سے نیاز احمد کی تاش باز گروپ سے دوستی ہو گئی۔ اُس کی شامیں بلاناغہ یہیں بسر ہونے لگیں۔ اُس گروپ کا ایک بندہ خالد تو اُس کا بہت ہی چہیتا دوست بن گیا اور نیاز احمد کو شراب پینے کی محفلوں میں بھی لے جانے لگا۔
"آخر آپ نے دوست کے گھر ایسا کیا کھا لیا تھا جو یہ اُلٹیاں رُک ہی نہیں رہی ہیں۔" کرن نے فرش صاف کرتے ہوئے نیاز احمد سے کہا۔
"تم بس لیموں کا رس لے آؤ' اگر لیموں نہیں ہے تو اچار ہی دے دو۔"
"میں نے لونگ کا پانی چڑھا دیا ہے ابھی دو منٹ میں تیار ہو جائے گا۔"
"نہیں' مجھے تم کوئی کھٹی چیز دو' یہ اُلٹیاں لونگ پانی والی نہیں ہیں۔" نیاز احمد نے ذرا چڑ کر کہا۔
کرن کی ہنسی نکل گئی۔ وہ ہنستے ہنستے جا کر لیموں لے آئی اور نیاز احمد کو شرارت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ نیاز احمد لیموں لے کر چاٹنے لگا تو کرن اس کی چارپائی کے قریب ہی بیٹھ گئی اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔
"میں نے پہلی بار سنا ہے کہ آدمیوں کو بھی ایسی اُلٹیاں لگتی ہیں جس میں کھٹے کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کر دیا جاتا ہے۔"
اب نیاز احمد کو احساس ہوا کہ کرن کیوں ہنسے جا رہی ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔
"بتائیں نا آپ کو کیا ہوا ہے' آپ کہاں گئے تھے؟ کیا کھایا؟ کیا پیا؟"
"پیا......؟ پیا تو کچھ بھی نہیں تھا۔" نیاز احمد نے گھبراتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر کے پاس جانے سے کیوں کترا رہے ہیں بتایئے نا آخر بات کیا ہے؟" کرن نے سنجیدگی سے کریدنے والے انداز میں کہا۔
"کرن یہاں بیٹھو میرے قریب تمہیں سچ بتاؤں۔"
نیاز احمد کے بدلتے تاثرات اور چہرے کی سنجیدگی کو دیکھ کر کرن کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی' ضرور کوئی نامناسب بات ہے۔ کوئی تکلیف دہ سچائی ہے' لیکن وہ حوصلہ بلند کر کے ہمہ تن گوش ہو گئی۔
"میں خالد کے ساتھ اُس کے پرانے دوست کے گھر گیا۔ وہاں سبھی شراب پیتے ہیں۔ آج میں نے بھی تھوڑی سی پی لی' اور میری یہ حالت ہو گئی۔ اب تم خود ہی بتاؤ اگر میں ڈاکٹر سے دوا لوں گا تو بات پورے محلے میں پھیل جائے گی۔"
یہ خبر کرن کے دل پر بجلی بن کر گری۔ اُس کی حالت غیر ہو گئی۔ لیکن اُس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور نیاز احمد سے دوبارہ شراب پینے کے بارے میں رائے دریافت کی۔
"میری توبہ' میرے باپ دادا کی بھی توبہ' کیا

فضول چیز ہے میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا وعدہ کرتا ہوں' لیکن ایک وعدہ تم بھی کرو۔"

"کون سا وعدہ؟"

"تم ابا کو نہیں بتاؤ گی میں نے شراب پی تھی۔"

"وعدہ......" کرن نے پہلی غلطی سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی' اس کا ذہن اس بات کی طرف نہیں گیا کہ جس دوست نے پہلی بار پلائی ہے اگر اُس سے دوستی قائم رہی تو یہ سلسلہ آگے کی طرف بڑھے گا۔ کہیں بھی رُکے گا نہیں۔ ورنہ نیاز احمد کے والد کو ضرور اِس سچائی سے آگاہ کر دیتی۔ اور وہ خرابی کے اس پودے کو جڑ پکڑنے سے پہلے ہی نیست و نابود کر دیتے۔ لیکن کرن نے اپنی محبت' معصومیت اور لاعلمی کی بنا پر والدین کو نیاز احمد کے پہلی بار شراب پینے اور شرابی دوستوں کے یہاں جانے کے بارے میں کوئی خبر نہ ہونے دی اور پھر وہی ہوا جس کا کرن کو بالکل کوئی اندازہ نہیں تھا۔

نیاز احمد ایک شام پھر پی کر آ گیا۔ کرن کو دلی صدمہ پہنچا' لیکن نیاز احمد نے اسے بہلا پھسلا کر آئندہ کبھی نہ پینے کا وعدہ کر کے اُسے خاموشی اختیار کرنے پر منا لیا۔ وہ صرف اپنے والد سے ڈرتا تھا۔ اُن کے احترام اور محبت کے سامنے وہ کچھ بھی ترک کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ والد صاحب کو اس کی شراب پینے کی اطلاع ہو جائے۔

کرن نے اپنی وفا شعاری کا ثبوت دیا اور شوہر کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا۔ اس بات کو جانے بغیر کہ یہ عمل شوہر سے وفاداری نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے شوہر کے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے برابر ہے' اور پھر وہ وقت بھی آن پہنچا جب نیاز احمد کو پکی شراب پینے کی عادت پڑ گئی۔ وہ روزانہ شام کو دکان سے واپس آتے ہی دوستوں کے پاس جانے کی جلدی میں ہوتا' اگر کرن اُسے بچوں کے کپڑے یا کسی اور کام کے لیے ساتھ چلنے کو کہتی تو وہ ٹال دیتا...... کچھ رقم زیادہ نکال کر دے دیتا۔

"یہ رکھ لو ٹیکسی' رکشا یا سالم تانگہ کروا لینا پریشانی سے بچ جاؤ گی۔" اب اُسے کرن کے ساتھ رہنے باتیں کرنے اور ہنسنے ہنسانے کی فرصت اور خواہش نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات گئے نشے کی حالت میں گھر لوٹتا اور آ کر سو جاتا۔

کرن شوہر کے شراب پینے سے بہت دکھی تھی۔ ہر وقت اُداس و ملول رہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ انسان اپنے بھرے پرے گھر کو چھوڑ کر ایک کڑوی کسیلی سی چیز کے پیچھے کیوں بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ آخر اُسے کون سی ایسی خوشی میسر آ جاتی ہے کون سا نام نہاد سرور مل جاتا ہے جو بیوی بچوں کا نعم البدل ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

"یار بڑی عجیب چیز ہے یہ نشہ' مجھے تو خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ویرانی' خاموشی' ہولناک سناٹا چھا جاتا ہے چاروں طرف' مجھ سے نشے کی یہ کیفیت برداشت نہیں ہوتی میں تو شراب پینا چھوڑ ہی دوں گا۔" نیاز احمد نے ایک دن اِس عجوبہ کیفیت سے تنگ آ کر خالد سے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو نیاز احمد یار' پاگل ہو گئے ہو...... دنیا بھر کے نشہ کرنے والے کہتے ہیں۔ نشے میں ایک سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تم کہتے ہو سناٹا ہولناکی' لگتا ہے تمہیں پوری طرح نشہ نہیں ہوا' ابھی کم پی ہے لو تھوڑی سی اور پی لو۔"

نیاز احمد نے تھوڑی تھوڑی کر کے کافی شراب اپنے اندر انڈیل لی' لیکن اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اندر کے سناٹے میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ وہ جب بھی شراب پی لیتا' اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی ویران علاقے میں اپنوں سے دور کہیں تنہا غار میں آ گیا ہے۔ جہاں کسی بھی ذی روح کے پہنچنے کے امکانات نہیں جو اُسے غار سے باہر نکال سکے۔ یوں لگتا جیسے سناٹا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس کا دم گھٹ رہا ہے۔ ایسے میں اس کا جی چاہتا کسی طرف سے کوئی آواز آئے کوئی شور بلند ہو جائے کوئی ہنگامہ برپا ہو جائے۔ تاکہ اس ہولناک سناٹے سے اُس کی جان بچی رہے۔

نیاز احمد نے اپنی اِن کیفیات کا اظہار کبھی اپنے دوسرے دوستوں کے سامنے نہیں کیا۔ ایک تو اس ڈر سے کہ اس پر یقین نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ نشے کا مروجہ تصور صرف سرور کی کیفیت سے وابستہ تھا۔ دوسرے نیاز احمد کی مردانگی پر حرف آتا تھا اگر وہ کسی نامعلوم 'سناٹے' سے خوف کا اظہار کرے' سو اُس نے اپنے محسوسات کو سب سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی' اور پھر ایک دن ہمت کر کے اُس نے اپنے دوست یونس سے تنہائی میں پوچھ ہی لیا۔

"یار تمہیں بھی نشے میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں محسوس کرتا ہوں۔"

یونس نے یہ تو نہیں پوچھا کہ نیاز احمد نشے میں کیسا محسوس کرتا ہے' بس اپنے محسوسات اور ان سے منسوب قصے بیان کرنا شروع کر دیے۔

"یار مجھے تو ایک جوش سا آ جاتا ہے۔ طبیعت میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ نہ کچھ کر ڈالوں' اچھا یا برا' اس کی تمیز مجھ میں اس وقت نہیں رہتی بس یوں لگتا ہے میرے جسم میں بے انتہا طاقت آ گئی ہے۔ غصہ' نفرت' جوش' جذبہ سب کچھ بھر جاتا ہے میرے منہ سے مغلظات نکلتی ہیں' لیکن مجھے دنیا کا خوف نہیں ہوتا' ایک دلیری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا تو ہیچ لگتی ہے بس جی چاہتا ہے کسی کو ماروں۔ خوب پیٹوں یا سر پھاڑ دوں۔ اُس دن میں تانگے والے سے اُلجھ گیا تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان تھا۔ اگر میں نشے میں نہ ہوتا تو اسے دور سے ہی دیکھ کر گھبرا جاتا۔ لیکن نشے میں' میں نے اس کی پٹائی کر دی۔ یاد ہے نا' پچھلے دنوں جمال سے لڑائی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اتنا مارا کہ بیچارا لہولہان ہو گیا' حالانکہ بات معمولی تھی' لیکن میرا جوش اور غصہ تو نشے کا تھا۔"

یونس نے یہ سب بتانے کے بعد خوشدلی سے نیاز احمد کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔

نیاز احمد نے تمام باتیں نہایت بے یقینی سے سنی تھیں۔ وہ گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا یونس شاید اپنے خواب سنا رہا تھا۔ ورنہ سچ نشے میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نشے میں تو یوں لگتا ہے جیسے دنیا میں خوفناک سناٹا چھا گیا ہے اور یہ سناٹا تو ایسا برا ہوتا ہے کہ سیدھا دل کو پکڑتا ہے' اِس سناٹے کو توڑنے والی کوئی ایک آواز ہونی چاہیے۔ مگر کیسی آواز...... وہ یہ نہ جان سکا۔

دوسرے دن صبح کے وقت نیاز احمد کو ہمیشہ اپنے شراب پینے کے عمل پر شرمندگی کا احساس ہوتا۔ وہ ارادہ کرتا آئندہ نہیں پیے گا۔ بلکہ اُن دوستوں کے پاس ہی نہیں جائے گا' جہاں شراب پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

"بس آج سے میں اپنا وقت اپنے بیوی بچوں میں گزاروں گا۔" نیاز احمد خود سے وعدہ

کرتا' وہ اپنے پچھلے دنوں کو لوٹانا چاہتا تھا۔ جب وہ کرن کے ساتھ اچھی اور خوشگوار زندگی بسر کر رہا تھا' لیکن اِس شراب نے اِن کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ کرن بھی اُداس اور مرجھائی سی رہتی تھی۔

''کاش اُس وقت کرن میرا کہا نہ مانتی' نشے جیسے غلط معاملے میں مجھ سے تعاون نہ کرتی' یہ طریقہ وفا شعاری دکھانے کا تو نہیں ہوتا' کاش وہ مجھے سدھارنے کے ارادے سے وفا شعاری کے طور پر میرے والد کو میرے شراب پینے کی اطلاع پہلی ہی بار میں پہنچا دیتی تو میں اس دلدل میں اتنا دھنس جانے سے بچ جاتا۔ ایسی دلدل جس میں رہنا بھی کچھ ایسا خوشگوار نہیں اور باہر نکلنے کا راستہ بھی کوئی نہیں۔''

دن کے وقت وہ جو کچھ سوچتا تجزیہ کرتا' محسوس کرتا اور ارادہ کرتا' شام ہوتے ہی بھول جاتا اور بلا ارادہ اپنی 'عادت' کے مطابق یاروں کی محفل میں پہنچ جاتا' اور شراب کی 'عادت' پوری کرتا۔ اسے نشہ کرتے پورے دو سال گزر چکے تھے۔

☆......☆......☆

اُس روز وہ جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ کرن اپنے گھریلو کام کاج میں مصروف تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور شراب پینے لگ گیا۔ وہ پہلے ہی کافی پی چکا تھا۔ لیکن اندر کا سناٹا اُسے کھائے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اُس وقت تک پیتے رہنے کا ارادہ کر لیا جب تک مدہوش ہو کر بستر پر نہیں گر جاتا۔ اچانک فضا میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی' نیاز احمد کو یہ آواز بہت اچھی لگی۔ جیسے اُسے ہمیشہ اسی آواز کا انتظار رہتا تھا۔ وہ اسی آواز' اسی چیخ کو دوبارہ سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ جس نے ایک بار اِس سناٹے کو توڑا اور اس کے کانوں میں رس گھولا۔ وہ آواز کی تلاش میں باہر صحن میں نکل آیا۔ اس نے دیکھا کرن ایک خالی چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھی اپنے پاؤں سہلا رہی تھی۔

''کیا ہوا' یہ آواز کیسی تھی؟'' نیاز احمد نے پوچھا۔

''میری چیخ نکل گئی تھی۔ چارپائی بچھاتے ہوئے میرا پاؤں چارپائی کے پائے تلے کچل گیا تھا۔''

''کیسے اِدھر آؤ' اندر آؤ' مجھے بتاؤ کیسے؟'' نیاز احمد اُسے بازو سے پکڑ کے اندر لے گیا۔ اس کا ہاتھ اپنی چارپائی کے پائے تلے دبا کر پوچھنے لگا۔

''ایسے......''

''ہاں بالکل ایسے ہی' اب مجھے ہاتھ تو باہر نکالنے دیں' آپ پائے پر وزن نہ ڈالیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے ہائے اوئی اللہ میں مرگئی' چھوڑ دیں نیاز احمد آپ کو کیا ہو گیا؟'' یہ بلند آہ و زاری ہی تو اُسے لذت پہنچا رہی تھی۔ اس نے کافی دیر تک کرن کو اذیت دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔

صبح ہوئی تو نیاز احمد کو رات کے واقعات اپنی تمام جزئیات کے ساتھ یاد آنے لگے۔ اُسے انتہائی درجے کی شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی پیاری اور حسن سلوک روا رکھنے والی بیوی کے ساتھ اپنے بہیمانہ رویے کو دیر تک لذت آمیز پاتا رہا تھا۔ وہ مجرم تھا' کرن کا مجرم اپنے بچوں کا مجرم جو پاس کھڑے رو رہے تھے اور نیاز احمد نے کرن پر ظلم سے ہاتھ نہیں روکا تھا۔

اُسے شراب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی' اُس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا۔ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا' لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ کرن کا سامنا کیسے کرے گا۔ کیا وہ کچھ نہیں کہے گی' جانے وہ کتنی ناراض ہو' اُسے اپنی محبت کا یقین کیسے

دلا سکوں گا۔ نیاز احمد سوچوں میں غرق' سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

''چائے لے لیجیے۔'' اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کرن چائے لیے کھڑی تھی۔

''کچھ یاد بھی ہے آپ نے رات کو میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' کرن نے قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نیاز احمد نے موقع غنیمت جان کر فائدہ اٹھایا اور انجان بنتے ہوئے فوراً جھوٹ کا سہارا لے لیا۔

''نہیں کچھ یاد نہیں' کیوں کیا ہوا تھا؟''

کرن نے رات کے واقعہ کی تفصیل بتائی' اُسے شراب پینے سے منع بھی کیا۔ نیاز احمد نے اپنی چائے ایک طرف رکھی خود کرن کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس نے نہایت رقت آمیز لہجے میں کرن سے اپنے سلوک کی معافی مانگی۔ آئندہ کبھی شراب نہ پینے کا وعدہ کیا۔ کرن کا دل تو پہلے ہی موم تھا۔ اُس نے تمام گلے شکوے بھلا دیے۔

نیاز احمد نے دوسرے ہی دن پھر شراب پی لی تھی۔ وہ دیر تک دوستوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ چاہتا تھا ایسے وقت گھر جائے جب سب لوگ سو چکے ہوں۔ آدھی رات کو اپنے گھر کی دیوار پھلانگی اور صحن میں اتر گیا۔ یہاں پہنچ کر اُس کا جی چاہا کرن کو جگائے۔ اُس کی آواز سنے' پہلے وہ اُسے جگانے کے لیے کرن اور بچوں کے کمرے کی طرف لپکا پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ نیاز احمد نشے کی حالت میں ضمیر کے ساتھ لڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے کافی کوشش کے بعد کرن کی چیخیں سننے کی خواہش پر قابو پا لیا اور سو گیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا تھا۔

ایک روز زیادہ شراب پینے کے بعد اُسے اپنی خواہش پر قابو پانا مشکل ہو گیا وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر چلا آیا۔ کرن اور بچے ابھی جاگ رہے تھے۔ اُس نے کرن کو ہاتھ سے پکڑا اور کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا' اس کے دونوں ہاتھ چارپائی کے پائے تلے دبائے اور خود چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ کرن درد سے بلبلا اٹھی۔ اُس کی چیخ و پکار سن کر تینوں بچے بھی اندر آ گئے۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی چلانے لگے۔ نیاز احمد کو یہ شور و غوغا بہت اچھا لگا۔ اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اِس اثناء میں کرن اپنے ہاتھ پایوں تلے سے نکال کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ بچے اس سے لپٹ گئے۔ نیاز احمد نے کرن کو دوبارہ چارپائی کی طرف لے جانے کی کوشش کی تو بچوں نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ نیاز احمد مسکرانے لگا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا آوازوں کے دوران شراب پینے لگا' شور دھیما ہوا تو تیزی سے اٹھا ایک ہی جھٹکے میں کرن کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ پایوں تلے دبا دیے۔ وہ کافی دیر تک اذیت رسانی کا یہ کھیل کھیلتا رہا تھا۔

صبح ہوئی تو اُسے شرمندگی کا زیادہ احساس نہیں تھا' وہ جانتا تھا کہ کرن اسے صرف نشے کی بنا پر کیے جانے والا عمل سمجھتی ہے۔ جو صبح کے وقت مجھے یاد بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب اُس نے کرن کے نیل پڑے ہاتھ دیکھے تو اُسے بہت دکھ ہوا۔ اُسے خود سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کرن سے ہزاروں معافیاں مانگ لیں۔

پھر یہی سلسلہ ایک معمول بننے لگا۔ نیاز احمد ہر تیسرے چوتھے روز کرن کو اذیت دیتا۔ صبح معافی مانگ لیتا۔

کرن کے اِس حقیقت کو راز بنائے رکھنے کے باوجود یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ لیکن کرن اپنے

خاندان یا پڑوس والوں میں سے کسی کے سامنے بھی اقرار نہیں کرتی تھی۔ بچوں کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتی' صرف حکیم کی بیوی اکبری اس کی ہمراز تھی وہ خود بھی اپنے شرابی شوہر کے ظلم کی شکار تھی۔ جو نشے میں چھوٹی چھوٹی سی بات پر اُسے زدوکوب کرتا تھا۔

''ہر نشئی بہت چالاک' اور اپنے مطلب کا بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور اسے سب کچھ یاد بھی رہتا ہے' لیکن وہ نشے کی ہوس میں مبتلا ہوتا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے ظلم روا رکھ سکتا ہے۔'' اکبری نے ایک دن اپنے تجربے کے بل پر کرن کی آنکھوں پر بندھی پیار کی پٹی کھولنے کی کوشش کی۔

''نہیں میرا نیاز احمد ایسا نہیں کر سکتا' اگر اُسے ایک دن کا واقعہ بھی یاد ہوتا تو وہ اسی دن سے سچے دل سے نشہ کرنا چھوڑ دیتا۔''

''تمہارے اس بے تکے اعتماد کی وجہ سے ہی تو اُسے ڈھیل ملتی جا رہی ہے۔ اُسے معلوم ہے وہ کچھ بھی کرے' تم اُسی کی دہلیز پر پڑی رہو گی۔'' اکبری نے جل کر کہا۔

''اکبری ایسی بھی کوئی بات نہیں' اگر نیاز احمد نے مجھے کسی دن بھولے سے بھی یہ اشارہ کر دیا ہوتا کہ اُسے رات کا واقعہ یاد ہوتا ہے تو میں اُسی دن اس کے گھر سے چلی جاتی۔ اور اس وقت تک واپس نہ آتی جب تک وہ نشہ ترک نہ کر دیتا۔'' کرن نے نہایت جوشیلے لہجے میں اپنی سہیلی کو جواب دیا۔

''کاش نیاز احمد بھائی اتنی سی معصومیت دکھا جاتے' اتنی سی غلطی کر جاتے کہ تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیتے شاید اسی بہانے تمہارا گھر مزید تباہی سے بچ جاتا۔ آخر تم زندگی بھر پائے تلے ہاتھ دیے تو نہیں رہ سکتی نا؟'' اکبری نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جاتا ہے۔ سوچتی ہوں نیاز احمد کے والد کو خبر کر دوں اور خود اپنے والدین کے یہاں چلی جاؤں' بعد میں تمام بزرگ مل کر نیاز احمد کا نشہ ترک کروانے میں تو کامیاب ہو ہی جائیں گے۔''

''دیر سے ہی سہی لیکن تم صحیح راستے پر آگئی ہو کب جاؤ گی اپنے والدین کے گھر؟'' اکبری نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''پندرہ دن تک پپو کے امتحان ختم ہوتے ہی۔''

''بہرحال کچھ بھی ہو ذرا جلدی کرنے کی کوشش کرو۔ نشئی کا نشہ راز بنائے رکھنا کوئی صحت مند رویہ نہیں' میں بھی اپنی سی پوری کوشش کر رہی ہوں کہ حکیم راہ راست پر آجائے۔'' اکبری نے سمجھانے کے انداز میں اپنی بات ختم کی۔

شام کے وقت کرن اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھی اچانک دروازے پر زوردار دستک شروع ہوگئی۔ کرن نے تیزی سے جا کر دروازہ کھولا۔

''باجی ابی کی طبیعت بہت خراب ہے آپ کو بلایا ہے۔'' کرن کے بھائی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ جو تقریباً بھاگتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ کرن نے دونوں بیٹوں کو نیاز احمد کے پاس چھوڑا اور چھوٹی بیٹی کو ساتھ لے کر اماں کی خیریت دریافت کرنے اور دیکھ بھال کرنے چلی گئی۔

نیاز احمد نے سوچا بچوں کے بہانے میں بھی شراب پینے سے بچ جاؤں گا۔ لیکن جوں جوں شام ڈھل رہی تھی' اُس کی شراب پینے کی طلب بڑھ رہی تھی۔ اُس نے خاصا اپنے آپ کو دوسرے کاموں میں اُلجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود آٹھ بجے کے قریب دونوں بچوں کو ساتھ لے کر وائن شاپ پر پہنچ گیا اور اپنا نشہ خرید لایا۔ دونوں بیٹوں کو سلا کر خود شراب پینے بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد اس نے دیکھا اُس کا بڑا بیٹا دروازے میں کھڑا جھانک رہا ہے۔

''پیو گے؟'' نیاز احمد نے پوچھا۔

''ہاں......'' بیٹا آگے بڑھ آیا۔

''کڑوی ہوتی ہے۔''

''دوا بھی تو کڑوی ہوتی ہے۔''

نیاز احمد نے قہقہہ لگایا اور بیٹے کو شراب پیش کردی۔ بچے نے غٹاغٹ پی لی' تھوڑی ہی دیر میں اس کی حالت بگڑنے لگی اور وہ تڑپنے لگا۔ نیاز احمد اُس کی یہ حالت دیکھ کر ایک دم گھبرا گیا اور بچے کو اسپتال لے جانے کی تیاری کرنے لگا' اُسے اپنا دوسرا جوتا نہیں مل رہا تھا۔ وہ چارپائی کے نیچے جھکا جوتا تلاش کر رہا تھا کہ بچے نے سینے اور پیٹ کی جلن کے مارے چلانا شروع کر دیا ان چیخوں کا سننا تھا کہ نیاز احمد نے اسپتال جانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ اس نے مزید چیخیں سننے کی خواہش میں ایک گلاس اور شراب بیٹے کے منہ میں زبردستی انڈیل دی۔ بچہ چلا چلا کر بے ہوش ہوگیا۔ نیاز احمد بھی نڈھال ہو کے سو گیا۔

کرن نے صبح گھر آ کر سب کے لیے ناشتہ تیار کیا۔ وہ رات بھر سے جاگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر سونا چاہتی تھی چھٹی کا دن تھا۔ اس نے سوچا سب کو ناشتہ کروا کر سو جائے گی۔ نیاز احمد خاصی دیر کے بعد اٹھا کرن نے کئی بار پپو کو آواز دی لیکن وہ اٹھا نہیں حالانکہ وہ تو ایک آواز پر اٹھ جاتا تھا۔ نیاز احمد کو ناشتہ دے کر وہ خود اسے جگانے گئی اور بیٹے کو دیکھ کر ایک دلدوز چیخ مار کر وہیں بے ہوش ہوگئی۔ نیاز احمد یہ آواز سن کر اندر کی طرف بھاگا۔ جو منظر اُس نے دیکھا ناقابلِ دید تھا۔ بیٹے کی اکڑی ہوئی لاش پلنگ پر پڑی تھی۔ رات کا تمام واقعہ اپنی باریک تفصیل کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ سکتے میں آ گیا۔

شام کو جنازہ دفنا دیا گیا رات دس بجے کے قریب نیاز احمد کے حواس درست ہوئے۔ وہ غم کے مارے اپنا سر پیٹنے لگا۔ اپنی جان لینے کی کوششیں کرنے لگا۔ وہ خودکشی کر کے مرجانا چاہتا تھا۔

''مجھے چھوڑ دو' مجھے مرجانے دو میں قاتل ہوں قاتل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں' میں نے زہر پلا کر اپنے بچے کو مارا ہے۔ وہ زہر جس نے میری صحت اور عقل دونوں برباد کر دیں شراب پلا کر مارا ہے میں نے' مجھے پولیس میں دے دو' میں قاتل ہوں' ظالم ہوں میں نے کرن پر بھی مسلسل ظلم کیا ہے۔ مجھے ایک نہیں کئی سزائیں دو۔ مجھے صرف ایک بار نہیں کئی بار پھانسی چڑھاؤ میں مجرم ہوں۔ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا مجرم ہوں۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مجھے مرجانے دو خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔''

پولیس آئی معاملہ رفع دفع کروا دیا گیا' لیکن ضمیر کی عدالت نے نیاز احمد کو بری الذمہ قرار نہیں دیا۔ وہ رو رو کر خدا سے معافیاں مانگنے لگا۔ کرن کے پیروں میں لوٹنے لگا۔

''مجھے معاف کر دو یا کوئی سزا دو۔''

☆......☆......☆

اس واقعے کو پندرہ سال بیت چکے ہیں' لیکن نیاز احمد نے خدا سے معافی مانگنا ترک نہیں کیا ہے۔ وہ عبادت گزار ہو چکا ہے۔ اور ہر پل خدا سے معافی کا طلب گار رہتا ہے۔

☆☆......☆☆

مظفر گڑھ سے تیشرو چشم کُشا تحریر

احساسِ ندامت

> یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
> اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

ملک عاشق حسین ساجد

یادیں کیسی بھی کیوں نہ ہوں دل و دماغ پر اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہیں۔ یادیں شگفتہ ہوں تو دل مسرور رہتا ہے اور اگر تلخ ہوں تو زندگی کا ہر ایک لمحہ اذیت و کرب میں جتلا بھاری گزرتا ہے اور اسی طرح زندگی میں کبھی شرمندگی کا کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احساسِ ندامت کا تاثر کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایسا ہی ایک واقعہ 'سچی کہانیاں' کے باذوق قارئین کرام کے لیے پیش کر رہا ہوں۔



یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ملتان شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں نیا نیا ڈسپنسر مقرر ہوا تھا۔ ڈاکٹر ارشاد صاحب جو میرے استادِ محترم تھے ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے ناطے سے ایک ہمدرد انسان بھی تھے۔ اس لیے صرف مجھ سے نہیں بلکہ ہر ایک سے مشفقانہ رویہ رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے میں اسپتال میں شوق اور دلجمعی سے کام کرتا تھا۔

اُس اسپتال میں کام کرتے کرتے کافی شب و روز بیت گئے۔ بوقت شبینہ میں اسپتال سے کچھ دور ایک مکان میں رہتا تھا۔ اسی محلے کے کافی لوگوں سے میری شناسائی ہوگئی جن کے حسن سلوک سے میں جلد ہی متاثر ہو کر گھل مل گیا۔ پھر اسی محلے کے ایک طالب علم ارشد سے میرا دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ ارشد بہت مخلص تھا۔ وہ تعلیمی مصروفیات سے فارغ ہو کر شام کے وقت گپ شپ لگانے کے لیے آ جاتا اور مجھے اکیلا پریشان نہیں ہونے دیتا تھا۔ یوں میرا وقت بہت اچھا گزرتا رہا۔

اسپتال میں روزانہ صبح آٹھ بجے چار لڑکیاں میری نظروں سے گزرتیں۔ وہ روز اسپتال کی بالائی منزل کو جاتیں اور واپسی پر ایک لڑکی کا اضافہ کیے زینے سے اترتیں ہاتھوں میں کتابیں لیے اسکول چلی جاتیں۔ یہی اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔

ان اربابِ خمسہ میں سے ایک معصوم اور گلاب چہرہ سارا دن میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا۔

وقت گزرتا رہا آخر وہی معصوم سا چہرہ میری مشتاق نگاہوں کے ذریعے میرے دل میں اپنا گھر کر گیا۔ آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے ہر وقت بیتاب رہتیں۔ ایک بار دیکھنے کے بعد سارا دن بے کلی سی رہتی۔ روزانہ ارشد مجھ سے وجہِ مغمومیت استفسار کرتا لیکن میرا جواب 'بس کچھ نہیں' تک محدود رہتا۔ آخر ایک رات مجھے ارشد نے عالمِ جنون میں بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ دبے پاؤں آتے ہی کہنے لگا۔

''ارے مجنوں صاحب! خیریت تو ہے' کہیں محبت کا روگ تو نہیں لگ گیا کیا؟ بابا روگِ محبت جھیلنا تمہارے بس کا کام نہیں اس دھندے کو چھوڑ دو۔''

میں نے یہ سب سن کر اسے بیٹھنے کو کہا اور چائے کا پوچھا۔ مگر وہ میرے سنجیدہ پن سے متاثر ہو کر میرے اندر غور سے جھانکنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد کہا۔

''تمہیں کیا پریشانی ہے؟ اگر مجھے اپنا سچا دوست سمجھتے ہو تو سچ اور بلا مبالغہ بتا دو۔ کیونکہ تمہاری پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔''

میں نے صورتِ حال آشنائی کرانے سے گریز کرنے کی کوشش کی مگر اس کے تقاضائے سوال اور اصرار نے مجھے بے بس ہو کر سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا۔ آخر میں نے سب کیفیات اس کے سامنے آشکار کر دیں اور وصالِ جاں کی تشنگی کو بجھانے کی مدد چاہی۔ اس نے بڑی ہمدردی سے ہاں کر دی اور کہا کہ کل مجھے اس لڑکی کی شکل سے شناسائی کرانا میں ہر ممکن تم دونوں کو قریب لانے کا حربہ اختیار کروں گا۔ یہی کہہ کر

ارشد نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور میں اپنی محبوبہ کے حسین تصور میں لیٹ گیا اور دیر تک میری آنکھ نہ لگی۔

اگلی صبح میں اسپتال پہنچ گیا۔ ارشد بھی وقت مقررہ پر وہیں آ گیا۔ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ وہی لڑکیاں حسب معمول خراماں خراماں بالائی منزل کو چلی جارہی تھیں۔ میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنی من پسند کے بارے میں عقدہ کشائی کردی۔ ارشد پُرسکون کیفیات میں مجھے یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل وہ میرے لیے نوید مسرت لائے گا۔ اور پھر کل کے انتظار میں دن اور رات بیت گئے۔ اگلی شام ہوگئی مگر ارشد نہ آیا جس سے مجھے پریشانی ہوئی۔ دو شب و روز گزر گئے مگر ارشد نہ آیا۔ خوب انتظار کیا مگر اس کے آنے کی آہٹ تک نصیب نہ ہوئی۔

تیسرے روز کو چھوڑ کر چوتھے روز میں نے ارشد کے گھر جانے کا قصد کیا سوچا کہ وہیں جاکر شکوہ کرنے کے بعد اس کا جھوٹا قول بھی اسے یاد دلاؤں گا۔ بس یہی سوچتے اس کے گھر کی راہ لی۔ ویسے تو ارشد نے بہت بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی مگر میں دن کو تھکا ہارا ہونے کی وجہ سے کبھی نہ جاسکا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس کے گھر پر پہنچا تو دروازے پر دستک دینے کے کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو میں خوشی سے پھولے نہ سمایا تھا۔ وہی معصوم اور حسین و دلفریب چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے سنبھل کر شائستگی سے کہا تھا۔

''ارشد صاحب سے ملنا ہے' میں ان کا دوست اختر ہوں۔'' میں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا تو جواب میں اس نے کہا۔

''آپ اِدھر بیٹھک میں تشریف رکھیں۔ ارشد بھائی ابھی آنے والے ہیں۔''

''آپ ارشد کی......؟'' میں نے پوچھا تو جواب ملا۔

''جی ہاں' میں ان کی چھوٹی بہن ہوں...... کیوں خیریت؟''

اس فقرے نے میرے پاؤں سے زمین نکال لی۔ میرے ذہن میں سوچوں اور پریشانیوں کا طوفان برپا ہوگیا۔ میں احساسِ ندامت کے پسینے میں شرابور ہوگیا۔ فوراً بغیر بیٹھے اور بنا جواب کے واپس چلا آیا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی' لیکن میں بالکل نہ رُکا۔ سیدھا اسپتال پہنچا معقول بہانہ بنا کر چھٹی لی جو بآسانی مل گئی۔ مکان پر پہنچ کر سامان اٹھایا اور سیدھا گھر کا رخ کیا اور آج تک وہاں واپس نہیں گیا ہوں۔ اِس واقعہ کو بیتے بہت عرصہ ہوگیا ہے۔ مگر ابھی تک میں احساسِ ندامت کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔

☆☆......☆☆

مینارۂ نور

ایک دفعہ ایک دہریے سے حضرت مالک بن دینار کا مناظرہ ہوا۔ بڑی دیر تک بحث ہوئی لیکن دہریہ قائل نہ ہوسکا بالآخر اس پر فیصلہ ہوا کہ دونوں آگ میں ہاتھ ڈالیں جس کا ہاتھ جل جائے گا اس کو راہِ باطل پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا قدرت خداوندی سے کسی کا بھی ہاتھ نہ جلا لوگوں نے اس فیصلے کے مطابق دونوں کو برابر جانا۔ اس بات پر آپ بہت دلگیر ہوئے اور سربسجود ہوکر عرض کی کہ اے اللہ! 70 ستر برس کی عبادت و ریاضت کے بعد اس دہریہ کے برابر ہی آسکا۔ آواز آئی۔ ''تجھے حقیقت کا پتہ نہیں یہ محض تیرے ہاتھ کی برکت تھی کہ اس کا ہاتھ نہ جلا اگر وہ تنہا ڈالتا تو ضرور اس کا ہاتھ جل جاتا۔''

حسن انتخاب: اشعر ظفر۔ کراچی

تخت نشین

وہ میری ذات کے سب رنگ لے گیا لیکن
بس اپنی یاد کا رنگِ ملال چھوڑ گیا

نسیم سکینہ صدف

کھلونے تو ہوتے ہی ہیں ٹوٹنے اور بکھرنے کے لیے اور پھر مٹی کے کھلونے اُن کی بساط ہی کیا۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئے۔ ویسے بھی ہر چیز اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے۔ لوٹنا چاہتی ہے۔



ہر شے کی حقیقت فنا ہے۔ چوہدری اسد اپنے دالان کے وسیع و عریض تخت پر بیٹھے سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی یہ تخت کبھی فنا نہیں ہوگا؟ یہ تخت جس کے اردگرد ہر پل یادوں کا بازار سجا رہتا ہے۔ ٹوٹتا کیوں نہیں اور فنا بھی نہیں ہوتا' شاید یہ کبھی فنا نہیں ہوگا' کیونکہ فنا ہونے والے کچھ لوگ لافانی اشیاء چھوڑ جاتے ہیں۔

اِس تخت سے چوہدری اسد کا رشتہ کیا تھا یہ تو وہی جانتے تھے یا پھر وہ جو تعمیر و تخریب پر قادر ہے وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اب سے ساٹھ برس پہلے جب وہ صائمہ کو بیاہ کر لائے تھے تو اُس کے جہیز میں چاندی کے پائیوں والا یہ تخت بھی شامل تھا۔

شروع شروع میں اپنے کچے مکان میں چاندی کا تخت انہیں ہر لمحہ اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتا رہا' انہیں یہ تخت دیکھ کر کوفت ہوتی مگر کچھ روز بعد اچانک ہی انہوں نے محسوس کیا وہی ناپسندیدہ تخت اُن کے دل میں جگہ بنانے لگا ہے۔

ہوا یوں کہ اُس روز چوہدری اسد نے اپنی نو بیاہتا بیوی صائمہ کو تخت پر کچھ اس طرح دراز دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے' اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ سرہانے کی جانب لمبے اور ریشمی بال تخت کے نیچے فرش پر بکھرے پڑے تھے' رخسار پر سیاہ تل ریشم کی طرح لپٹا ہوا تھا اور گلابی پاؤں میں چاندی کی پازیب اپنے خوابیدہ نغموں کو تھپک رہی تھی' حسن و جمال سے مزین صائمہ پر کمسنی مزید قیامت ڈھا رہی تھی' منظر نگاہوں سے پھسل کر باطن میں اتر جائے تو کبھی دھندلا نہیں پڑتا۔ یہ انہی حسین لمحوں کا کرشمہ تھا کہ چوہدری اسد کے لیے گھر کی تمام اشیاء سے زیادہ محبوب صرف وہ تخت ہوگیا تھا جس پر صائمہ کی شبابی یادیں کسی شہزادی کی طرح آج بھی براجمان تھیں۔

عمر کی سیڑھیاں اترنے کے بعد صحت بینائی' حافظہ سب بیگانے ہوجاتے ہیں مگر چوہدری اسد کے حافظے میں گزرے ہوئے دن پل پل زندہ تھے اور صائمہ جگنو کی طرح اُس کی پلکوں پر سجی رہتی تھی۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ چوہدری اسد کی ہر گفتگو میں صائمہ کا ذکر ضرور شامل ہوتا' کئی بار تو بیٹیاں چڑ کر کہتیں۔

''بابا! اُس عورت کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہیں جو آپ سے بے وفائی کرکے ایک غیر مرد کے ساتھ فرار ہوگئی۔''

''بیٹی! وہ اُس کا اپنا فعل تھا اور یہ میرا' ماں کو کچھ نہ کہو' ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ اولاد پر اِس کے بڑے حقوق ہیں۔''

''مجھے تو نفرت ہے اُس ماں سے جو ہم جڑواں بہنوں کو پالنے میں چھوڑ کر بھاگ گئی۔''

''قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بیٹی۔'' وہ ہر بار صائمہ کی بدچلنی کو قسمت کے خانے میں ڈال کر بیٹیوں کو چپ کرا دیتے تھے۔

چوہدری اسد کبھی کبھی سوچتے جو کچھ ہوا اس میں صائمہ کا کیا قصور تھا' اندھیروں سے روشنی کا سمجھوتہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور اب تو صائمہ کے ہاتھوں لگائے ہوئے آنگن کے تمام درخت بلند ہوچکے تھے اور درخت کے ہر پتے ہر پھول' ہر شاخ پر صائمہ کا بسیرا تھا۔ اُسی کی حکومت تھی۔ اُسی کا راج تھا۔

''اری او اری شیا! میری چلم کی آگ بجھ گئی۔'' انہوں نے آواز لگائی۔

''آئی بابا۔'' بوڑھی ملازمہ ہاتھ میں کڑچھل پر دہکتے ہوئے کوئلے لیے چوہدری اسد کے

سامنے ہانپتی ہانپتی آن کھڑی ہوئی۔

''لا بیٹی لا۔'' چلم کو آگے بڑھاتے ہوئے چوہدری اسد بولے۔

''اس میں بھر دے۔''

''بابا کیوں پیتے ہو اتنا حقہ؟ جانتے ہو نا یہ سخت نقصان دہ ہے تمہارے لیے۔''

''نقصان! بیٹی انسان تو روزِ اول سے خسارے میں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو بابا' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''وقت سب کچھ سکھا دے گا' جا اپنا کام کر اور ہاں سن طاہرہ سے ایک گلاس پانی بھجوا۔'' خادمہ بغیر جواب دیے خاموشی سے سر جھکائے دالان سے باہر نکل گئی۔ وہ ہر وقت ایک ہی سوال کا جواب دے دے کر تھک چکی تھی' چوہدری اسد ہر وقت بیٹیوں کی صدا لگاتے اور خادمہ انہیں بتاتی کہ اب اُن کی بیٹیاں یہاں نہیں پرائی ہو کر اپنا گھر آباد کر چکی ہیں۔

چوہدری اسد کی دھندلائی آنکھیں ہزار گز کے وسیع و عریض آنگن کا گوشہ گوشہ تلاش کرتیں اور پھر اگنت چیختے سائے منظر میں اُجاگر ہو جاتے۔ صائمہ اپنے سنہرے ریشمی بالوں کو سکھاتی ہوئی تخت پر جلوہ نما ہو جاتی' کہیں مٹی کے گھروندے بناتی ہوئی طاہرہ اور اریشہ کی بچگانہ نوک جھونک سماعت کو جھنجھوڑتی' آنگن کے ایک سرے پر چھوٹی سی کوٹھڑی میں مصلے پر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں بادل کے سفید ٹکڑے کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی یہ ساری سفیدی باپ نے ماں کو سوغات میں دی تھی' جس پر ماں نے آخری دم تک کوئی رنگ نہ چڑھنے دیا۔ وہ اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے تھے' اور ماں نے ایک پھول کے لیے اپنی جوانی کا پورا گلشن قربان کیا تھا۔

بہت ہی خوبصورت اور کم عمر صائمہ بیاہ کر آئی تو ماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ حسین و جمیل بہو پا کر اُس کے خوابوں کی تعبیریں ہر لمحہ رقص کرتیں' چاند کا ٹکڑا کہتے منہ نہ تھکتا اور چوہدری اسد تو چاند کہہ کر ہی مخاطب کرتے' مگر دل ہی دل میں یہ بھی کہتے۔

''صائمہ تم میرے آنگن کا وہ چاند ہو جسے دیکھ کر میرے طاق کا دیا ہر لمحہ شرمندہ رہتا ہے۔''

شادی کو ایک سال گزر گیا تھا۔ صائمہ اب سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ سولہ سال کی عمر جذبوں کی زبان سمجھنے لگتی ہے۔ یہی سوچ کر چوہدری اسد پر ایک خوف طاری تھا کئی دنوں سے صائمہ کچھ اُداس اُداس اور سنجیدہ بھی نظر آ رہی تھی۔

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی چاند!''

چوہدری اسد صائمہ کے قریب آ کر بولے تھے تو صائمہ نے انہیں اس طرح چونک کر دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''میں بچی نہیں ہوں سب سمجھتی ہوں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو بولو؟'' جواب میں صائمہ کی نظریں اٹھیں اور جھک گئیں۔

چوہدری اسد کو لگا کوئی تیر تھا جو سیدھا اُن کے دل میں اتر گیا۔ وہ تلملا کر رہ گئے اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں چوہدری اسد نے محسوس کیا کہ صائمہ کی زلفوں کی خوشبو اُن کے گھر کی چہار دیواری پار کرنے لگی ہے اور ان کے آنگن کے پیڑ پودوں اور پھولوں پر نت نئے بھنورے منڈلانے لگے ہیں۔

وہ سخت اُلجھن میں تھے اور جانتے تھے کہ خوشبوئیں قید نہیں کی جاتیں بھنورے گرفتار نہیں ہو سکتے کئی بار ارادہ کیا کہ اس بارے میں صائمہ کو تنبیہ کریں مگر یہ سوچ کر سہم گئے اگر صائمہ نے یہ پوچھ لیا کہ مجھ سے منہ موڑ کر کیوں سوتے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ مگر یہ آنکھ مچولی آخر کب تک چلے گی ایک دن تو یہ بات ظاہر ہو کر رہے گی' یہ سوچ کر چوہدری اسد نے اپنی تمام تر خود اعتمادی کے ساتھ یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اب صائمہ کو مزید اندھیرے میں نہیں رکھیں گے۔

''غور سے سنو! جو میں کہہ رہا ہوں میں کسی عورت کے قابل نہیں۔ تم سے اس لیے چھپایا کہ میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں میں تمہیں کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا۔'' اس انکشاف کے بعد صائمہ پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی اور کافی دیر تک وہ بے ہوش رہی صائمہ کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چوہدری اسد بولے۔

''تمہارا غم میرا غم ہے صائمہ آؤ آج ایک فیصلہ کریں۔''

☆......☆......☆

بس اچانک ہی چوہدری اسد کے ایک نہایت ہی قریبی دوست قیصر علی کا حویلی میں بہت زیادہ آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ جس کے لیے دن اور رات کے حوالے سے کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور نا ہی گھر میں چوہدری اسد کی موجودگی......!

وقت کا پرندہ اپنی مخصوص رفتار سے اڑان بھر رہا تھا کہ ایک روز چوہدری اسد کی حویلی کے دروازے پر غریبوں کے لیے مٹھائی کپڑے اور نقد رقم تقسیم ہوئی تھی اور حویلی کے اندر اس کی جڑواں بیٹیوں کی پیدائش کا جشن منایا گیا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کے پرندے نے مزید اڑان بھری تو وہ وقت بھی آ گیا' جب قیصر علی کے گھر والوں نے اُس کی شادی کی بات اُس کی ایک خالہ زاد سے

دریوزہ گر بھکاری

☆☆☆

دوستو بے کار کوشش مت کرو
سامنے آ جاؤ سازش مت کرو

مدعی ہیں ہم نہیں دریوزہ گر
حق ہمارا دو نوازش مت کرو

کہہ رہا ہوں ضبط سے بھی کام لو
یہ نہیں کہتا کہ خواہش مت کرو

جو جہاں پر ہے ٹھہر جائے وہیں
جلوہ گر ہے حسن جنبش مت کرو

کل کہا مسلم سے اک مداح نے
خود نمایاں ہو نمائش مت کرو

☆☆☆

مسلم سلیم (بھوپال' انڈیا)

پکی کر دی تھی لیکن قیصر علی اپنی شادی کے فیصلے سے قطعاً خوش نہیں تھا اور کچھ ایسا ہی حال، یا معاملہ صائمہ کے ساتھ بھی تھا۔

☆......☆......☆

یہ قیصر علی کی شادی سے صرف تین روز پہلے کی بات ہے اُس کی چوہدری اسد کی حویلی میں آمد ہوئی تھی اور وہ اُس وقت صائمہ کے ساتھ بیٹھا اُس کے لیے گھر، والدین، عزیز رشتے دار گاؤں یہاں تک کے ضرورت پڑنے پر زندگی کو چھوڑ دینے کی بات بھی کر رہا تھا۔ مگر وہ دونوں اِس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی کمرے کی بند کھڑکی سے کان لگائے وہاں ہونے والی تمام باتیں سن رہا ہے۔ اور پھر اگلے روز قیصر اور صائمہ کے بھاگ جانے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔

☆......☆......☆

اب وہ طوفان گزرے دیر ہو چکی تھی۔ بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں۔ چھوٹی بیٹی اریشا بالکل ماں کی تصویر تھی، عادات واطوار میں بھی ماں سے ملتی جلتی تھی، وہ جب بھی چوہدری اسد کے سامنے آتی اُن کا دل انجانے خوف سے لرز اُٹھتا، وہی چال وہی ڈھال، آواز میں وہی نغمگی، ایسا لگتا اریشا کی روح نے صائمہ کا جسم پہن لیا ہو۔

اریشا چوہدری اسد کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی مگر اُس کی ایک بات انہیں بالکل پسند نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو ہر وقت برا بھلا کہتی تھی۔

''بابا! آپ ماں کو بھول کیوں نہیں جاتے، بات بات پر ماں کا ذکر کرتے ہیں۔''

''بیٹی! محبتوں کے مسافر قیام نہیں کرتے وہ تو مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔''

''بابا آج تک آپ کی کوئی بات میں سمجھ نہیں سکی، جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو ہر وقت ماں کا ہی قصیدہ پڑھتے سنا ہے اور سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ آپ نہ اچھا کھاتے ہیں نہ اچھا پہنتے ہیں، حویلی کے آرام دہ کمروں اور بستروں کو ترک کر کے دالان میں دھوپ کی لپک اور تپش میں اِس تخت پر پڑے رہتے ہیں میں پوچھتی ہوں کیا دیا ہے اس تخت نے اور تخت والی نے آپ کو؟ کیوں اتنی محبت کرتے ہیں اس تخت سے، کیوں اس پر بیٹھے ہوئے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو اذیت دیتے ہیں؟''

''بس کر بیٹی! تجھے کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے اور پھر بے وفائی کرنے والوں سے کیا گلہ...... جیون کے اس لمبے سفر میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے تُو بھی تو ایک دن اس بوڑھے باپ کو چھوڑ کر اپنے گھر چلی جائے گی۔

ہم سب ٹرین کے مسافر کی طرح ہیں اپنے اپنے اسٹیشن پر اترتے رہیں گے، یہی نظام قدرت ہے۔''

اور جب بیٹیاں اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں تو چوہدری اسد کو اُن کے چلے جانے کا جیسے یقین ہی نہ آیا تھا، ہر وقت پکارتے رہتے کبھی طاہرہ کو کبھی اریشا کو مگر اس وسیع وعریض حویلی میں صرف ایک بوڑھی خادمہ ڈولتی پھرتی نظر آتی اور وہ ہر پانچ دس منٹ بعد چوہدری اسد کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ یہاں اریشا اور طاہرہ اب نہیں رہتیں۔

☆......☆......☆

ایک صبح جب آسمان پر پرندوں نے سفر کا آغاز کیا بھنورے پھولوں کے نزدیک آئے ہواؤں نے گلشن کو صبح بخیر کہا اور مشرق کی جانب

سورج کی پاکیزہ کرنوں نے لجاتے شرماتے مناظر کا گھونگھٹ کھولا تبھی ایک کوا آنگن کی منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا۔ مگر روز کی طرح آج اُس کی کائیں کائیں میں شور نہ تھا بلکہ ایک پیغام تھا۔

تخت پر لیٹے ہوئے چوہدری اسد کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے دور سے کہیں ریل کی سیٹی سنائی دی، کوا منڈیر سے اڑ گیا۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رک گئی تھی۔ منظر ساکت ہو گئے۔ چوہدری اسد کا ہاتھ تخت سے نیچے اس طرح جھول رہا تھا جیسے تصور میں وہ صائمہ کے سنہرے بالوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہوں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جب انسان کو ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ اُسے تنہا کر دیتے ہیں اور جب اُسے کوئی حاجت نہیں رہتی تو ہر کوئی اُس کی طرف دوڑا چلا آتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے چوہدری اسد کی حویلی میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میت کو غسل دے کر جب تیار کیا گیا اور جنازہ لے جانے کی تیاری ہی تھی کہ اچانک ہی اریشا چوہدری اسد کا ایک وصیت نامہ لے کر آ گئی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرنے کے بعد اُن کی تدفین اسی تخت کے نیچے دالان میں کر دی جائے۔

اریشہ نے آج اُس تخت کو غور سے دیکھا جسے دیکھ کر وہ ہمیشہ نفرت سے منہ موڑ لیا کرتی تھی آج اسے لگا کہ بابا صحیح کہتے تھے کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے۔ ماں کی یادوں سے جڑے ہوئے اِس تخت نے جس پر نفرتیں درج تھیں آج اچانک اریشہ نے اُس سے ایک رشتہ قائم کر لیا تھا۔ باپ کی میت فرش پر رکھی ہوئی تھی، مگر اریشا اُسی تخت پر باپ کو دیکھ رہی تھی۔

''بابا آپ کی ہر اَن کہی بات اب میں سمجھنے لگی ہوں، میں سمجھ گئی ہوں کہ بابا تم نے کیوں اپنی پوری زندگی اِسی تخت پر گزار دی۔'' اریشا کا رو رو کر برا حال تھا۔

برسہا برس کے بعد پہلی بار وہ تخت اپنی جگہ سے ہٹایا گیا۔ تاریخی حیثیت کا حامل وہ تخت، جس نے سرد گرم تمام موسم دیکھے تھے زر، زمین، زن، دنیا پر تینوں معرکے سر کر لیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد قبر کی کھدائی شروع ہو گئی، پھاوڑے کی ہر ضرب طاہرہ اور اریشا کے دل پر پڑ رہی تھی۔ تبھی جیسے آسمان سے کوئی بجلی سی ماحول پر گری۔

''یہ کیا؟'' گورکن کے ہاتھوں سے کدال چھوٹ گئی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہائے اللہ یہ سب کیا ہے۔'' عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ طاہرہ اور اریشہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''ہٹ جاؤ سب لوگ۔'' گاؤں کے بڑے چوہدری اپنی دھوتی سمیٹتے ہوئے قبر میں اترے اور بڑی احتیاط سے منظر کا جائزہ لینے لگے۔

اب گاؤں والوں پر یہ راز کھل رہا تھا کہ چوہدری اسد نے اپنی ساری زندگی اِس تخت کے ساتھ کیوں گزاری، ایک ہی جگہ پر ہر وقت کیوں بیٹھے رہتے تھے۔ بڑے چوہدری کے بلانے پر پولیس بھی آ چکی تھی، اور اب قبر سے دو انسانی ڈھانچوں کو نکالا جا رہا تھا۔

کئی روز بعد آنے والی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اُن دونوں ڈھانچوں میں ایک مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا......!

☆☆......☆☆

محبت کے رنگ

جاوید قیصر کا خیال

گر حکومت دلوں پہ کرنی ہو
شیریں لہجہ زبان میں رکھنا

نازیہ بتول رضا

جوں جوں عائشہ کی شادی کے دن قریب آرہے تھے اُس کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا اور یہ ایک فطری عمل تھا ہر لڑکی کی طرح وہ بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہورہی تھی



کہ اس کا ہونے والا شوہر نجانے کس مزاج کا ہوگا' نجانے اُس کے ساتھ رویہ کیسا ہوگا! اس کے گھر والے کیسے ہوں گے؟ شادی کے بعد اس کی زندگی کیسی گزرے گی' وغیرہ وغیرہ......! وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور اندر ہی اندر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

''کیا بات ہے عائشہ میں دیکھ رہی ہوں کہ کچھ دن سے تم بجائے خوش ہونے کے چپ چپ سی ہو؟ کیا بات ہے مجھے بتاؤ کیا تم اس شادی سے خوش نہیں ہو؟'' طوبیٰ آپی نے جو اس کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں میکے آئی ہوئی تھیں' موقع دیکھ کر اس سے بڑی محبت اور رازداری سے پوچھا' کیونکہ اُن سے بھی عائشہ کا اضطراب چھپا نہ رہ سکا تھا۔ آپی کی بات سن کر عائشہ چونکی' کیا اس کی پریشانی چہرے سے جھلک رہی ہے کہ طوبیٰ آپی نے بھی محسوس کر لی ہے۔

''کچھ نہیں آپی! بس ایسے ہی دل اداس ہو رہا تھا۔'' اس نے ٹالا۔

''اس کی وجہ امی ابو سے دوری ہے یا کوئی اور بات بھی ہے؟ اگر کوئی بات ہے تو دل میں نہ رکھو چندا مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہے ہوسکتا ہے میں تمہاری پریشانی دور کرسکوں۔'' آپی نے کریدا پھر بھی وہ خاموشی سے زمین کریدتی رہی کوئی جواب نہیں دیا۔

طوبیٰ آپی جو شادی شدہ اور ایک سمجھدار عورت تھیں فوراً سمجھ گئیں کہ یقیناً کوئی بات تو ہے جو اندر ہی اندر عائشہ کو پریشان کر رہی ہے' کیا اس کے منگیتر آریان نے کچھ کہا ہے؟ کیونکہ ابھی ایک ہفتے پہلے ہی سے آپی نے امی ابو کی اجازت سے عائشہ اور آریان کی فون پر بات چیت شروع کروادی تھی تا کہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں

ویسے بھی اب ان کی شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے صرف دو مہینے......!

امی ابو نے فون پر بات کرنے کی کچھ سوچ کر ہی اجازت دے دی تھی لیکن روزانہ صرف ایک فون کال' کیونکہ آریان کی بھی خواہش تھی کہ وہ شادی سے پہلے عائشہ سے بات چیت کرے عائشہ بہت خوش تھی اور کیوں نہ ہوتی آریان اور اُس کی فیملی بہت اچھی تھی سب لوگ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے تھے اور فیملی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔

آریان کے گھر میں سب سے بڑی صالحہ آپی تھیں پھر آریان اور اُن کے بعد دو بھائی تھے۔ جو ابھی پڑھ رہے تھے۔

صالحہ آپی شادی شدہ تھیں ساس سسر بھی بے حد اچھے اور سلجھے ہوئے لگتے تھے' بظاہر یہ رشتہ ہر طرح سے بہترین تھا' آریان کی جاب بھی بے حد اچھی تھی پھر آخر کیا مسئلہ تھا تو عائشہ اتنی ڈسٹرب تھی۔

''کیا آریان نے کچھ کہا ہے؟ یا اُس کی کوئی بات بری لگ گئی ہے کچھ بتاؤ تو سہی اس طرح چپ رہنے سے کیا ہوگا' پھر ابھی تمہاری خاموشی اور پریشانی کو صرف میں محسوس کر رہی ہوں کل کو امی ابو اور پھر باقی لوگ بھی محسوس کرکے نجانے کیا سوچیں گے جیسے ہم تمہاری شادی زبردستی کروا رہے ہیں۔'' آپی کے لہجے میں اب تھوڑی سختی تھی۔

عائشہ نے سوچا کہ اسے اپنے دل کی بات اور خدشات آپی کو بتا دینے چاہئیں' سو وہ جھجکتے اور اٹکتے بولی۔

''وہ آپی...... مجھے آریان پرانے خیالات کے لگتے ہیں۔''

''پرانے خیالات کے......!'' آپی زیرلب

بڑبڑائیں۔
''کیا مطلب کھل کے بات کرو۔''
''دراصل آریان چاہتے ہیں کہ میں شادی کے بعد حجاب کروں اور عبایا پہنوں۔'' اس نے اپنی پریشانی بیان کی کیونکہ ابھی تو وہ سر پر اسکارف اور ساتھ دوپٹہ اوڑھتی تھی' کھلے سر سے تو وہ اب بھی گھر سے نہیں نکلتی تھی' لیکن عبایا اور حجاب اس کے لیے کچھ نیا تھا اس لیے اُس کی پریشانی فطری تھی۔
''اُف اللہ!'' آپی نے اپنا سر پیٹ لیا۔
''بس اتنی سی بات کے لیے تم اتنا پریشان تھیں' میں تو سمجھی پتہ نہیں کیا پریشانی ہے...... دیکھو اگر آریان کی یہ خواہش ہے کہ تم عبایا اور حجاب پہنو تو تم پہن لینا مشرقی لڑکیاں اپنے شوہر کی مرضی پر ہی چلتی ہیں اس سے اپنے شوہر کے دل میں گھر بناتی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔''
آپی نے رسانیت سے اسے سمجھایا۔
''لیکن آپی میری دو فرینڈز کی شادی ہوئی ہے اور وہ دونوں صرف دوپٹے میں ہر جگہ گھومتی پھرتی ہیں' ابھی پچھلے دنوں میری فرینڈ رابعہ مجھے مارکیٹ میں ملی تھی اپنے ہزبینڈ کے ساتھ شاپنگ کررہی تھی اس نے جدید فیشن کے سوٹ کے ساتھ صرف دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا وہ بھی گلے میں' میں تو پھر بھی سر ڈھک کے نکلتی ہوں' اب اگر شادی کے بعد میں نے عبایا اور حجاب لیا تو میری فرینڈز میرا کتنا مذاق بنائیں گی میں کتنی آکورڈ لگوں گی؟''
عائشہ روہانسی ہوگئی تھی۔
''عائشہ تمہاری سوچ کو کیا ہوگیا ہے چندا' اگر رابعہ کا شوہر اُسے دوپٹے میں لے کر گھومتا ہے تو یہ اُس کی سوچ اور نظریہ ہوگا اور تمہارا شوہر اگر تمہیں عبایا پہننے کو کہے گا تو یہ اس کی سوچ اور نظریہ ہوگا ہر انسان کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور عورت کو بہر حال اپنے شوہر کی مرضی پر چلنا ہوتا ہے تبھی وہ خوشحال زندگی گزار پاتی ہے' ورنہ زندگی جہنم بن جاتی ہے' میری نصیحت ہے کہ دوسروں کو مت دیکھو بلکہ شادی کے بعد وہی کرنا جو تمہارا شوہر چاہے۔ آریان ایک پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لڑکا ہے مجھے نہیں لگتا کہ وہ زبردستی تم پر اپنی مرضی مسلط کرے گا اس لیے ابھی سے اس معاملے میں پریشان ہوکر اپنا خون مت جلاؤ اور میرے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاؤ بہت کم وقت رہ گیا ہے۔''
آپی اپنی بات ختم کرکے اٹھ کھڑی ہوئیں اور عائشہ نے بھی وقتی طور پر اس بات کو نظر انداز کردیا کہ جو ہوگی دیکھی جائے گی۔
ہوسکتا ہے میں آریان کو عبایا نہ پہننے پر راضی کرلوں' اس نے خود کو سمجھایا اور پُرسکون ہوکر آپی کا ہاتھ بٹانے لگی۔

☆......☆......☆

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن پر لگا کر اڑنے لگے اور عائشہ کی شادی کا دن آن پہنچا' عائشہ پر ٹوٹ کے روپ چڑھا تھا امی کئی بار اُس پر دم کرکے نظر اتار چکی تھیں اور اب وہ آریان کے پہلو میں نظریں جھکائے بیٹھی تھی' گھنٹوں تصاویر اور مووی بنوانے کے بعد وہ تھکی ہاری اب بیڈروم میں پہنچی تھی اور آریان کی منتظر تھی' بالآخر آریان کی کمرے میں آمد ہوئی تھی۔
''بہت خوبصورت لگ رہی ہو!'' آریان نے کہتے ہوئے اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنا دی تھی اس نے شرما کر سر جھکا دیا تھا۔
''مجھے آج تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی

ہیں جو میں فون پر نہیں کرسکا تھا۔'' آریان رسمی گفتگو کے بعد کام کی بات پر آیا تو عائشہ کے کان کھڑے ہوگئے۔
''جی کہیے۔'' وہ دھیمے سے بولی وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر گویا ہوا۔
''دیکھو عائشہ میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں پلیز اسے نیگیٹو مت لینا بلکہ کھلے دل سے اور سوچ بڑی رکھ کر اس بارے میں سوچنا' یہ باتیں آج ہی کرنا اس لیے ضروری ہیں کیونکہ آج ہماری زندگی کا آغاز ہوا ہے اور ہر کام پہلے ہی دن سمجھ آجائے تو زیادہ بہتر رہتا ہے۔''
وہ تھوڑا رُکا پھر بولا۔
''میں نے تم سے فون پر کہا تھا کہ تم شادی کے بعد حجاب کرنا تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا' خاموش ہوگئی تھیں میں نے بھی سوچا کہ یہ باتیں شادی کے بعد ہی کرنا مناسب ہے اب بتاؤ کیا تمہیں حجاب کرنے پر اعتراض ہے؟ دیکھو مجھ سے ہر بات کھل کے کرو میں بھی آج اپنے دل کی باتیں تم سے کروں گا کہ مجھے کیسی عورتیں پسند ہیں' کیونکہ اب تم میری عزت ہو تمہیں لوگ میری بیوی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری بیوی پر انگلی اٹھائے یا اسے میلی نظر سے دیکھے تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''
وہ دھیمے لہجے میں اپنی بات اسے سمجھانا چاہ رہا تھا اور عائشہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ آریان شادی کی پہلی رات کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے' یہ باتیں ابھی کرنا ضروری تھیں کیا؟ بعد میں بھی تو ہوسکتی تھیں' پتہ نہیں کس مزاج کے ہیں۔''
''تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا...... تمہیں اچھا نہیں لگ رہا ناں کہ میں تم سے آج کی رات یہ باتیں کررہا ہوں...... یا پھر شاید تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو تنگ نظر یا پھر شکی مزاج مرد...... ہے ناں؟'' وہ اس کی مسلسل خاموشی کا مطلب سمجھ نہیں پارہا تھا وہ اپنے خیالات کا اظہار کیوں نہیں کررہی ہے تاکہ بات صاف ہوسکے کہ آیا وہ آریان کے خیالات سے متفق ہے یا متنفر......!
عائشہ پہلو بدل کر رہ گئی کیا کہتی' آریان اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
سرخ لہنگے میں خوبصورت میک اپ کے ساتھ وہ سیدھی اُن کے دل میں اتر رہی تھی۔ آریان نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''دیکھو عائشہ مجھے غلط نہ سمجھنا میں کوئی تنگ نظر یا شکی قسم کا مرد نہیں ہوں ہاں مگر غیرت مند ضرور ہوں اور ایک پڑھا لکھا' باشعور اور کھلے دل و دماغ کا آدمی ہوں۔'' پھر لحظہ بھر کو رُکا۔
''اب تم سوچو گی کہ اگر میں کھلے دل و دماغ کا آدمی ہوں تو حجاب کا کیوں کہہ رہا ہوں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
''بولو یہی سوچ رہی ہو ناں؟'' عائشہ کا سر اثبات میں ہل گیا وہ واقعی یہی سوچ رہی تھی۔
''تو ڈیئر میں اس معاملے میں کھلے دل و دماغ کا ہوں کہ میں کبھی تم پر کوئی بے جا پابندی نہیں لگاؤں گا کہیں آنے جانے سے نہیں روکوں گا تم پر کبھی شک نہیں کروں گا اور نہ ہی تم پر کبھی ہاتھ اٹھاؤں گا بلکہ تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھوں گا' تمہیں بے انتہا پیار اور عزت دوں گا بدلے میں مجھے صرف ایک چیز چاہیے کہ تم عبایا پہنو اور حجاب کرو۔''
پھر رک کر اس کے تاثرات دیکھنے لگا۔
عائشہ بیزاری محسوس کررہی تھی یا اُسے لگا۔
''اب میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ یہ سب کیوں

ضروری ہے؟''

عائشہ چپ چاپ سن رہی تھی اسے اب آریان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ کیونکہ وہ فطرتاً اچھی لڑکی تھی' نمازی تھی بس اسے عبایا اور حجاب پسند نہیں تھا۔ اور یہ بات آریان کو طوبیٰ آپی نے بتائی تھی اور کہا تھا۔

''اگر تم اسے محبت سے سمجھاؤ گے تو وہ مان جائے گی کیونکہ عورت تو ہوتی ہی محبت کی بھوکی ہے مرد چاہے تو محبت سے عورت کو اپنا غلام بنا لے' عورت چپ چاپ ساری زندگی دو میٹھے بولوں کے عوض اس مرد کی غلامی میں گزار دے گی اُف تک نہ کرے گی۔''

کیونکہ عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی سخت اور ٹیڑھی ہوتی ہے اس لیے اگر اسے سختی سے موڑا جائے تو یہ ٹوٹ جائے گی اس لیے نرمی ضروری ہے۔''

آریان اسے بہت نرمی اور پیار سے اپنی بات سمجھا رہا تھا جو سیدھی اس کے دل میں اتری جا رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے مرد کی غیرت کو کیسے جانچا جاتا ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ یہی کہہ سکی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' مرد کی غیرت کو اس کی بیوی یا بہن کے لباس اور رہن سہن کے طریقوں سے پہچانا جاتا ہے' جب کوئی عورت تنگ اور مہین لباس پہن کر باہر نکلتی ہے ناں تو سب اس عورت سے زیادہ اس کے ساتھ موجود مرد پر انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ کیسا بے غیرت مرد ہے جو عورت کو اس طرح لے کر جا رہا ہے' ہر ایک کی نظریں اس عورت کے جسم کے آر پار ہوتی ہیں خود میں بھی ایسے مردوں کو بے غیرت کہتا ہوں اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے کبھی خدانخواستہ بے غیرت کہے یا میری بیوی کی طرف کسی کی میلی نگاہ اٹھے۔''

وہ جذباتی ہو رہا تھا شدتِ جذبات سے چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔

''کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ لوگوں کی گندی نظریں تم پر اٹھیں یا لوگ تمہارے شوہر کو بے غیرت بولیں؟'' وہ براہ راست اس سے پوچھ رہا تھا لہجہ دھیما اور پیار بھرا تھا۔

''نہیں بالکل نہیں......!'' وہ بے اختیار بولی تھی۔

''گڈ مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' وہ خوشدلی سے بولا تھا۔

''اک اور بات تم جانتی ہو ہمارے معاشرے میں اتنا بگاڑ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ کیوں آئے دن ایسی روح فرسا خبریں سننے کو ملتی ہیں کہ جن کو سن کر روح کانپ اٹھتی ہے' کیوں رشتوں میں تقدس ختم ہوتا جا رہا ہے؟ اس کی وجہ آج کل کی عورتوں کی اسلام سے دوری ہے' ظاہر ہے جب وہ بے باکانہ غیر مناسب لباس پہن کر باہر نکلیں گی جس سے غیر مردوں کی نظریں اُن پر اٹھیں گی تو پھر اس سب بگاڑ کی ذمے دار عورت ہی ہوئی ناں۔

اگر عورت اپنے گرد حفاظتی اَن دیکھا حصار بنا لے خود کو سمیٹ کر ڈھانپ کر باہر نکلے تو' خدا کی قسم کسی بھی مرد کی مجال نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ بی بی فاطمتہ الزہرہ سے کسی نے پوچھا کہ عورت کے لیے سب سے بہترین عمل کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہ کوئی نامحرم عورت کو دیکھے نہ ہی عورت نامحرم کو دیکھے۔ مزید فرمایا۔

''عورت کو سورج کی مانند ہونا چاہیے کہ کسی کی بھی نظر اس پر اٹھ نہ سکے۔''

آریان لحہ بھر کو چپ ہوا' عائشہ کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا آریان کتنی اچھی سوچ کے مالک ہیں اور وہ انہیں کیا سمجھ رہی تھی۔

''کیا آج کے دور میں بھی ایسے مرد ہیں جو گناہ و ثواب کا اتنا خیال رکھتے ہیں' یقیناً یہ سب نماز کی برکت ہے کیونکہ آریان نماز کے پابند ہیں اور بے شک نماز بے حیائی سے روکتی ہے' یہ سب نماز کا ہی کرشمہ ہے کہ آریان تعلیم یافتہ اور اس دور میں ہونے کے باوجود فحاشی اور برائی سے دور ہیں اور مجھے بھی رکھنا چاہتے ہیں' میں تو بڑی قسمت والی ہوں کہ مجھے آریان جیسے شوہر ملے۔'' وہ دل ہی دل میں آریان کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھی آریان نے اس کی خاموشی محسوس کر کے اُسے پکارا۔

''عائشہ......!'' جواب ندارد......!

''عائشہ......'' پھر پکارا تو چونک کر' جی' بولی۔

''کیا میری باتیں بری لگی ہیں تمہیں؟ تم اس طرح خاموش کیوں ہو گئیں؟'' وہ شاکی لہجے میں بولا۔

''نہیں' نہیں آریان کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ خدارا مجھے شرمندہ نہ کریں' آپ تو بہت اچھے انسان ہیں' میں تو اپنی سوچ پر پشیمان ہوں کہ آپ جیسے انسان کے بارے میں کتنا غلط سوچ رہی تھی' آپ کو نجانے کیا کیا سمجھ رہی تھی۔'' وہ سر جھکائے شرمندگی سے بول رہی تھی اس کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر آریان کے سینے میں ٹھنڈک اترنے لگی وہ فوراً شوخ ہوا۔

''نہیں بتاؤ میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔'' شوخی برقرار تھی عائشہ کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔

''وہ...... دراصل میں آپ کو تنگ نظر اور شکی قسم کا مرد سمجھ رہی تھی۔'' اُس کے معصومیت سے بولنے پر وہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

''سمجھ رہی تھی مطلب......؟''

''مطلب آپ ایسے نہیں ہیں۔''

''اچھا پھر میں کیسا ہوں......''

''آپ...... آپ تو بہت اچھے انسان ہیں' میں تو خود کو بہت عام سی سوچ والی ادنیٰ سی لڑکی سمجھ رہی ہوں جو آپ کو سمجھ ہی نہیں سکی۔'' اُس کے لہجے میں دکھ' پشیمانی اور محبت ایک ساتھ دکھائی دے رہے تھے' آریان سرشار ہونے لگا' اُس نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اس کے جھکے ہوئے سر کو تھوڑی سے اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے پوچھو پاگل لڑکی کہ تم میرے لیے کیا ہو تم میری عزت میری زندگی اور میرے جینے کی وجہ ہو' دیکھو آج ہماری زندگی کی حسین شروعات ہونے جا رہی ہے مجھ سے وعدہ کرو ہمیشہ میرا مان رکھو گی۔''

''جی میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی اور خود کو ہر طرح سے آپ کی پسند میں ڈھال لوں گی' کیونکہ آپ میرے مجازی خدا ہیں میری محبت ہیں اور میرا سائبان ہیں۔''

وہ جھکے ہوئے سر سے محبتوں کا اقرار کر رہی تھی' اس پل عائشہ آریان کو دنیا کی حسین ترین عورت لگ رہی تھی' وہ دل سے اُس کا ہو چکا تھا کہ اس نے آج آریان کا مان بڑھا کر اسے معتبر کر دیا تھا' وہ خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ اسے عائشہ جیسی بیوی ملی جو پہلی ہی رات اس کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ یقین' اعتبار' اعتماد اور محبت کے رنگ میں......!

☆☆......☆☆

چشم دید

ثاقب لکھنوی کا خیال

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا' وہی پتے ہوا دینے لگے

دستگیر شہزاد

قتل کی واردات ہائی کورٹ کے وکیل فیاض کاہلوں کے گھر میں ہوئی تھی۔ اطلاع پاتے ہی تھانہ انچارج غازی پور عمار سیال موقع پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا وکیل صاحب کے گھر میں رہنے



والے کرائے دار ساجد بھٹی کا قتل ہوا ہے۔ عمار سیال نے موقع کا معائنہ کیا۔ لہولہان لاش تیسری منزل پر واقع کمرے کے بیڈ پر پڑی تھی۔ لاش کے پاس ہی بچوں کے کھیلنے والا لکڑی کا کرکٹ بیٹ ٹوٹا پڑا تھا۔ کمرے میں ایک چادر بھی خون سے لت پت ملی تھی۔

تحقیقات سے علم ہوا کہ مقتول نے وکیل فیاض کاہلوں کے مکان کی دوسری اور تیسری منزل کرائے پر لے رکھی تھی۔ جس میں وہ اپنی بیوی پنکی اور چھ سالہ بیٹے آیان کے ساتھ رہتا تھا۔ شوہر کے قتل کے صدمے سے پنکی بے حال تھی۔ عمار سیال نے تسلی ولاسہ دے کر پوچھ گچھ کی تو اس نے یہ بیان دیا۔

''گزشتہ روز یعنی 4 دسمبر 2014ء کی شام کو چار بجے ایک نوجوان میرے شوہر سے ملنے آیا تھا۔ چونکہ اس وقت ساجد بھٹی گھر میں نہیں تھے۔ اس لیے جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ آپ کے شوہر آئیں تو بتا دینا کہ ڈھولکی آیا تھا۔ شام پانچ بجے ساجد بھٹی واپس لوٹے تو' میں نے بتا دیا کہ کوئی ڈھولکی ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے بعد شام چھ بجے ہم تینوں جناح کالونی چلے گئے اور وہاں سے رات گیارہ بجے واپس لوٹے۔''

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ پانچ گھنٹے تک جناح کالونی میں کیا کرتے رہے؟'' عمار سیال نے اُس کو ٹوک کر پوچھا۔

''جناح کالونی میں میرا میکہ ہے۔'' پنکی نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

''میرے بھائی فرید علی کی بیٹی کی سالگرہ تھی' گھریلو پارٹی تھی۔ اس لیے لوگ کھانا کھانے کے بعد گھر آئے تھے۔ کپڑے بدلنے کے بعد ہم تینوں تیسری منزل کے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔ ساجد تو لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ آیان بھی سو گیا' مگر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات بارہ بجے ڈور بیل بجنے پر میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا' ڈھولکی سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان اور تھا۔ ڈھولکی بے حد ضروری کام کا حوالہ دے کر ساجد بھٹی سے ملنے کی ضد کرنے لگا تو میں نے انہیں جگا دیا اور خود چائے لینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔'' اتنا کہہ کر پنکی پھر سسکنے لگی۔

''دو منٹ بعد ہی میں نے ساجد کے چیخنے کی گھٹی گھٹی آوازیں سنیں۔'' پنکی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں کچن سے دوڑ کر بیڈ روم میں گئی۔ میں نے دیکھا۔ ڈھولکی آیان کے بیٹ سے ساجد کے سر پر وار کر رہا تھا۔ میں نے اُن دونوں سے شوہر کو بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دم توڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ پوری رات میں بے ہوش پڑی رہی۔ صبح پانچ بجے بے ہوشی ٹوٹی تو دیکھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ لہٰذا کچن میں جا کر میں نے کھڑکی سے شور مچایا تو مکان مالک اور پڑوسی آئے۔ اِن میں سے ہی کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہو گا۔''

آگے کی تحقیقات میں پنکی نے بتایا کہ ڈھولکی کو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس کے بارے میں ساجد نے کبھی کوئی ذکر کیا تھا۔ پنکی نے اتنا ضرور اعتماد سے کہا کہ ڈھولکی اور اس کے ساتھی کے سامنے آنے پر وہ انہیں پہچان سکتی ہے۔ بہرحال موقع پر قانونی کارروائی کرنے کے بعد عمار سیال نے ساجد بھٹی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اس کے بعد پنکی کو مدعی بنا کر 5 دسمبر

کی صبح نامعلوم اشخاص کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔

ڈھولکی تک پہنچنے کے لیے مقتول کا ماضی اور حال جاننا ضروری تھا۔ عمار سیال نے اپنے طریقے سے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ 48 سالہ ساجد بھٹی آبائی طور سے شورکوٹ کا باشندہ تھا۔ عمار بھٹی نامی اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ سالوں قبل دونوں بھائی روزگار کی تلاش میں ٹوبہ ٹیک سنگھ آئے تھے۔ زندگی کی دوڑ میں عمار بھٹی جہاں پھسل کر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہیں ساجد بھٹی نے کامیابی کی منزل پائی تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس نے نام کے ساتھ دام بھی خوب کمائے۔ ایک این جی او منتظم ہونے کے علاوہ وہ اسٹیج اداکار بھی تھا۔

مذکورہ معلومات سے عمار سیال نے دو نکتے نوٹ کیے پہلا یہ کہ ساجد بھٹی 48 سال کا تھا۔ جبکہ پنکی بمشکل 27'28 سال کی لڑکی تھی۔ دیکھا جائے تو دونوں کی عمروں میں بیس سال کا فرق تھا۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ مقتول اسٹیج سے بھی وابستہ تھا۔ اُن کی ٹولی میں دوسرے کارندوں کے علاوہ ڈھولک بجانے والے بھی ہوا کرتے تھے۔ جنہیں عام بول چال میں ڈھولکی کہتے ہیں۔ عمار سیال نے اسی سمت سے تفتیش آگے بڑھائی تو انہیں معلوم ہوگیا کہ گوجرہ کا رہنے والا انس نامی نوجوان مقتول کے اسٹیج کے پروگراموں میں ڈھولک بجاتا ہے۔ اسی لیے لوگ اسے انس ڈھولکی کہتے ہیں۔ اتفاق سے عمار سیال کو ساجد بھٹی کے رنگارنگ پروگرام کے کچھ ایسے فوٹو مل گئے جن میں انس ڈھولکی موجود تھا۔ عمار سیال نے پنکی کو اُس کا فوٹو دکھا کر شناخت کرائی تو اس نے فوٹو میں دوسرے فنکاروں کے ساتھ نظر آرہے انس ڈھولکی کے چہرے پر انگلی رکھ دی کہ یہی ہے وہ بے رحم قاتل ڈھولکی، جس نے میرا سہاگ اجاڑا ہے۔

عمار سیال نے گوجرہ میں انس کے گھر پر چھاپہ مار کر اسے اٹھالیا۔ تھانہ میں اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے ساجد بھٹی کے قتل والے جرم سے صاف انکار کردیا۔ یہی نہیں اُس نے اپنی بے گناہی کے ثبوت بھی دیے۔ یہ بھی بتایا کہ وہ حادثہ والی رات کہاں تھا۔ عمار سیال نے اُس کے بیان کی تصدیق کرائی تو ساری باتیں سچ ثابت ہوئیں۔

''چلو مان لیا کہ تم نے ساجد بھٹی کو نہیں مارا۔ سچائی کی تہہ تک جانے کے لیے عمار سیال نے انس سے سوال کیا پھر اُس کی گھر والی تمہیں قاتل کیوں ٹھہرا رہی ہے۔''

انس کی آنکھیں خلاء میں تکنے لگیں اور ماضی کی ایک ایک بات اس نے یاد کرکے عمار سیال کو سب بتادیا۔

حادثہ سے پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔ ایک صبح ساجد بھٹی اپنے اسٹیج کے ساتھیوں کے ساتھ ایک پروگرام کو فائنل کررہا تھا اور اس کے بعد ریہرسل بھی ہونا تھی۔ اس میں شام بھی ہوسکتی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے ساجد بھٹی کو اچانک کچھ یاد آیا وہ چونک کے پاس بیٹھے انس کو دیکھنے لگا۔

''گھر میں سبزی گوشت بالکل نہیں ہے۔'' اُس نے انس سے کہا۔

''اور مسالے بھی ختم ہوگئے ہیں۔ پنکی نے صبح صبح لسٹ بنا کر دی تھی۔ میں یہاں پھنس گیا اور شام سے پہلے نکل بھی نہیں سکتا۔ ایسا کرو تم سارا سامان بازار سے خرید کر پنکی کو دے آؤ۔'' یہ کہہ کر اُس نے پنکی کی دی ہوئی لسٹ انس کو دے دی۔ لسٹ میں تحریر سامان خرید کر انس ساجد بھٹی کے گھر

پہنچا تو دوسری منزل والے حصے میں اُسے پنکی نہیں ملی۔ پنکی کو ڈھونڈتا ہوا انس تیسری منزل پر پہنچا تو بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں مگر اندر سیلنگ فین چل رہا تھا۔ پنکی کو بلانے کے لیے انس نے جونہی دروازہ بجانے کو ہاتھ اٹھایا، اُسے مدہوش کن لہجے میں پنکی کی آواز سنائی دی۔ اِس کے بعد کسی مرد کی ہنسی سنائی دی۔ انس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ گھر میں اکیلے ہونے کا فائدہ اٹھا کر پنکی کسی آشنا کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی تھی، انس نے اصل معاملہ جاننے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے کوئی کھڑکی نظر نہ آئی۔ دروازے کے اوپر چھت سے لگا ہوا روشن دان تھا جو کھلا ہوا تھا، مگر پنجوں کے بل کھڑے ہوکر اس سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ انس کی نظر پاس ہی ٹکی سیڑھی پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے تھیلا زمین پر رکھا اور سیڑھی اُٹھا کر روشن دان سے لگادی۔ اب سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا پنکی ایک مرد کے ساتھ موجود تھی، اور دونوں شیطانی جذبات میں مغلوب تھے۔ پنکی مرد کو 'طارق' کہہ کر مخاطب کررہی تھی۔ انس یہ شیطانی منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ تبھی ہوا کا جھونکا آیا اور روشن دان پر جمی دھول اڑ کر اس کے نتھنوں میں سما گئی۔ اس سے انس کو چھینکیں آنے لگیں۔ وہ مسلسل آنے والی اپنی چھینکوں کو روک نہیں سکا۔ چھینکوں کی آواز پنکی اور طارق نے سنی تو اُن کی نظریں روشن دان کی طرف اٹھ گئیں، اور اُس کو دیکھتے ہی دونوں گھبرا گئے انس بھی جلدی سے سیڑھی سے اُتر آیا تھا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' پنکی نے غرا کر پوچھا تھا۔

''میڈم! میں آیا تو تھا گھریلو سامان دینے کے لیے۔'' بے خوف انس نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں کیا معاملہ چل رہا ہوگا۔''

پنکی انس ڈھولکی کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''اندر آؤ۔'' انس پنکی اور طارق کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ پنکی نے بیڈ پر پڑا پرس کھول کر اُس میں سے سو سو کے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں انس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لو اور بھول جاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا؟''

لیکن انس نے پیسے لینے سے انکار کردیا، تب پنکی نے مزید نوٹ دینے کی کوشش کی، مگر انس انکار کرتا رہا۔ آخر پنکی بولی۔

''تو پھر اپنا منہ بند رکھنے کا کیا لوگے؟''

''آپ سے کبھی کبھی ملاقات......!'' اُس نے دیدہ دلیری سے کہا تھا۔

پنکی نے اُسے نفرت سے گھورا جبکہ طارق مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے اُس کی طرف لپکا، دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''طارق جی! مجھ پر حملہ کرنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔'' انس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''ذرا سوچو پورا محلہ تماشا دیکھے گا، لوگ جھگڑے کا سبب پوچھیں گے تو کیا جواب دو گے؟''

ایک لمحے میں طارق کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ پنکی اور طارق انس کو منانے لگے مگر وہ پنکی سے کم پر سمجھوتہ کرنے پر راضی نہیں تھا۔ بچاؤ کا کوئی دوسرا پہلو نہ دیکھ کر پنکی نے فی الوقت انس کی شرط مان لینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان ہی لیتی ہوں۔'' پنکی نے کہا۔ لیکن اِس ملاقات کے لیے

ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے مجھے مہلت دینا ہوگی۔“

”نو پرابلم، بولو کتنے دن کی مہلت چاہیے؟“ انس نے پوچھا۔

”پندرہ دن کی۔“ پنکی نے کچھ سوچ کر کہا۔

”اوکے لیکن سولہویں دن ہماری ملاقات پکی ہونی چاہیے، ورنہ سوچ لینا کہ انجام کیا ہوگا۔“ انس دھمکی دے کر چلا آیا تھا۔

اپنے بیان میں انس نے عمار سیال کو بتایا کہ وہ پنکی کے عاشق طارق کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تین دن پہلے اس نے پنکی کو اپنا وعدہ یاد دلایا تھا۔ جواب میں پنکی مسکرائی تھی اور کہا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

اپنے تجربے سے عمار سیال سمجھ رہے تھے کہ انس ڈھوگی جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اس لیے کچھ پابندیوں کے ساتھ اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اپنے ذرائع سے عمار سیال کو معلوم ہوا کہ تقریباً بیس سال پہلے ساجد بھٹی کی شادی سمندری کی رہنے والی بلّی سے ہوئی تھی۔ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار تھی۔ جناح کالونی میں رہنے والی پنکی کے بھائی بھی اسٹیج پروگراموں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ناطے ساجد بھٹی سے اُن کی قربت تھی۔ ساجد بھٹی کا اُن کے گھر آنا جانا تھا۔ 2004ء میں اُن کے گھر پر ہی ساجد بھٹی نے پنکی کو دیکھا۔ اُن دنوں پنکی غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی بداعمالی کی وجہ سے ماں بننے کے مراحل میں تھی، پنکی کی شرارتی آنکھوں میں جانے ایسا کیا جادو تھا کہ ساجد بھٹی اس پر فدا ہوگیا۔ دل ہی دل میں ساجد بھٹی نے پنکی کی خطاؤں کو بھی معاف کردیا۔ پنکی نے ساجد بھٹی کے سامنے شادی کی یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی بیوی بلّی کو میکے بھیج دے۔ ساجد بھٹی نے وہی کیا جو پنکی چاہتی تھی۔ زور زبردستی سے اس نے بلّی کو طلاق دے کر میکے بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک نرسنگ ہوم میں پنکی کو اُس کے گناہ سے نجات دلائی اور اس سے شادی کرلی۔

پنکی سے شادی کے بعد ساجد بھٹی نے نو پور کے باشندے فیاض کاہلوں ایڈووکیٹ کے مکان کی دوسری و تیسری منزل کرائے پر لے لی اور وہاں رہنے لگا۔ وہیں پر پنکی نے چھ سال قبل آیان کو جنم دیا تھا۔ عمار سیال نے ساجد بھٹی کے پڑوسیوں اور اُس کے اسٹیج کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ کی تو علم ہوا کہ دو تین سالوں سے ساجد بھٹی اور پنکی کی ازدواجی زندگی میں نہ جانے کس سبب سے زہر گھلا ہوا تھا۔ پنکی پوری طرح شک کے دائرے میں تھی۔ اسی دوران یہ بھی خبر ملی کہ پنکی ساجد بھٹی کے قتل کے بعد گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔

پنکی پر قانونی شکنجہ کسنے کے لیے عمار سیال نے سرولانس کی مدد لی۔ اس سے معلومات ملیں کہ یوں تو پنکی کے پاس دو موبائل تھے لیکن وہ ان پر پانچ سم کارڈ استعمال کررہی تھی۔

پنکی نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک وہ شوہر کے قتل کے صدمے سے بے ہوش رہی تھی جبکہ سرولانس کی رپورٹ بتارہی تھی کہ اس نے اپنے موبائل کا سم کارڈ بدل کر ایک نمبر پر تین چار بار بات کی تھی اور اس نمبر سے بھی پنکی کو دو بار کال کی گئی تھی، اس کے بعد سم کارڈ نکال کر دوسرا ڈال دیا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ پنکی کے ہاتھ اپنے شوہر کے خون سے رنگے تھے اور وہ پولیس کو گمراہ کررہی تھی۔ سرولانس سے

آگے کی معلومات سے یہ بھی صاف ہوگیا کہ حادثہ والی رات تقریباً ایک گھنٹے تک اس موبائل کی لوکیشن پنکی کے موبائل کی لوکیشن کے ساتھ تھی۔ مطلب یہ کہ فون کا مالک پنکی کے ساتھ تھا اور یہ موبائل نمبر جاتی والا کے باشندے طارق لودھی کا تھا۔

16 دسمبر 2014ء کو مخبر سے عمار سیال کو اطلاع ملی کہ پنکی ٹوبہ ٹیک سنگھ لوٹ آئی ہے اور مکان خالی کرنے کے لیے سامان پیک کررہی ہے۔ عمار سیال نے بلاتاخیر ماتحتوں کی ٹیم بھیج کر آیان سمیت پنکی کو تھانہ غازی پور بلالیا۔ عمار سیال نے آیان کو الگ کمرے میں لے جاکر پیار سے پوچھ گچھ کی، جس کے جواب میں آیان نے جو بتایا اس کا خلاصہ یہی تھا کہ پنکی اور ساجد بھٹی میں اکثر جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ انہی جھگڑوں کے نتیجے میں پنکی نے طارق لودھی انکل کے ساتھ مل کر ساجد بھٹی کو جان سے ماردیا۔

انسپکٹر عمار سیال نے پنکی کے خلاف سارے ثبوت سامنے رکھ کر اس سے پوچھ گچھ کی تو احساسِ جرم سے اس نے اپنا سر جھکالیا۔ اس کے بعد پنکی نے جو بیان دیا اس سے واقعہ کی تصویر صاف ہوگئی۔

ایک دن طارق لودھی اور پنکی کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے انس نے دیکھا تو اس نے بھی پنکی کو حاصل کرنے کا مطالبہ کردیا۔ پنکی انس کی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے ذہنی طور سے تیار ہونے کے بہانے پندرہ دن کی مہلت لے لی۔ طارق لودھی اور پنکی کی محبت جنون پر تھی۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ساجد بھٹی تھا۔ اس کے ساتھ انس بھی درمیان میں ٹپک پڑا تھا۔ اس لیے دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ساجد بھٹی کو قتل کرنے اور اس جرم میں انس ڈھوگی کو پھنسانے کا فیصلہ کرلیا۔

منصوبے کے مطابق 4 دسمبر کی شام کو طارق لودھی ٹوبہ ٹیک سنگھ آگیا۔ چونکہ اُسے پنکی کا پروگرام معلوم تھا۔ اس لیے وہ ڈہانوالہ ریلوے اسٹیشن پر ہی رُکا رہا۔ رات کے گیارہ بجے پنکی اپنی بھتیجی کی برتھ ڈے پارٹی سے گھر لوٹی اور ساجد بھٹی لیٹتے ہی سوگیا تو پنکی نے طارق لودھی کو فون کرکے بلالیا۔ ایک گھنٹے میں طارق لودھی آگیا۔ پنکی اسے بیڈروم میں لے گئی۔ طارق لودھی نے بے سدھ سوئے ہوئے ساجد بھٹی کے منہ پر تکیہ رکھ کر اس کا دم گھونٹنے کی کوشش کی مگر جان بچانے کے لیے ساجد بھٹی نے طارق لودھی کا انگوٹھا چبالیا۔ طارق لودھی تکلیف سے چیخ اٹھا۔ محبوب کو تکلیف میں بلبلاتے دیکھ کر پنکی نے شوہر کے بال پکڑ کر اس کا سر پیچھے کھینچا۔ ساجد بھٹی کا منہ کھلا تو اس کے منہ سے طارق لودھی کا انگوٹھا نکل گیا۔ غصے سے بوکھلا کر طارق لودھی نے کرکٹ بیٹ اُٹھا کر اندھا دھند وار کرکے ساجد بھٹی کا سر پھاڑ دیا۔ اس کے بعد چادر سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ساجد بھٹی کی موت سے مطمئن ہونے کے بعد طارق لودھی بیڈروم کا دروازہ باہر سے بند کرکے چلا گیا تھا۔

پنکی نے عمار سیال کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس دن طارق لودھی بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ آیا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی نشاندہی پر طارق لودھی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ 17 اگست کو پنکی اور طارق کو عدالت میں پیش کیا گیا جہاں سے وہ جیل بھیج دیے گئے۔ تادم تحریر دونوں اپنے جرم کی سزا پانے کے لیے جیل میں تھے۔

☆☆.....☆☆

خون کا رشتہ

فرحت عباس شاہ کی فکر

> تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دُکھ
> تُو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

نسیم سحر

"ارے بدبخت چپ ہو جا بے شرم کچھ تو لحاظ کر لے بہن ہے تیری۔" اماں نے مشتاق کو لتاڑا جو منی کے لپ اسٹک لگا کے کام پر جانے پر اُس کو باتیں سنا رہا تھا۔



"بس اماں یہ تمہاری ہی ڈھیل ہے جو یہ اتنا بکواس کرتی ہے ورنہ کون اپنے بڑے بھائی کو جواب دیتا ہے۔" مشتاق نے جواباً اماں کو بھی سنا دیں۔

"کیا بکواس کی ہے میں نے؟ بتانا ذرا؟" منی نے بھی دوبدو سوال کیا۔

"بس چپ ہو جا ورنہ یہ کھینچ کے ماروں گا۔" مشتاق نے پانی پیتے ہوئے جو گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا وہیں سے منی کو دھمکانے کے لیے دکھایا۔

"ہاں ہاں! مارو مگر یہ سوچ لینا کہ تمہارا کیا ہوگا؟" منی نے للکارا۔

"چل بس رہنے دے خود کو کیا سمجھتی ہے تو نہیں ہوگی تو کیا ہم بھوکے مرجائیں گے؟" مشتاق استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"ایسا ہی ہوگا کوئی مفت میں نہیں کھلاتا ہڈ حراموں کو۔" منی بھی چپ رہنے والی کہاں تھی اور پھر آ...... آ...... منی نے اچانک چیخ ماری اور ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھتی چلی گئی۔ مشتاق نے اُس کے ہڈحرام کہنے پر وہ سلور کا گلاس دے مارا تھا' جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"ارے خبیث تجھے خدا کی مار' بدبخت غرق ہو کہیں۔" اماں نے مشتاق کو چپل کھینچ ماری جس سے وہ بچتا ہوا باہر نکل گیا۔

اماں منی کو اٹھانے لگیں جس کے ماتھے پر فوراً ہی گومڑ نکل آیا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی دوپٹہ منہ پر رکھ کر گرم سانسوں سے پھونک ماری اور منی کے ماتھے پر ٹکور کرنے لگیں۔

"دیکھ لے اماں سارا دن محنت کر کے اِس گھر کو چلاتی ہوں' اور گالیاں بھی کھاتی ہوں۔" منی اب رونے لگی تھی۔

"چپ ہو جا میری بچی۔" اماں نے منی کو اپنے گلے سے لگالیا۔

"میں کیا کروں اُس خبیث کا' ہزار دفعہ کہا کہیں دفع ہو جا مگر یہ تو ہماری جان لے کے چھوڑے گا۔ تو اُس کے منہ نا لگا کر' بس چپ ہو جا۔" اماں نے اُس کا سر تھپکاتے ہوئے کہا تھا۔

☆......☆......☆

یہ ایک کچی بستی کے دو کمروں والے گھر کی روز کی کہانی تھی' جس کے چار نفوس تھے۔ اماں' ابا' مشتاق اور منی' جب تک ابا رہے وہ گھر چلاتے رہے' مشتاق کے لیے انہوں نے بہت جتن کیے مگر نہ اُس نے پڑھ کر دیا اور نہ کام پر لگا۔ ابا نے اُسے کسی کی دکان پر بٹھایا وہاں سے بھاگ آیا' پھر گیراج میں لگایا وہاں بھی چار دن کام کر کے چھوڑ دیا' وہ سارا دن اپنے دوستوں میں بیٹھا رہتا' ابا بیچارے اس فکر اور ٹینشن میں گھلتے رہے کہ میرے بعد بیوی اور منی کا کیا ہوگا۔ اور اسے ساتھ لیے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے' ابا کے جانے کے بعد گھر کے معاشی حالات بہت خراب ہو گئے' مشتاق سدا کا لاپرواہ تھا' اماں نے ہی کچھ گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا اور جیسے تیسے زندگی کی گاڑی پھر رواں ہوگئی' وہ تو شکر تھا کہ فیملی چھوٹی تھی اور گھر بھی اپنا تھا اس لیے روکھی سوکھی کھا کر بھی زندہ رہنے کی کوشش کامیاب رہی' منی یہ سب حالات دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی تھی' اُس کا دل اماں کو کام کرتا دیکھ کر بہت دکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب آٹھ جماعتیں پڑھ چکی تو اُس نے اسکول چھوڑ کے گھر سنبھال لیا کہ اماں کا بوجھ کسی طرح کم ہو' ورنہ باہر کے کام کرنے کے بعد آ کے

بھی اماں آرام سے بیٹھ نہ پاتی تھیں۔
''منی تو نے خواہ مخواہ پڑھائی چھوڑی' بیٹا دس جماعتیں تو پڑھ لیتی۔'' اماں کو منی کے پڑھائی چھوڑنے کا بہت دکھ تھا۔
''رہنے دے اماں ہم جیسے لوگ دس کیا بیس جماعتیں بھی پڑھ جائیں نا تو بھی کچھ فائدہ نہیں' تو فکر نہ کر بس آرام کر' اب میں کرلوں گی سب۔'' منی نے اماں کو تسلی دی اور خود روٹی پکانے لگی۔

☆......☆......☆

اماں اب تھکنے لگی تھیں اس لیے منی نے ایک دن چپکے سے پڑوس کی ذکیہ باجی جو گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی تھیں سے اپنے لیے بھی کام کے لیے کہا' جنہوں نے دو چار دن کے بعد ہی منی کو خوشخبری سنا دی کہ اُن کے ہاں دھاگے کاٹنے کے لیے کچھ لڑکیوں کی ضرورت ہے' اور انہوں نے منی کی بات کی ہے اپنے مالکان سے۔
''ارے منی تو کیسے کرے گی نوکری' میری بچی ابھی تو بہت چھوٹی ہے۔'' اماں کو جب پتہ چلا تو انہوں نے اُسے روکنا چاہا۔
''نہیں اماں مجھے نوکری کرنے دے' بھائی سے تو کوئی امید نہیں ہے اور تم بھی تو اب بہت تھک جاتی ہو بس جیسے ہی میری نوکری لگے تم کام چھوڑ دینا۔'' منی نے اماں کے ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اماں ابھی کام سے آ کے چارپائی پر لیٹی تھیں۔
''مگر......'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔
''بس اماں تو مجھے ہی اپنا بیٹا سمجھ لے۔'' منی نے اماں کو تسلی دی تو وہ منی کو دیکھتی رہ گئیں اُن کی بیٹی کتنی حساس اور سمجھدار تھی اور ایک وہ نکما جس نے ایک دھیلا بھی کما کے نہ دیا' ایسا نہیں تھا کہ وہ غلط صحبت کا عادی یا کسی نشے میں گرفتار تھا' بس وہ کام چور تھا نوکری اُس سے ہوتی ہی نہ تھی اور ایسے میں اگر کوئی اُسے طعنہ مارے تو بس برداشت نہ ہوتا تھا' ورنہ وہ اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔

☆......☆......☆

منی نے نوکری شروع کردی تھی گھر کے حالات میں تھوڑا سا ہی فرق پڑا تھا۔
''آئے ہائے نور جہاں اب کیا بیٹی سے نوکری کرواؤ گی؟'' پڑوس کی خالہ ناک پر ہاتھ رکھے اماں سے پوچھ رہی تھیں۔
منی نے آنکھ کھولتے ہی انہیں دیکھا تھا وہ بالکل اماں کی سگی بہن کی طرح تھیں ہر دکھ سکھ میں شریک اور ویسے بھی چھوٹے علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان اپنائیت زیادہ ہوتی ہے اور وہاں کے رہنے والے ایک دوسرے کے گھریلو معاملات میں بھی ایسے رائے دیتے ہیں جیسے یہ اُن کے گھر کا ہی مسئلہ ہو' یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے دو چار دن تک منی کو روزانہ ایک مخصوص ٹائم پر آتے جاتے دیکھا تو فوراً پہنچ گئیں' اتوار کا دن تھا منی گھر پر ہی تھی۔
''ہاں! تو خالہ کیا کریں اماں سے تو اب کام نہیں ہوتا پھر کون کھلائے گا ہمیں؟'' اماں کے بجائے منی نے جواب دیا۔
''ائے وہ مشتاق نکما کہاں گیا اُس کو بولو وہ کیوں نہیں کرتا کام۔'' خالہ نے جواباً کہا۔
''خالہ تم جانتی تو ہو سب' پھر بھی یہ بات کہہ رہی ہو۔'' منی نے شکوہ کیا۔
''ارے مجھے کب شوق ہے اپنی بچی سے نوکری کرانے کا وہ خبیث کسی کام کا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' اماں نے آہ بھری۔
''میں تو کہتی ہوں اُس کی شادی کرا دے دیکھنا کیسا تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔'' خالہ نے اپنے طور پر مسئلے کا حل پیش کیا۔
''ناجی نا میں کسی کی بیٹی کو کیوں کنویں میں دھکیلوں' اس نکمے ہڈ حرام سے بیاہ کر۔'' اماں تو بہت ہی مایوس تھیں۔ ''میرے بھی آگے بیٹی ہے۔''
''خالہ ہم تو چاہتے ہیں کہ بھائی کوئی کام کاج کرے' اُس کا گھر بس جائے' مگر بھائی کو خود ہی کوئی خواہش نہیں' اگر اُسے دلچسپی ہوتی تو کام کرتا۔'' منی نے سمجھایا تو پھر خالہ بھی چپ ہو گئیں۔

☆......☆......☆

وقت کسی کے لیے بھی کبھی نہیں ٹھہرتا اُس کا کام بھاگنا ہے اور وہ بھاگا جا رہا ہے' اِس بات سے بے خبر کہ کسی کو کیا ملتا ہے اور کیا چھن جاتا ہے۔ ایک دن اماں کو چکر آیا اور وہ غسل خانے میں گر گئیں' خالہ اور مشتاق فوراً اماں کو اسپتال لے گئے مگر بڑھاپے کی چوٹ خطرناک ثابت ہوئی' اماں کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور یہ شدید چوٹ لگنے سے اماں ہمیشہ کے لیے بستر پر پڑ گئیں۔
غربت بھی اپنا وار غریبوں پر ہی کرتی ہے منی بے انتہا گھبرا گئی اب کیا ہوگا اماں کو کون دیکھے گا؟ گھر کا کام الگ؟ منی نے ہفتے بھر کی چھٹی لے لی تھی' اُسے پتہ تھا کہ اِس چھٹی کے پیسے کٹیں گے' گر میں اماں کے پاس رہوں تو پھر گھر کیسے چلے گا منی باورچی خانے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔
''اب میں ایسا کروں گی صبح ہی صبح اٹھ کر کام کرلیا کروں گی اور شام میں واپس آ کر کھانا بنالیا کروں گی' اور خالہ کو کہہ دوں گی دن میں اماں کو دیکھ لیا کریں۔'' منی نے دل ہی دل میں اپنے سارے دن کا معمول بنالیا' کیونکہ اُسے کل سے کام پر جانا تھا۔ ابھی ابھی ذکیہ باجی کہہ گئیں تھیں کہ اُس کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور کل سے کام پر آنا ہے۔

☆......☆......☆

منی نے صبح اٹھ کر جلدی سے اماں کو چائے دی اور خود بھی ساتھ ہی چائے کے ساتھ دو پاپے کھالیے پھر جلدی سے اماں کے لیے دو روٹیاں ڈال کر اماں کے قریب ہی رکھ دیں تاکہ اماں خود اٹھا کے کھا سکیں ۔مشتاق سو رہا تھا منی خالہ کو اماں کا خیال رکھنے کا کہا اور کام پر چلی گئی۔
فیکٹری میں بھی سارا دن منی کو اماں کا خیال ہی آتا رہا شام کو چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگی گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کو کچھ اچھا سا احساس ہوا' مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ سیدھی اماں کے پاس گئی تو اماں اُسے دیکھ کر مسکرائیں تو اُس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا اُس نے اردگرد نظر دوڑائی تو گھر صاف ستھرا لگا' اماں کے پاس دوسری چارپائی پر مشتاق لیٹا ہوا تھا' منی نے اماں کو دیکھنے کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا ابھی وہ آٹا گوندھنے کے لیے نکالنے ہی لگی تھی۔
''میں نے آٹا گوندھ دیا ہے۔'' مشتاق کی آواز پر منی نے مڑ کے دیکھا اُس کی نظروں میں حیرت دیکھ کر وہ بولا۔
''منی تو جانتی ہے مجھ سے نوکری نہیں ہوتی میں شرمندہ ہوں تجھ سے اور اماں سے' مگر اب تو بالکل فکر نہ کر' اماں کو اور گھر کو میں دیکھ لوں گا۔'' منی یہ سب باتیں سن کر حیران کھڑی تھی۔
''منی تو مجھے ایسے نہ دیکھ میں مانتا ہوں میں نے تم لوگوں کو بہت تنگ کیا ہے۔ مگر اب تو دیکھنا بس گھر کی طرف سے پریشان نہ ہو' اور دیکھنا اماں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔''
منی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے آخر تھا تو وہ اُس کا بھائی ہی نا' کیسے نا تڑپتا ماں بہن کی تکلیف پر' پھر مشتاق نے جو کہا کر دکھایا وہ اماں کو کھانا کھلا دیتا۔ گھر کی صفائی بھی کرلیتا اور سالن بھی جیسے تیسے

بنالیتا' منی صبح اٹھ [illegible]
کرتے' پھر وہ کا [illegible]
روٹی بناتی تھی۔ [illegible]
بہت مطمئن ہوگئ [illegible] کم
ہوگیا تھا۔

کئی سال گزر گئے منی اور اس کے گھر کا وہی معمول تھا اماں اب دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھیں' [illegible] کی فکر بھی تھی' جس کی عمر اب آہستہ [illegible] ی خالہ نے کئی رشتے بتائے تھے مگر [illegible] سا گھر اور اُس میں پڑا معمولی سامان آنے والوں کو بتا دیتا کہ اس گھر سے صرف لڑکی ہی آئے گی لہٰذا وہ پلٹ کر نہ آتے' گو کہ منی کی خواہش تو تھی کہ اُس کا گھر بس جائے مگر اماں کو کون دیکھے گا؟ اس سوال نے اُس کے اس خواب کو بھی ختم کر دیا تھا اور اس نے خالہ کو اب کوئی بھی رشتہ لانے کا منع کر دیا تھا' اماں جان گئی تھیں کہ اُن کی وجہ سے شاید اُن کی بیٹی کا گھر نہ بسے گا اس لیے وہ ایک دن چپکے سے دنیا سے منہ موڑ گئیں' یہ صدمہ دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کے سہارے جھیل لیا تھا۔

☆......☆......☆

منی کی اب وہی روٹین تھی البتہ مشتاق میں جو بدلاؤ آیا تھا وہ برقرار رہا وہ اب منی کا بھی بہت خیال رکھتا تھا زیادہ وقت گھر میں رہتا' منی کی شدید خواہش تھی کہ وہ گھر میں رہے اور بھائی نوکری کرے' مگر اب تو عرصہ ہوگیا تھا کہ وہ یہ خیال آنے پر سر جھٹک دیتی تھی۔

منی اب بتیس کی ہوگئی تھی برسوں بعد خالہ منی کے لیے پھر ایک رشتہ لے کے آئی تھیں' فیروز احمد کی بیوی مر چکی تھی اور ایک بچی تھی شریف آدمی تھا خالہ کا اصرار تھا کہ منی ہاں کر دے مشتاق نے بھی اُسے سمجھایا۔

''منی وہ اچھا آدمی ہے' میں اُس سے مل آیا ہوں' بس تو اللہ پر بھروسہ رکھ سب ٹھیک ہوگا دیکھ تیری عمر اگر زیادہ ہوگئی تو پھر بہت مشکل ہوگا تو [illegible] ہے نا میں کیا کہہ رہا ہوں' ہمارے گھر کے میں یہ رشتہ غنیمت ہے۔''

منی نے ہاں کر دی نکاح سادگی سے کرنا تھا بس تھوڑی بہت تیاری ہونے لگی منی خالہ کے ساتھ جا کر کچھ ضرورت کی چیزیں لے آئی تھی' مشتاق بہت خوش تھا اور بھاگ بھاگ کے کام کر رہا تھا کہ ایک دن اسی طرح بازار سے کچھ سامان لاتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا گیا موقع پر موجود لوگ اسے اسپتال لے گئے منی کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ فوراً ہی خالہ کے ساتھ اسپتال پہنچی اور بھائی کو خون میں لت پت دیکھ کر بے ہوش ہوگئی اور پھر اُسے ہوش میں آنے پر پتا لگا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی ضرب لگی ہے کہ اب اُس کا نارمل انداز میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ناممکن تھا' یہ جان لیوا خبر سن کر منی کی چیخ ہی تو نکل گئی اُس وقت فیروز احمد بھی وہاں موجود تھے' انہوں نے اس دوران میں منی کا بہت ساتھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

مشتاق اب اسپتال سے گھر آگیا تھا اس افراتفری میں منی کے نکاح کی تاریخ بھی سر پر آگئی تھی۔

''بیٹا کچھ یاد ہے نا کل......!'' خالہ کہتے کہتے رُک گئی تھیں۔

''ہاں یاد ہے۔'' منی نے بالکل ٹھنڈے اور سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''بیٹا بتاؤ پھر کیا کروں؟'' خالہ نے اُس کے بال سمیٹتے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''فیروز کا فون آیا تھا۔''

''خالہ آپ انہیں منع کر دیں۔'' منی آہستہ سے [illegible] سنبھلے۔

[illegible] حیران ہوئیں۔

[illegible] عنی؟''

[illegible] ہی ہوں' میں بھائی کو اس [illegible] نہیں جاسکتی۔'' خالہ نے بہت سمجھایا مشتاق نے بھی بہت زور دیا۔

''منی مجھے اور شرمندہ نہ کر میں نے ساری زندگی تیرے لیے کچھ نہیں کیا اب میں تیری یہ خوشی نہیں چھین سکتا' دیکھ منی انکار نہ کر۔'' مگر منی کا فیصلہ اٹل تھا۔

''بیٹا تو نے بہت مشکل فیصلہ کیا ہے' خدا تیری مدد کرے۔'' خالہ نے منی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور چلی گئیں۔

☆......☆......☆

خالہ نے فیروز احمد تک منی کے انکار والی یہ بات پہنچا دی تھی' اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔

''ہونہہ......'' منی استہزائیہ سی ہنسی تھی۔

''اللہ نے میرے نصیب میں کوئی خوشی لکھی ہی نہیں ہے۔'' رات کو آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔

منی کے شب و روز پھر سے وہی ہوگئے' وہ صبح بھائی کو ناشتہ کرا کے کام پر چلی جاتی اور شام میں آ کے کھانا پکاتی' مشتاق بہت مشکل اور تکلیف سے لنگڑا لنگڑا کے کام کرنے کی کوشش کر لیتا تھا' جس پر منی اسے بہت منع کرتی تھی مشتاق بہن سے بہت شرمندہ تھا اکثر وہ اُس کا اظہار بھی کرتا تھا اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ منی کی خوشی کے لیے کیا کرے۔ اس دوران میں خالہ اکثر اُن کے گھر کا چکر لگاتی تھیں۔

ایک دن منی گھر آئی تو خالہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

''سلام خالہ......'' اُس نے تھکی سی آواز میں کہا

XXXXXXX XXXXXXX

غزل

اک شخص ترے عشق میں بدنام بہت ہے
اے جانِ وفا بس یہی انعام بہت ہے

ہر شخص ہے کیوں سنگ بکف دیکھ تو ساقی
کیوں آج ترے رند پہ الزام بہت ہے

شاید کہ تری یاد کی مجلس ہوئی برپا
کیا ہے کہ مرے سینے میں کہرام بہت ہے

کس کو ہے تمنا کہ ملے عمرِ خضر کی
اک لمحہ ترے ساتھ سرِ شام بہت ہے

پینے کے لیے رندوں کو میخانہ ہے درکار
مجھ کو تو نگاہوں کا تری جام بہت ہے

بے فکر ہوں ہوتا رہے دشمن یہ زمانہ
مولا کا مرے واسطے بس نام بہت ہے

برکات ہاشمی ناشاد

XXXXXXX XXXXXXX

اور وہیں بیٹھ گئی۔

''جیتی رہ میری بچی۔'' خالہ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔''

''ہاں خالہ.....!'' منی نے لمبی سانس لی۔

''اللہ بخشے صغرا کو بہت اچھی تربیت کی ہے تم دونوں کی۔'' خالہ نے بات کا آغاز کیا۔

''جتنا تو بھائی کا خیال رکھتی ہے اسے بھی تیرا اتنا ہی خیال ہے۔ وہ کڑھتا رہتا ہے تیرے لیے۔'' خالہ نے وقفہ لیا۔

''پر بیٹا تو ایسا نہ کر کچھ اپنے لیے بھی سوچ۔''

''کیا کروں خالہ سب کچھ تو تمہارے سامنے ہے' میں بھائی کو کس کے سہارے پر چھوڑ کے چلی جاؤں؟'' منی نے آہستہ سے کہا۔

''بیٹا اس کا ایک حل ہے۔'' خالہ نے اُس کو بغور دیکھا۔

''کیا؟'' منی نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

''وہ یہ کہ تم شادی کر کے یہی رہو۔'' خالہ کا جواب سن کر منی پھر حیران ہوئی۔

''کیا کہہ رہی ہو خالہ وہ کیسے ہوگا۔''

''وہ ایسے کہ آپ اپنے بھائی اور میری بیٹی کو سنبھالنا اور میں تم سب کو' ہم سب مل کے بھی تو رہ سکتے ہیں نا۔'' آواز پر منی ایکدم اچھل پڑی' منی کے گھر میں مشتاق کے ساتھ کمرے میں موجود فیروز احمد اب باہر آ کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''آپ۔'' وہ ایک دم گھبرا گئی۔

''جی میمونہ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اتنا خود غرض ہو سکتا ہوں اپنے گھر کو بسانے کے لیے کسی کو بھی پریشان کروں' مجھے تمہاری پریشانی اور قربانی دونوں کا احساس ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں' اور اس کا حل میں نے یہ سوچا ہے کہ اپنا گھر کرایہ پر دے کر یہاں تم لوگوں کے ساتھ رہوں' تم نوکری چھوڑ دو اور صرف گھر سنبھالو باقی سب میری ذمہ داری' کیوں اب تو منظور ہے نا؟''

منی نے نظریں اٹھائیں' فیروز کی آنکھوں میں سچائی نظر آئی تھی۔

''ہاں کر دے بیٹا!'' خوشی بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ خالہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''منی اب انکار نہ کرنا' دیکھ فیروز بھائی خود چل کر آئے ہیں اور کیا تو چاہتی ہے کہ میں بھی اماں کی طرح تجھے خوش دیکھے بغیر اس دنیا سے چلا جاؤں؟'' مشتاق نے بھی رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ نہ کرے بھائی۔'' منی نے گھبرا کے کہا۔

مشتاق اپنی وہیل چیئر چلاتا ہوا آ گیا تھا۔

''تو بس پھر ہاں کر دے۔''

میمونہ ایک دم رونے لگی' خالہ نے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

''بس بیٹا اب رونا نہیں۔''

اور پھر چند روز بعد محلے کے قریبی لوگوں کی موجودگی میں' میمونہ عرف منی کا نکاح فیروز احمد سے ہو گیا' فیروز نے اپنا گھر کرایہ پر دے دیا اور خود وہیں آ گیا' منی نے نوکری چھوڑ دی کیونکہ اب اُسے اس کی ضرورت ہی نہ تھی' اب وہ صبح سب سے پہلے گڑیا کو اسکول بھیجتی' پھر فیروز کو ناشتہ کرا کے کام پر روانہ کرتی' اس کے بعد دونوں بہن بھائی ناشتہ کرتے' پھر منی اپنے گھر کو سنبھالنے میں لگ جاتی' گنگناتی ہوئی منی کو گھر کے کاموں میں مگن دیکھ کر مشتاق اللہ کا شکر بجا لاتا کہ اُس کے صحیح فیصلے نے اُس کی بہن کی زندگی میں خوشیاں بھر دی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ اب تو اُس جہاں میں موجود اماں نے اُسے یقیناً معاف کر دیا ہوگا.....!

☆☆......☆☆



نیا سلسلے وار ناول

ایک بہت ہی خاص منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر

ریشم کے دھاگے

(دوسری قسط)

غیاث الدین غیاث کا خیال

> تقاضہ وقت کا ہے یہ کہ لکھو
> لکھیں گے ہم کہ ہم راقم ہوئے ہیں

روشانے سبطین مہاروی

جم کرنے کے بعد وہ ابھی اپنے روم میں آیا ہی تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر بے دردی سے ناول اچھالا اور کانوں سے ہیڈ فون اتارے، اُس کا موڈ بے حد آف ہو رہا تھا۔ صبح صبح بازغہ سے ہوئی بحث نے اُسے سخت کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔

''کیا سبھی لڑکیاں اتنی ہی جھگڑالو ہوتی ہیں؟ او گاڈ، پلیز سیو می۔'' وہ بھنوئیں اُچکاتا ہوا بڑبڑایا اور اسنیکرز کے تسمے کھولتے ہوئے اپنے پیروں کو آزاد کر کے خود کو قدرے ریلیکس کیا۔

سامنے دیوار پر انتہائی نفیس وڈ ورک کیا گیا تھا، جس میں فل سائز Curved LED بہت مہارت سے آویزاں کی گئی تھی، اور ساتھ ہی ڈی وی ڈی DVD پلیئر رکھا گیا تھا۔ وڈ کا منقش کام اتنی باریک بینی اور نفاست لیے ہوئے تھا کہ ایک لمحہ کو دیکھنے والے سحر زدہ ہو جاتے۔ اُس میں مدھم مدھم لائٹس یوں نصب کی گئی تھیں، جیسے کسی دیوالی میں بہت سے روشن ٹمٹماتے دیے ایک ساتھ رکھ دیے ہوں۔ اُس نے اپنے کمرے کا انٹیریئر خود کیا تھا، جس میں روایتی پن کے احساس کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ جدت کا حسین امتزاج بھی کیا گیا تھا۔ اُس میں بلا کی Aesthetic Sense تھی۔

اب وہ کاؤچ پر نیم دراز تھا، ہاتھ بڑھا کر لکڑی کی گول تپائی سے ریموٹ اٹھایا، اور میوزک سسٹم آن کیا۔ کمرے میں Beyonce (امریکن سنگر) کی خوبصورت آواز گونجنے لگی۔ وہ میوزک کا رسیا تھا۔ اُس کے پاس دنیا کی بہترین میوزک کلیکشن تھی۔ دفعتاً موبائل کی بیپ نے اُس کا ارتکاز توڑ دیا۔

اُس نے کسلمندی سے موبائل فون اٹھایا تو بازغہ کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ اُس کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

''کچھ کسر رہ گئی ہے؟'' رابطہ بحال ہوتے ہی وہ اُس پر برسنے لگا۔ خوب کلاس لینے کا مقصد کیا، دوسری طرف وہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔

''او...... کم آن یار...... پلیز نو مور ٹینشن......'' وہ چڑ گیا۔

''میں جانتا تھا کہ اب تم ضرور رونا دھونا مچاؤ گی' آئی نو ویری ویل...... ایکچوئلی تم سب لڑکیاں پاگل ہوتی ہو۔ پہلے خود ہی لڑتی ہو' اور پھر خود ہی مظلوم بن جاتی ہو۔ آئیم سک آف دس۔'' اُس کے غصے کا گراف ذرا بھی نیچے نہ آیا۔

''آئم سوری معید...... مجھے یکدم ہی اتنا زیادہ غصہ آ گیا تھا۔ جب بھی میں تم سے بچھڑنے کا سوچتی ہوں...... میری جان نکلنے لگتی ہے' سمجھ نہیں آتی کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔'' بے بسی سے کہتے ہوئے اُس کی آواز رُندھ گئی۔

اور معید خان...... اُس کے چہار سو جیسے جلترنگ بجنے لگے۔ کمرے کی ہر شے جیسے مسکانے لگی۔ سازِ محبت اُس کے وجود کے گرد رقصاں تھے۔ جس کے آنسو بھی اُسے نرم نہیں کر پائے تھے' اُس کی چاہت کے اِس معصوم اظہار پر وہ یکدم نرم پڑ گیا تھا۔ اُس کے غصے کی آتش کو محبت کی ٹھنڈی میٹھی پھوار نے لمحوں میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔

''کیا ہو جاتا ہے میری جان کو؟'' اُس کے تیور ہی نہیں' اُس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ یہ بے باکانہ اندازِ تکلم بازغہ کو پانی پانی کر گیا۔

وہ فطرتاً ہی شرمیلی تھی۔ تین سال میں اُس نے معید خان کے سامنے کبھی کھل کر اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بے ساختگی میں یہ کیسی بے اختیاری ہو گئی تھی؟ وہ بری طرح بلش کر گئی۔ اُس کی خاموشی پر معید خان گویا ہوا۔

''اگر مجھے اظہار کا یہ لمحہ نصیب ہو گیا ہے تو جاناں اپنے جذبوں کو آج اذنِ گویائی دے دو...... یہ کترانا کیوں...... یہ شرمانا کیسا؟ یہ گھبراہٹ کیونکر؟ تمہارا ہوا ہوں' پورے دل و جان کے ساتھ...... تو مان لو ناں کہ تم بھی میری ہو...... میری بننا چاہتی ہو......'' وہ جادوئی لمحوں کا اسیر ہونے لگا۔ اُس کا پُرفسوں لہجہ بازغہ جدون کے ہوش اڑا گیا۔

''معید خان...... پلیز......'' وہ بے بسی سے بولی۔

''جانِ معید......'' وہ تڑپا۔

''تم بہت برے ہو۔'' وہ خفا ہوئی۔

''اور تم بہت اچھی۔'' وہ جیسے تھک گیا۔ چاہتوں کی شدتوں کا بوجھ ڈھونا آسان کہاں تھا۔

''معید خان...... محبت اعزاز ہوتی ہے' اور جب انسان یہ آگہی رکھتا ہو' کہ اپنے محبوب کے لیے وہ صرف محبت کے آسمان پر چمکنے والا ستارہ نہیں' بلکہ پورا آسمان ہے تو اُس کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔'' وہ ناصحانہ انداز میں کہہ رہی تھی' حرف حرف میں اَن دیکھا کرب آشکار تھا۔ لیکن میرے نصیب میں شاید ہر خوشی ادھوری ہے۔ میں حرماں نصیب' تمہاری محبت پر نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت احساس جرم بھی لیے ہوئے ہوں۔'' درد کی اوس میں بھیگا لہجہ معید خان کو بے کل کر گیا۔

''بازغہ جدون! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا' محبت بھیک نہیں ہوتی' کہ کسی کی جھولی میں یونہی ڈال دی جائے۔ سارا کھیل نصیب کا ہے' اِس دل نے صرف تمہارے لیے دھڑکنا سیکھا ہے۔ تمہارا عشق لہو میں

حلول کر گیا ہے' میری دھڑکنیں صرف تمہارے نام کی مالا جپتی ہیں تو اِس میں میرا کیا قصور...... میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہیں بھی پریشے خان آفریدی نہیں لکھی۔'' معید خان کا لہجہ آنچ دے رہا تھا۔

''لیکن...... میں بہت گلٹ میں ہوں معید......! پریشے جیسی پیاری لڑکی کا حق چھین رہی ہوں' وہ لڑکی کھرے سونے جیسی ہے...... جس کا کوئی مول نہیں...... پھر میں اِس جرم کی مرتکب کیسے ہو گئی؟ یہ احساسِ جرم مجھے چین نہیں لینے دیتا۔'' وہ سخت مضطرب تھی۔

''پریشے خان کا مجھ پر کبھی کوئی حق نہیں رہا' اور نہ ہی میں نے اُسے کبھی یہ حق دیا...... کبھی ہلکا سا کوئی اشارہ بھی نہیں' کہ میں اپنے دل کے گوشۂ خاص میں اُسے کوئی خاص مقام دیتا ہوں۔ اُس کا مجھ سے منسوب ہونا' خاندان کے بڑوں کا محض ایک جذباتی فیصلہ تھا اور کچھ نہیں...... اور' یہ سب میں تمہیں بارہا سمجھا چکا ہوں۔'' وہ عاجز آ گیا تھا۔ سوحتمی انداز میں دوٹوک بات کر رہا تھا۔ پچھلے کئی دن سے اُن کے درمیان یہ موضوع تناؤ کا باعث بنا ہوا تھا۔

''معید! لڑکیاں بہت نازک اور حساس دل کی مالک ہوتی ہیں' وہ بچپن سے تم سے منسوب ہے...... اُس نے جانے کتنے خواب تمہارے نام کے اپنی پلکوں تلے سینت رکھے ہوں گے۔'' اُس کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

معید خان آفریدی کے ضبط کا پیمانہ چھلکنے کو بے تاب تھا۔ ماتھے کے بل مزید گہرے ہو گئے۔

''او...... پلیز...... زیادہ سینٹی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے بازغہ کو بری طرح جھڑک دیا۔

''وہ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے...... وہ بے حد Sensible اور میچور ہے' اور بہت Understanding بھی...... یقیناً اُس کے لیے بھی یہ بچپن کی منگنی وغیرہ جیسی فرسودہ روایات کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہوں گی اور میں مانتا ہوں کہ پریشے بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہے' میں اُس کا بے حد احترام کرتا ہوں...... لیکن محبت؟ دل کے معاملوں پر اختیار کہاں؟'' وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔

اگرچہ پریشے خان بچپن سے اُس کے ساتھ منسوب تھی اور وہ اُس کی سگی چچازاد تھی۔ لیکن اُن میں کبھی محبت تو دور' دوستی بھی نہ ہو پائی۔ ہیلو ہائے سے زیادہ کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ خود میں مگن رہتا' تو وہ بھی لیے دیے انداز میں رہتی...... البتہ بی بی جان اور آغا جان سے اُس کا لگاؤ والہانہ پن لیے ہوئے ہوتا تھا۔

''آئی ایم سوری معید...... وہ...... ایکچوئلی' جب سے بی بی جان میری ماما کو ملنے آئی تھیں اور تمہاری اور معیز بھائی کی شادی کو لے کر ایکسائیٹڈ ہو رہی تھیں...... اُسی دن سے۔'' وہ اُس کے غصے سے خائف رہتی تھی' گھبراہٹ میں بات ادھوری رہ گئی۔

''اوکے ناؤ ریلیکس...... لیو اٹ...... ہمیں اپنے دن کو اب مزید Spoil نہیں کرنا چاہیے۔ میں فریش ہو لوں' شام میں بات کرتے ہیں۔'' اُس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے محبت سے اُسے تسلی دی جانتا تھا کہ وہ بے وقوف لڑکی کس درجہ حساس ہے۔ اور اب وہ اُسے مزید ٹینس نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''اوکے...... تم خفا تو نہیں ہو ناں۔'' بازغہ نے ڈرتے ڈرتے جیسے یقین دہانی چاہی۔

معید خان کے لبوں پر اک بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''نہیں...... بابا...... تم سے خفا رہنا میرے بس میں نہیں...... پاگل لڑکی۔'' معید نے محبت سے ڈانٹا تو بازغہ کی آنکھیں اُس کے بے تحاشا پیار پر چھلک گئیں۔

''اپنا خیال رکھنا...... بائے۔'' بازغہ نے لائن کاٹ دی۔ تو معید خان واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ معاً افتاں وخیزاں سی پریشے ہانپتی کانپتی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھونچکا سا واش روم کے دروازے میں ایستادہ تھا۔

''معید...... وہ بابا جان کا فون آیا تھا۔ وہ تیمور......'' پری کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

''تیمور...... کیا ہوا تیمور کو؟'' معید خان گھبرا کر آگے بڑھا۔ پریشے کے لرزتے ہونٹ اور کانپتے ہاتھ کسی انہونی کا پتہ دے رہے تھے۔ ورنہ اِس سے پہلے وہ کبھی اُس کے بیڈروم میں یوں نہیں آئی تھی۔

''ICU...... تیمور...... اماں اُدھر کمرے میں بے ہوش۔'' وہ بے حد خوفزدہ تھی اُس کے حلق سے بمشکل آواز نکل رہی تھی۔ لفظ ٹوٹ پھوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''پریشے...... فار گاڈ سیک! خود کو سنبھالو...... اور مجھے بتاؤ کہ تیمور کہاں ہے؟ اور چاچی جان؟'' وہ اتنی وحشت زدہ ہو رہی تھی کہ معید خان نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ اُس کے مبہم لفظوں نے معید خان کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

وہ اُس کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ معید ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

وہ انتہائی درجہ محتاط طبع لڑکی اِس وقت شدید بے بسی میں تھی۔

''تیمور کو گولی لگ گئی ہے معید' اور وہ آئی سی یو میں ہے...... اماں اُدھر ہال میں بے ہوش ہو کر گر گئی ہیں...... تم...... پلیز...... ہمیں فوری ہاسپٹل لے چلو۔'' وہ سسکتے ہوئے جانے اور بھی کچھ کہہ رہی تھی...... لیکن معید خان کی سماعتیں تو جیسے مزید کچھ سننے سے انکاری ہو گئی تھیں۔

''تیمور کو گولی لگ گئی ہے......'' اُس کے اندر گرد جیسے بلاسٹ ہوا تھا۔

☆......☆......☆

نرمالہ نے اپنی گرے کلر کی فورڈ فوکس ریورس گیئر میں ڈالی اور معیز کی طرف گڈ بائے کس اچھالتی ہوئی گاڑی بھگا لے گئی۔ وہ ایلنگ سے تقریباً 5 کلومیٹر دور ساؤتھ ہال میں لیڈی مارگریٹ روڈ پر رہتی تھی' جہاں زیادہ تر پاکستان اور انڈین کمیونٹی تھی۔

خنک شام میں لمحہ بہ لمحہ سردی کی شدت بڑھ رہی تھی' گھرے ہوتے بادلوں نے یکا یک پورے آسمان کو یوں سیاہی مائل دبیز اندھیرے سے ڈھک دیا' گویا شام رات کے کواڑ پر دستک دینے کو بے تاب ہو رہی ہو۔

دراز قامت سا معیز خان Soviet کی جینز پر ڈارک براؤن لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ گزرے لمحوں کی چاشنی ابھی تک اُسے مسرور کر رہی تھی۔ خمار آلود لمحے جنوں خیزی لیے ہوئے تھے۔ اُس نے دونوں بازو ہوا میں یوں پھیلائے' گویا پوری کائنات کا عشق اپنی دھڑکنوں میں سمیٹنے کا خواہاں ہو۔

وہ اِرد گرد کی ہر شے سے بے نیاز تھا' اور اِس بات سے بے خبر بھی کہ کسی کی عقابی نظریں اُسے اپنے سخت حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ اک لمبی سانس بھر کر اُس نے طلسماتی لمحوں کی قید سے جیسے خود کو آزاد

کرایا' اور اپنی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے جیکٹ کی زپ اوپر چڑھائی' لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اب اُس کا رُخ اپنی کار کی طرف تھا۔

معاً موبائل کی بیپ پر اُس کے ہاتھ اپنی سائیڈ پاکٹ کی طرف بڑھا' سعودی عرب سے بی بی جان کی کال تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ بی بی جان اپنے مخصوص لب و لہجہ میں گلے شکوؤں کی پٹاری کھولنے کے بعد اب اُس کی خوب کلاس لے رہی تھیں۔ وہ بچپن سے ہی انتہائی ضدی' خودسر اور سرکش طبیعت کا تھا' لیکن بی بی جان اپنی پہلوٹی کی اولاد پر جان نچھاور کرتی تھیں' البتہ آغا جان اُس کی عادات و خصائل سے سخت خائف رہتے تھے۔ وہ بھی ماں سے نسبتاً زیادہ لگاؤ رکھتا تھا۔ اِس وقت بھی کان دبائے اُن کی ڈانٹ چپ چاپ سن رہا تھا۔ لبوں پر دلنشین مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اُسے فون پر مصروف دیکھ کر ایک لمبا تڑنگا دیوہیکل آدمی چیتے کی سی برق رفتاری سے اُس کے عقب میں کھڑی BMW میں جا بیٹھا' اور فون پر کسی کو ہدایات دینے لگا۔

''لڑکی یہاں سے جا چکی ہے...... اب وہ اکیلا ہے...... اور شاید اپنے گھر کے لیے نکل رہا ہے......'' معیز خان کی گاڑی کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ سخت لہجے میں بولا۔

''اوکے......'' دوسری طرف سے مختصر جواب آیا۔

''میں مسلسل اِس پر نظر رکھے ہوئے ہوں' یہ کافی ہوشیار لگ رہا ہے مجھے...... تم اپنے آدمیوں کے ساتھ ہارو سٹریٹ کے قریب رہنا۔'' اب کی بار اُس کا لہجہ سختی کے ساتھ ساتھ تحکمانہ انداز لیے ہوئے تھا۔ وہ ایک مقامی آدمی تھا' جس کا نام مونٹی تھا۔

معیز خان کا گھر ہاونز لو سنٹرل میں نیل روڈ پر تھا' اور ہارو سٹریٹ (PUB) اُس کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ مونٹی نے معیز خان کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات اکٹھی کر رکھی تھیں۔ وہ کہاں رہتا تھا؟ اس کی ایکٹیویٹیز کیا تھیں؟ اُس کے یونیورسٹی آنے جانے کی ٹائمنگ اور یہ کہ وہ کس کس سے ملتا ہے؟ یہ ساری انفارمیشنز اُس نے پچھلے ایک ہفتے میں اکٹھی کی تھیں۔

''ہم اِس وقت PUB کے قریب ہی ہیں' بس تم خیال رکھنا کہ اُسے تم پر ذرا بھی شک نہ ہو کہ تم اُسے فولو کر رہے ہو۔'' فون کے دوسری طرف سے اُس کے ساتھی ہیری کی سفاک آواز ابھری۔

''ڈونٹ وری' میں جانتا ہوں ہمارے کام میں ذرا سی لاپرواہی ہماری جان لے سکتی ہے۔'' مونٹی کا سرد لہجہ روکھا پن لیے ہوئے تھا۔ وہ چہرے مہرے سے ہی انتہائی ظالم اور سفاک لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش بے حد پتھریلے اور سختی لیے ہوئے تھے' داہنے گال پر اک گہرا زخم کا نشان اُسے مزید ہیبت ناک بنا رہا تھا۔

مونٹی اور ہیری ایکٹن (ایلنگ سے تقریباً 2 کلومیٹر دور ایک علاقہ) کے مشہور ڈرگ ڈیلر تھے جو قتل و غارت گری کے علاوہ مار پیٹ' غنڈہ گردی اور ہر طرح کے جرائم میں ملوث تھے۔ مونٹی جمائیکن تھا جبکہ ہیری نسلاً یہودی تھا۔ انڈر ورلڈ میں دونوں کا یارانہ اور سنگدلی مشہور تھی۔

معیز خان نے اگنیشن میں چابی گھمائی' گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

''بی بی جان آپ اپنا خیال رکھنا' میں گھر جا رہا ہوں' آپ سے رات میں بات کرتا ہوں۔'' اُس نے

دلار سے کہا۔
''چل جھوٹا کہیں کا...... رات کو خاک فون کرے گا...... کئی کئی دن ماں کو فون نہیں کرتا...... ہم جانتا ہے' تم کو اپنی ماں کی ذرا بھی یاد نہیں آتی۔'' اُن کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ معیز سے اُن کی محبت کا یہی عالم تھا۔
''او بی بی جان...... بلیوی...... میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں' اور یاد تو انسان انہیں کرتا ہے' جنہیں وہ بھول گیا ہو' آپ تو ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہیں۔'' اُس کے لہجے میں سچائیاں تھیں۔
بی بی جان اُس کی ذات کے اِس مثبت بدلاؤ پر تحیر زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھیں کہ وہ اُن کی ڈانٹ کے جواب میں کس قدر حلاوت سے بات کر رہا تھا۔ انہیں اپنے ضدی سے بیٹے پر ٹوٹ کے پیار آیا۔
''خوش رہ میرا بچہ...... جیتا رہ۔'' اُن کے لہجے میں ممتا کا غرور تھا۔
''آج تمہارا یونیورسٹی کا آخری دن تھا ناں؟'' وہ مزید گویا ہوئیں۔
''جی بی بی جان' میرا فائنل سمسٹر تھا' اسی لیے تو اتنی مصروفیات کے باعث آپ کو کال نہیں کر سکا۔''
اُس کا جتاتا ہوا انداز شرارت بھرا تھا۔
بی بی جان کے لبوں پر اک جاندار مسکراہٹ ٹھہر گئی۔
''بے شرم کہیں کا...... اپنی ماں کو ستاتا ہے۔'' انہوں نے لاڈ بھری ڈانٹ پلائی۔
''اب ہم فون رکھتا ہے...... تم اپنا خیال رکھنا۔'' انہوں نے اُسے دعاؤں کے حصار میں باندھتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔
''شاید وہ بدل رہا ہے......'' بی بی جان موبائل ہاتھ میں تھامے خوش فہم سوچوں میں گھرنے لگیں۔
بھولی سی بی بی جان اِس بات سے انجان تھیں' کہ اُن کے بیٹے پر عشق کا رنگ چڑھ گیا ہے۔
اور عشق تو اپنی ذات کو بھی بھلا دیتا ہے' پھر معیز خان کی سخت گیر فطرت نرماہٹوں میں کیسے نہ ڈھلتی۔
مونٹی کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا جبکہ دوسرا ہاتھ سائیڈ پاکٹ میں رکھے 12 بور کے پسٹل کی طرف رینگ رہا تھا' وہ خاصا چوکنا ہو کر اُس کا پیچھا کر رہا تھا' سرتا پا وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا' ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے اور گلے میں سیاہ اونی مفلر جیکٹ کے کالرز میں یوں لپٹا ہوا تھا کہ اُس کے کانوں کے ساتھ ساتھ اُس کا چہرہ بھی کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں اُسے شناخت کرنا مشکل تھا۔
معیز خان خوش دلی سے بہت ریلیکس موڈ میں ڈرائیو کر رہا تھا جیسے اُسے گھر پہنچنے کی قطعاً جلدی نہ ہو۔
مونٹی بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے کان کے قریب لگی Bluetuth آن کر چکا تھا۔
'He Is On His Way' چند منٹ کے توقف کے بعد وہ ہارڈ سٹریٹ کے قریب پہنچنے والا ہے۔ I Am Leaving...... اب باقی کا کام تمہارا ہے...... ناؤ اِٹس یور ٹرن...... بی کیئر فل...... اینڈ ڈونٹ فورگیٹ...... اُسے جان سے نہیں مارنا...... ورنہ ہمارے 5000 پاؤنڈ ہاتھ سے نکل جائیں گے...... اور پولیس کے جھمیلے الگ سے ہوں گے۔'' اُس کی سرد و سپاٹ آواز اتنی دھیمی تھی' جیسے کوئی بلی غرا رہی ہو' شاید اُس کا اندازِ تخاطب نیچرلی ہی اتنا پتھریلا اور تحکمانہ تھا۔
'Oh Dont Wory Man' ہیری اچھے طریقے سے جانتا ہے کہ اُسے اپنا کام کیسے کرنا

ہے۔ اس کی ایک بھی ہڈی سلامت نہیں رہے گی' ایسے لوگوں کو کیسے سبق سکھانا ہے میں خوب جانتا ہوں۔''
سفاک تیز لہجہ کسی شکاری کی سی عیاری لیے ہوئے تھا۔
''او کے......'' مونٹی نے رابطہ منقطع کرنا چاہا۔
''Hay Listen......'' ہیری نے تیز لہجہ میں اُسے روکا۔
'Are You Sure' کہ وہ اپنا راستہ نہیں بدلے گا...... I Mean To Say ہو سکتا ہے کہ وہ ہارڈ سٹریٹ کے قریب سے گزرنے کے بجائے......!'' ہیری نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔
اُس کی ادھوری مبہم بات نے بھی مونٹی کو طیش دلا دیا۔
''ایڈیٹ او وہ ہر روز اُدھر سے ہی گزرتا ہے...... ہارڈ سٹریٹ اُس کے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔''
مونٹی کا لہجہ کھردرا اور سختی لیے ہوئے تھا۔
ہیری نے منہ بنا کر فون کاٹ دیا۔
''بلڈی راسکل......!'' اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار گالی نکلی۔
''احمق آدمی......!'' مونٹی دل میں اُسے کوستا ہوا بڑبڑایا۔
معاً معیز خان کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا...... اُسے کسی انہونی کا احساس ہوا...... سڑک پر اکا دُکا ٹریفک تھی...... جبکہ ایک BMW کی سیریز مسلسل اسے فولو کر رہی تھی۔
''شاید میرا وہم ہو۔'' اُس نے عقابی نظروں سے بیک ویو مرر سے دیکھا۔
وہ فطری طور پر مضبوط اعصاب کا مالک تھا' اور بلا کا چالاک بھی...... بچپن سے ہی آغا جان نے اُسے قبائلی رسم و رواج کے مطابق ہر طرح کے قدیم و جدید اسلحہ کا استعمال سکھا رکھا تھا۔ کچھ وہ فطرتاً ہی جرأت مند اور دلیر تھا' اور ڈیل ڈول میں بھی مضبوط قد و قامت کا تھا۔ سو ہر طرح کے نامساعد حالات میں بھی اپنے حواس مختل نہیں ہونے دیتا تھا۔
اِس وقت بھی اُس نے بغور حالات کا جائزہ لیا اور خود کو کمپوزڈ رکھا۔ بظاہر اُس کی کسی سے دشمنی نہ تھی...... یونیورسٹی میں چند بار کچھ ناخوشگوار واقعات ہوئے تھے' لیکن اُن کی نوعیت اتنی سنگین نہیں تھی کہ بات یہاں تک پہنچتی۔
اُس کا ذہن تیزی سے دوڑنے لگا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا' اُس کے عقب میں آنے والی گاڑی نے تیزی سے یوٹرن لیا اور فراٹے بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ لب کچل کر رہ گیا۔
معیز خان نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید دھیمی کر لی۔
وہ ہارڈ سٹریٹ سے چند فرلانگ ہی آگے پہنچا تھا کہ اِسی اثنا میں سامنے سے آتی 4X4 جیسے اُس پر چڑھ دوڑی' معیز نے یک لخت بریک لگائی' تو گاڑی لہرا گئی' اور اسٹیئرنگ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا' معیز کا دماغ لمحہ کے ہزارویں حصے میں جیسے بھک سے اڑ گیا' ابھی تو وہ گزشتہ صورتِ حال کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ اُس نے بمشکل گاڑی پر قابو پایا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود بھی گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور ایک جھٹکے سے بند ہو گئی۔
معیز خان کی گاڑی کی رفتار اتنی دھیمی تھی کہ غلطی کی کوئی گنجائش نہ تھی' چہ جائیکہ یوں ایکسیڈنٹ کی نوبت

آتی۔ معیز کا فطری غصہ عود آیا اُس نے غرا کر پیچھے دیکھا۔

''یو باسٹرڈ۔'' اُس نے پیچھے مڑ کر ڈرائیور کو للکارا' جو شاید ڈرنک تھا۔

اِک لمحہ کو مخالف گاڑی کے ٹائر چرچرائے' گاڑی کا جناتی سائز انجن گڑگڑایا' اور ڈرائیور نے پوری قوت سے گاڑی ریورس کی۔ معیز کی گاڑی کے بالکل قریب جا کر اُس نے بریک لگائی اک جھٹکے سے سیٹ بیلٹ اُتاری' اور دھم سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

سرمئی سڑک پر اُس کے لانگ شوز کی دھمک سے فضاؤں کا سکوت جیسے منتشر ہو گیا' اِسی اثنا میں اُس کے ساتھی بھی باہر نکل آئے۔ اب وہ تعداد میں چار تھے۔ لمبے تڑنگے اور خطرناک...... اُن کے ہاتھ میں ڈبل بیرل شارٹ گنز تھیں۔ اپنی ڈیل ڈول اور قامت سے وہ معیز خان کو کسی کلب کے باؤنسرز لگے' یا شاید اُن کا تعلق انڈر ورلڈ مافیا سے تھا۔ معیز خان اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھ رہے تھے' شاید وہ اُسے گھیرے میں لینا چاہ رہے تھے۔

معیز خان سمجھ گیا کہ اُسے ٹریپ کیا گیا ہے۔ اُس کے لب سختی سے اک دوجے میں پیوست ہو گئے۔

''کم آؤٹ۔'' مخالف گاڑی کے ڈرائیور نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے معیز خان کی گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ اُس کے خدوخال سے جیسے نخوت ٹپک رہی تھی۔

معیز خان بنا ڈرے پورے اعتماد کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تند نظروں سے اُسے بھسم کرتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کی جرأت پر ایک لمحے کے لیے مدمقابل تحیر زدہ رہ گیا۔

معیز نے ایک طائرانہ نگاہ اُن پر ڈالی' وہ چاروں اسلحہ تھامے ہوئے تھے جبکہ اُن کے مقابل وہ نہتا تھا اُس کے ذہن نے تیزی سے Plan Of Action بُننا شروع کیا۔ اُن چاروں میں سے ایک چہرہ اُسے قدرے شناسا سا لگا کچھ دیکھا بھالا سا...... اُن چاروں کا گھیرا اُس کے گرد تنگ ہونے لگا۔ وہ اُسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے جھپٹنے کو بے تاب تھے۔

''U Abused Me۔'' اُن میں سے ایک غرایا جو گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا' لیکن معیز کی سماعتوں تک جیسے اُس کی بات پہنچی ہی نہیں اُس کی نظر اپنے داہنی طرف کھڑے اُس آدمی پر ٹھہر گئی' جس کا چہرہ اُسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔

''ہیری......'' اُس کے لبوں سے بے ساختہ پھسلا۔ ہیری نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

☆......☆......☆

تیمور خان آفریدی اِس صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ فضا ایک زوردار دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ ریپٹر کے فائر سے اُس کی گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔ فضا میں بارود کی خوشبو پھیل گئی۔ لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے سڑک پر بے حد پھسلن ہو رہی تھی۔ رفتار تیز ہونے کی وجہ سے تیمور خان گاڑی کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ ذہنی طور پر اُس کی حالت انتہائی مخدوش ہو رہی تھی۔

''تو کیا میرے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔'' اُس نے متوحش ہو کر بابا کی طرف دیکھا۔

اُن کے ماتھے پر پسینے کے چمکتے ہوئے قطرے اِس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ سب اُن کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔

گھر میں زرین گل کے علاوہ کوئی بھی اِس بات سے آگاہ نہ تھا کہ پچھلے کئی دن سے اُن کو دھمکی آمیز ٹیلی فونک کالز اور پیغامات موصول ہو رہے تھے' لیکن نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اُن کے گمان میں بھی نہ تھا۔

تیمور نے Glove Box میں سے نکالا ہوا 12 بور کا پسٹل اپنے زیرجامے میں اُڑس لیا ہوا تھا۔

''میں بابا کی حفاظت کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔'' اُس نے دل میں مصمم ارادہ باندھا۔ اُس کا آفریدی خون جوش مار رہا تھا۔

روڈ پر گاڑی پھسلتی جا رہی تھی بریک پر اُس کے پاؤں کا دباؤ بڑھا' لیکن شاید بریکس فیل ہو گئی تھیں۔ پچھلے دونوں ٹائر مکمل طور پر ناکارہ ہو گئے تھے۔ اور آخرکار ایک دھماکے سے گاڑی سڑک کے کنارے چیڑ کے درخت کے چوڑے تنے سے جا ٹکرائی۔ زوردار آواز سے گاڑی کا بونٹ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور ونڈ اسکرین کرچی کرچی ہو گئی۔ تیمور خان کا سر اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا اور کئی کرچیاں اُس کے گردن اور بازوؤں میں چبھ گئیں۔ لیکن اُس کے لبوں سے ایک ہلکی سی کراہ تک نہیں نکلی۔ دانتوں پر دانت جمائے اُس نے درد کی شدت کو روکا۔

''بابا...... بابا...... آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' اپنی تکلیف کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے وہ اُن کی طرف جھکا۔

گلاس پیسز لگنے کی وجہ سے آدم خان کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اُن کے سر سے بھی خون بہہ رہا تھا' شاید سر پھٹ گیا تھا۔ اُن کی ایسی حالت پر تیمور خان کے دل پر قیامتیں بیت گئیں۔ خواب سچ بھی ہوتے ہیں...... ثابت ہو گیا تھا۔

''تو کیا بابا کو کھو دوں گا میں......؟'' اِس سوچ نے ہی اُس کا دل درد بھرے کراں میں جیسے غرق کر دیا۔

''ڈونٹ وری بابا...... میں ہوں ناں...... میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ اُن کو تھامتے ہوئے شدت جذبات سے چلایا۔ آدم خان نے چونک کر اُسے دیکھا۔

اُن کا چھوٹا سا تیمور خان کب اتنا بڑا ہو گیا تھا...... اتنی دگرگوں حالت میں بھی اُن کا دل مسرت و طمانیت کے احساس سے لبالب بھر گیا۔

یہ خون کے رشتے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں ناں...... اُن کی جان پر خطرہ منڈلا رہا تھا اور اُن کے بیٹے پر یہ راز خود ہی منکشف ہو گیا تھا۔

''تم میری فکر مت کرو بچہ میں ٹھیک ہوں۔'' پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر وہ نقاہت سے بولے ایک ہاتھ سے انہوں نے کنپٹی کو دبا رکھا تھا جہاں سے تسلسل لہو آب کی مانند بہہ رہا تھا' دونوں ہاتھ بھی خون آلود ہو رہے تھے تیمور خان تفکر زدہ سا بس انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اسی اثناء میں حملہ آور اُن کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ وہ چاروں طرف سے اُن کے گھیرے میں تھے...... وہ سب جدید اسلحہ سے لیس تھے' اُن کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے' سو اُن کی پہچان ناگزیر تھی۔

''آدم خان' باہر آیئے......'' اُن میں سے ایک کسرتی بدن والے شخص نے آدم خان کو گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔

تیمور خان نے یکدم چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ شخص مقامی نہیں تھا۔ وہ شخص انگریزی میں بات کر رہا تھا اور وہ بابا کا نام بھی جانتا تھا۔ تیمور کے لیے یہ اچنبھے کی باعث تھا' اُس نے اُلجھ کر بابا کو دیکھا' جواباً وہ نظریں چرا گئے۔ اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

''تم بھی باہر نکلو۔'' اب کی بار اُس نے بارعب انداز میں تیمور خان کو حکم دیا۔ اس کے انداز نے تیمور خان کو گویا آگ لگا دی۔ اُس کا جوان خون کھول اٹھا۔

تیمور کا ہاتھ پسٹل پر رینگنے لگا۔ اُس نے ایک اچٹتی نگاہ اُن پر ڈالی وہ تقریباً دس آدمی تھے' جو ہتھیار تھامے چوکنے کھڑے تھے۔ اُن سے لڑنا بے وقوفی تھی۔ وہ بزدل نہ تھا' لیکن تدبیر سے تقدیر کو جیتنے کی تگ و دو میں تھا۔

''آہ...... میرا سر......'' وہ کراہتے ہوئے جھکتا چلا گیا۔ مدِ مقابل کو شاید اِس ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ اُس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا جو سرعت سے تیمور کی طرف لپکا۔

تیمور کو صرف چند لمحے درکار تھے' اُس نے تیزی سے ایک میسج ٹائپ کیا۔

''ہم خطرے میں ہیں۔'' اور موبائل کو ٹرن آف کر کے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے اچھال دیا۔

اِس وقت وہ ایک ایسا اندھا جواری بن گیا تھا جس کی یہ چال اگر اُلٹی پڑ جاتی تو اُن کی داؤ پر لگی زندگی مزید خطرے میں پڑ جاتی' لیکن اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔

''خبردار...... جو زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی۔'' حملہ آور کے ساتھی نے بھی رواں انگریزی بولتے ہوئے درشتی سے کہا اور اُسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر نکالا۔

ایک لمحے کو تیمور کا دل چاہا کہ ساری مصلحت بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس کا تیا پانچہ کر دے' لیکن اُس نے فی الوقت خود پر ضبط رکھا۔

''خدا کرے سمندر خان (سکیورٹی گارڈ) وہ میسج بروقت دیکھ لے۔'' تیمور نے شدت سے دعا مانگی۔

اِس وقت وہ دونوں اُن کے نشانے پر تھے۔ اور اُن کے مذموم ارادے ڈھکے چھپے نہ تھے۔

''آدم خان ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے' ہمارا مقصد صرف اُن کاغذات کا حصول ہے جو آپ کی دسترس میں ہیں...... آپ وہ کاغذات ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں آپ کو اور آپ کے بیٹے کو کوئی گزند پہنچائے بغیر خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔ انکار کی صورت میں آپ جانتے ہیں کہ آپ کو اس کا کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔'' سپاٹ لہجے میں بات کرتے ہوئے آخر میں اُس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

وہ شاید اُن کا لیڈر یا باس تھا جو آدم خان کو سنگین نتائج کی دھمکی دے رہا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ وہ انتہائی اہم دستاویزات میں ساتھ لے کر گھومتا ہوں' جو تمہارے حوالے کر دوں گا۔'' آدم خان نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

اُن دونوں کے مابین ہو رہا یہ مکالمہ تیمور کو مخمصے میں ڈال گیا۔ اُس نے استفہامیہ نظروں سے بابا کو

دیکھا' لیکن وہ ذرا بھی اُس کی طرف متوجہ نہ تھے۔ وہ بل کھا کر رہ گیا۔ آخر بابا کیا چھپا رہے تھے؟ اور یہ کن کاغذات کا تذکرہ ہو رہا تھا؟'' اُس کا ذہن اُلجھتا چلا گیا۔ اُس پر مستزاد ابھی تک سمندر خان کی جانب سے کوئی پیش رفت سامنے نہیں آ رہی تھی۔ اُس پر مایوسی کی شدید کیفیت طاری ہونے لگی۔

''اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' وہ تیزی سے اپنے دماغ میں لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔

''آدم خان......'' اُن کی جرأتِ گفتار پر حملہ آور پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''آپ غلطی کر رہے ہیں آدم خان...... آپ شاید جانتے نہیں کہ آپ کا سامنا کن لوگوں سے ہے۔'' چبا چبا کر کہتے ہوئے وہ انہیں باور کروا رہا تھا۔ گویا اِن ظالموں کے پاس اُن کے لیے کوئی رعایت نہ تھی۔

''ہاں...... میں نہیں جانتا کہ آپ لوگ کون ہیں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آدم خان کبھی غدار نہیں ہو سکتا۔'' وہ ایک غیور اور محبِ وطن پٹھان تھے۔

''چاہے میری جان چلی جائے لیکن میں وہ راز تمہارے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔ میں اپنی قوم کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا' میرے لیے ملکی سلامتی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔'' آدم خان پُرغرور لہجے میں بولے۔

''بلڈی فول...... یہ پاکستانی قوم انتہائی احمق اور جذباتی ہے۔'' مدِ مقابل شخص انتہائی طیش سے بے ساختہ بولا۔

''پاکستانی قوم......؟'' تیمور خان کے ساتھ ساتھ آدم خان بھی بری طرح چونک گئے۔

معاً اُس شخص کو بھی فی الفور اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے انتہائی سرعت سے اپنی گن کا رخ آدم خان کی طرف کیا۔

''اوکے...... اب تمہارے سامنے موت کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔'' بے لچک لہجہ سانپ کی سی پھنکار لیے ہوئے تھا۔

''خبردار...... جو میرے بابا کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو......'' تیمور نے ساری مصلحت بالائے طاق رکھتے ہوئے اُسے للکارا۔

پانی سر سے اوپر تک پہنچ چکا تھا اب مزید انتظار بے سود تھا۔ حملہ آور کی پیش قدمی وہیں رُک گئی۔ تیمور کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر وہ ایک طنزیہ ہنسی ہنسا۔

''یہ چھوٹا سا لڑکا...... یہ چوزہ...... تمہیں ہم سے بچائے گا...... ہاں؟'' وہ آدم خان کی طرف رخ کرتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

''جب تک وہ کاغذات میرے پاس ہیں تم کبھی مجھے جان سے نہیں مارو گے...... یہ بات میں جان گیا ہوں۔'' آدم خان اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پُریقین انداز میں بولے۔

ایک لمحے کو اُن کی اس درجہ درست قیافہ شناسی مدِ مقابل کو ڈگمگا گئی' لیکن اُس نے لمحوں میں خود کو کمپوز کیا۔ تیمور خان بدستور پوزیشن لیے کھڑا تھا' جبکہ اُسے گھیرے میں لیے ہوئے حملہ آور کے ساتھی بھی پوری طرح سے الرٹ تھے۔

اِس صورت حال پر آدم خان کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے' لیکن انہوں نے ایک لمحے کو بھی خود کو

کمزور نہیں پڑنے دیا۔

''ہم م م...... ہم آپ کو واقعی جان سے نہیں مارنا چاہتے' ہاں لیکن آپ کو اپنے ساتھ تو لے جا سکتے ہیں ناں؟'' وہ پُراسرار لہجے میں بولا۔

''اوہ...... یعنی حملہ آوروں کا پلان اُن کی کڈنیپنگ تھی۔'' آدم خان فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ سچویشن گھمبیر تر ہوتی جا رہی تھی۔

''اور...... ہاں...... آپ کے اس لعل بوائے کو تو جان سے مار سکتے ہیں ناں؟'' آدم خان کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر سیکنڈ سے پہلے اُس نے تیمور کی طرف فائر کھول دیا۔

تیمور چست اور توانا لڑکا تھا' وہ آل ریڈی اُس کی طرف سے ہونے والی پیش قدمی کا منتظر تھا' اِس سے پہلے کہ گولیاں اُس کا سینہ چھلنی کرتی ہوئی گزر جاتیں اُس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا' اور بھاگتا ہوا گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔

اُسے گھیرے میں لینے والوں میں سے دو آدمیوں نے انتہائی پھرتی سے اُس کے پیچھے جمپ لگائی۔ تیمور نے اُن میں سے ایک کو زوردار کک لگائی' جو اُس کے سینے پر لگی' اور وہ تیورا کر الٹ گیا' جبکہ دوسرے آدمی کو اُس نے زبردست پنچ رسید کرنے کی کوشش کی' لیکن اُس کا مکا ہوا میں لہرا گیا۔ مدمقابل شخص شاید مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔ اُس نے تیمور کے گھونسے کا وار اپنی کہنی پر روکا' اور الٹے ہاتھ سے اُس کی گردن پر وار کیا' وہ درد سے کراہ اٹھا۔ پسٹل اُس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔

''اٹھو' کم آن' ہٹ می۔'' وہ آدمی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اب ہاتھ کے اشارے سے تیمور کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے چیلنج کر رہا تھا۔

فائٹنگ میں اُس کے ماہرانہ داؤ پیچ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ انتہائی تربیت یافتہ ہے جبکہ اُس کے مقابل تیمور خان بالکل کچا کھلاڑی تھا' تبھی لمحوں میں چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔

''تمہاری دشمنی مجھ سے ہے...... میرے بیٹے کو جانے دو...... اُسے چھوڑ دو۔'' آدم خان بے اختیار بیٹے کی طرف بڑھے۔

حملہ آوروں کے باس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور اِس سے قبل کہ وہ تیمور کے قریب جاتے انہیں دونوں بازوؤں سے آہنی گرفت میں جکڑ لیا گیا۔ باس نے آگے بڑھ کر اُن کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ آدم خان کا ہونٹ بری طرح پھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔ تیمور خان کے لیے یہ منظر قیامت خیز تھا۔

''بابا......'' وہ چلایا۔ اُسے سنبھلنے کے لیے چند لمحے درکار تھے۔ وہ عقاب کی سی تیزی سے قریب کھڑے آدمی پر جھپٹا' اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اُسے مکوں اور ٹھوکروں کی زد میں لے لیا۔ بابا کو یوں ناگفتہ با حالت میں دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اُس میں جنوں کی سی طاقت بھر گئی تھی۔ اُس کیم شیم آدمی کے لیے اُس کا یہ ردعمل غیر متوقع تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔

''مارو اِس باسٹرڈ کو......'' باس کی غصیلی آواز پر اُس نے صرف چند لمحوں میں ہی اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا لیا اور جواباً تیمور کو کک کرنے کے بعد اِس بری طرح زمین پر پٹخا کہ چند سیکنڈ میں ہی اُس کی خوب درگت

بنا دی۔ وہ نیم جان سا ہو گیا' تو اُس کی گردن میں بازو ڈال کر اپنی گرفت اتنی سخت کر دی کہ اُسے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ آدم خان بے بسی سے اپنے بے قصور بیٹے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اِس وقت خود کو سخت لاچار محسوس کر رہے تھے۔

''اللہ مدد......'' انہوں نے شدت سے رب کو پکارا اور یقیناً وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔

دور سے ایک دھول اڑاتی جیپ لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔

''سمندر خان......!'' آدم خان زیرلب بڑبڑائے۔ غیب سے مدد آئی تھی۔ اُن کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ باس بھی قریب آتی جیپ کو دیکھ کر یکدم چونک گیا۔

''موو...... موو...... بیک...... رائٹ ناؤ......'' اُس نے چیختے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم صادر کیا۔ شاید فی الفور وہ مزید کسی بکھیڑے میں اُلجھنا نہیں چاہ رہے تھے۔ انہوں نے سرعت سے آدم خان کے ہاتھ باندھے اور انہیں تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈالا۔ آدم خان نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ انہوں نے خود کو جیسے مکمل طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

معاً جیپ قریب آ کر رُکی' اور سمندر خان عبدالحئی کے ساتھ مزید چار اسلحہ بردار آدمیوں کو لیے جیپ کا دروازہ کھول کر دھم دھم کرتا باہر نکلا۔

''بابا......!'' تیمور نے زمین سے اٹھنے کی کوشش کی' لیکن لڑکھڑا گیا بابا کو روکنے کے لیے اُس کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہرا گیا۔

''چھوٹا صاحب......!'' سمندر خان بجلی کی سی تیزی سے اُس کی طرف بڑھا تو باس نے موقع سے

آپ کیسا ''سچی کہانیاں'' چاہتے ہیں؟

قارئین کرام اور لکھاری دوستو! سچی کہانیاں آپ کا اپنا ماہنامہ تھا' ہے اور رہے گا۔ آپ سچی کہانیاں میں کیا تبدیلی یا اضافہ چاہتے ہیں؟ فوری طور پر خط تحریر کریں یا دفتری نمبرز پر گروپ ایڈیٹر سے فوراً رابطہ کریں۔ ہم آپ کی قیمتی آراء اور مشوروں کے منتظر ہیں۔

فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر نشانہ باندھتے ہوئے تیمور پر فائر کرنا چاہا۔

آدم خان نے بروقت اپنی پشاوری چپل سے ہاس کی ٹانگ پر زوردار ضرب لگائی' وہ بے اختیار جھکا اور نشانہ خطا ہو گیا۔

دفعتاً تیمور خان نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کیں اور قلابازی کھاتا ہوا دور پڑے پسٹل تک پہنچا۔

''سمندر خان بابا کو بچاؤ۔'' تیمور نے سمندر خان کو تیزی سے کہتے ہوئے دور سے نشانہ لیا۔ حملہ آور آدم خان کو بری طرح زدوکوب کر رہے تھے۔

تیمور خان کا نشانہ پکا تھا۔ وہ آفریدی قبیلے سے تھا اور اپنے رسم و رواج کے مطابق نشانے بازی میں مہارت رکھتا تھا۔

گولی ہاس کے بازو پر لگی تھی۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

اب حملہ آور فی الفور پوزیشنز لے چکے تھے۔ جبکہ سمندر خان بھی اپنے ساتھیوں سمیت انتہائی سرعت سے درختوں کے پیچھے اپنا ٹھکانہ بنا چکا تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

فضائیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

آدم خان موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ آوروں کی گاڑی سے بھاگ نکلے تھے۔ تیمور نے سمندر خان سے کلاشنکوف لی اور سڑک کنارے لگے چیڑ کے درختوں کی اوٹ سے مسلسل فائرنگ کر رہا تھا۔ حملہ آوروں کے دو آدمی شدید زخمی ہوئے اور ایک سنسناتی ہوئی گولی تیمور خان کا سینہ چیرتی گزر گئی۔

اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور گن اُس کے ہاتھ سے دور جا گری۔ اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

''بابا......'' اُس کے لبوں سے ایک دھیمی سرگوشی آہ بن کر نکلی تھی۔

سمندر خان بھی انتہائی زخمی حالت میں تھا۔ اُس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔

''چھوٹا صاحب...... تیمور خاناں...... ام تم کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔'' وہ لنگڑاتا ہوا اُس طرف بھاگا۔

''خان کو اٹھاؤ...... جلدی......!'' اُس نے دھاڑتے ہوئے عبدالحیٔ اور اپنے ساتھیوں کو مڑ کر کہا۔ اسی اثناء میں حملہ آور موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے۔

کئی گاڑیوں کے ٹائر ایک ساتھ چرچرائے اور پھر ایک سکوت سا ٹھہر گیا۔

☆......☆......☆

وہ بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ پچھلے کئی دن سے موسم حزن جیسے اُس کے وجود میں ڈیرے ڈالے ہوا تھا دل کا ایک حصہ ہمیشہ بے چین رہتا...... زرمینے کے علاوہ کون تھا؟ جو اُس کی شدتوں کا گواہ تھا۔

''کئی دن سے مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ برا ہونے والا ہے...... کوئی انہونی...... میری دھڑکنیں رُک جاتی تھیں...... میری سانسیں تھمنے لگتی تھیں...... دل سہما سا تھا...... اور...... اور تم نے سن لیا ناں زرمینے...... میرے سب واہمے' سارے خدشات سچ ثابت ہو گئے ناں؟'' وہ زرمینے کے شانے پر سر رکھے بری طرح بکھر رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو فردا...... پلیز......'' زرمینے سے اُس کی بے چارگی دیکھی نہیں جا رہی تھی...... وہ دم بخود تھی۔

فردا کی شدتیں اُسے ہولائے دے رہی تھیں۔ پہلی بار یہ یکطرفہ جنون اُسے خوفزدہ کر رہا تھا۔

''خدایا...... یہ کیسا الہامی عشق تھا۔''

تیمور خان آفریدی مشکل میں تھا' اُس کی جان پر بن آئی تھی۔ اور سانسیں اُس کی رک رہی تھیں اُس پاگل لڑکی کی جس کے پاگل جذبوں سے وہ یکسر انجان تھا۔

زرمینے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کی پلکوں کی جھالر پر کئی موتی اٹک گئے۔

''اگر تیمور کو کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گی زرمینے...... میں سچ میں مر جاؤں گی......'' وہ عجیب ہٹیلے خود سر لہجے میں بولی۔ اُس کی آنکھوں میں سرکشی تھی اور لہجے میں پاگل پنے کی خودسری......

زرمینے کو لگا وہ عقل و خرد سے بیگانی ہوتی جا رہی ہے۔

''یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو تم فردا...... ہوش میں آؤ...... تیمور کو کچھ نہیں ہو گا۔'' زرمینے نے فردا کی بانہیں پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

زرمینے بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گئی۔

دفعتاً فردا کی ممی کمرے کا دروازہ کھولے دھیرے سے اندر داخل ہوئیں' انہوں نے ہاتھ میں نازک فینسی ٹرے اٹھا رکھی تھی' جس میں بھاپ اڑاتے دودھ کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

کمرے کا ماحول عجیب تناؤ اور یاسیت لیے ہوئے تھا۔

فردا کو اس وحشت زدہ حالت میں دیکھ کر وہ مضطرب ہو کر آگے بڑھیں' وہ کارپٹ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی' لانبے بال کلپ سے نکل کر یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے اُس کی حالت زار پر ماتم کناں ہوں۔

''بیٹی! کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ ایسا کیا ہو گیا؟'' بیٹی کو ایسے اجڑی حالت میں دیکھ کر اُن کا دل یکبارگی ڈوبا تھا۔

''ممی...... وہ...... تیمور......'' ماں کو دیکھ کر بے اختیار وہ بلک اٹھی۔

''کیا ہوا تیمور کو...... اور تم...... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' اُس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے انہوں نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ سخت حواس باختہ ہو رہی تھیں۔

''ممی...... تیمور...... مجھے ابھی سیدو شریف جانا ہے۔'' وہ شدتوں سے رو دی۔ ممی کا ضبط اُس کی بے ربط باتوں سے جواب دینے لگا۔

''کوئی مجھے کچھ بتائے گا؟ آخر ماجرا کیا ہے؟'' اب کی بار وہ برس پڑیں پریشانی اُن کے چہرے سے مترشح تھی۔

''خالہ...... تیمور کو گولی لگ گئی ہے...... وہ بہت کریٹکل حالت میں آئی سی یو میں ہے۔'' آخر زرمینے کی چپ کی بکل کھل گئی۔

''دہاٹ......؟'' وہ یکدم بھونچکی رہ گئیں۔

(اس دلچسپ ناول کی تیسری قسط آئندہ ماہ پڑھیے)

ایسی کہانیاں جو انسانی عقل اور سوچ سے ماورا ہیں

پھولوں والا جن

فرحت عباس شاہ کا خیال

ایک ایک کر کے حوادث بڑی ترتیب کے ساتھ
مرحلہ وار مرا ساتھ نبھانے آئے

حمیرا سعید

میں جو کہانی سنانے والی ہوں' وہ میری خالہ کی آپ بیتی ہے۔ اب وہ عمر رسیدہ اور چار بچوں کی ماں ہیں۔ میری امی کو ملا کر چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ میرے نانا ماسٹر تھے۔ جب ان کی



پہلی شادی ہوئی تو شادی کے ڈیڑھ سال بعد میری پہلی نانی میری سب سے بڑی خالہ کی پیدائش کے بعد انتقال کر گئی تھیں۔ اتنی سی بچی کی ذمے داری نانا خود نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے گھر والوں نے انہیں مشورہ دیا۔

"بھائی کریم! اب تم دوسری شادی کر لو۔" پر وہ نہیں مانے' مسلسل انکار کرتے رہے۔ کہنے لگے۔

"میں' ماں اور باپ دونوں بن کر بچی کی پرورش کر لوں گا۔"

میرے نانا کی ماں (جنہیں آگے میں ہر جگہ اپنی پرنانی کہوں گی) نہیں مانیں۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹا! نادانی کی باتیں نہ کرو۔ تمہارے بہن بھائی خیر سے اپنے اپنے گھروں والے ہیں۔ باپ تمہارے حیات نہیں ہیں اور میں بڑھیا لاچار' کیسے اتنی سی بچی کو پالوں گی؟ تم ذرا ہوش مندانہ فیصلہ کرو۔ اپنے لیے نہیں صرف اپنی بیٹی کے لیے سوچو۔ لڑکی کے مسائل لڑکے سے مختلف ہوتے ہیں۔ چلو جب تک میں زندہ ہوں تب تک تو ٹھیک ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کر لوں گی' پر جس دن میری آنکھیں بند ہو گئیں اس دن کے بعد تم اپنی ڈیوٹی دو گے کہ نرگس کی رکھوالی کرو گے؟"

میری پرنانی نے بالآخر اپنے بیٹے کو دوسری شادی کرنے کے لیے راضی کر ہی لیا۔ دوسری بیوی جو نانا کی دلہن بنیں' وہ میری نانی تھیں جن کا نام نورالنساء تھا۔ میرے نانا پیار سے انہیں 'نورن' کہہ کر بلاتے تھے۔ نانا نے انہیں پہلے دن ہی سمجھا دیا تھا کہ تمہیں نرگس کو حقیقی ماں کا پیار دینا ہوگا۔ میری نانی نے اپنے سگھڑاپے اور سمجھداری کی بنا پر

بہت جلد ہی ساس' دیور' نندوں اور شوہر کے علاوہ نرگس کا بھی دل جیت لیا۔ اب تو ہر کوئی بس میری نانی کے ہی گن گاتا پھرتا تھا۔

جب میری نانی میں پہلی دفعہ ماں بننے کے آثار پیدا ہوئے تو میری پرنانی جیسے اپنی ہر تکلیف و غم بھول گئیں اور میری نانی کو جیسے ہاتھوں کا چھالا بنا لیا۔ ایسا نہ کرنا' ویسا نہ کرنا' یہاں نہ بیٹھنا' نہ یہ کھانا' وہ کھانا اور ساتھ ساتھ میرے نانا کو بھی ہدایت کر دی کہ ان کا خاص خیال رکھیں۔ میرے نانا کو بچوں کا بہت شوق تھا اور اس بات کا ذکر وہ کئی بار میری نانی سے کر چکے تھے۔

"جب نرگس کی پیدائش کے بعد فاطمہ چلی گئی تھی تو مجھے بہت افسوس ہوا تھا' پر اب نہیں۔ خدا نے چاہا تو میری مراد تم سے پوری ہوگی۔"

آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب میرے نانا ایک پیارے سے بیٹے عبدل قادر کے باپ بن گئے۔ اب میری نانی کی ذمے داری بڑھ گئی تھی۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا۔ یہ دونوں وقتاً فوقتاً نو عدد بچوں کو خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمت جانتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ اسی اثناء میں میری پرنانی کا انتقال ہو گیا۔ جس کا سب کو افسوس تھا مگر زیادہ افسوس میری نانی کو تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یہ میری ساس نہ تھیں بلکہ ماں سے بھی بڑھ کر تھیں جن کے سائے میں رہ کر وہ اپنے گھر والوں کو بھی بھول گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ وقت کا پہیہ گھومتا رہا پہلے بچے چھوٹے تھے پھر بڑے ہوتے گئے۔ گھر میں پیسے کی تنگی نہ تھی کیونکہ میرے نانا کی اچھی نوکری کی وجہ سے ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بچوں کی شادی کا وقت آیا تو سب سے پہلے نرگس

کی شادی ہوئی پھر اس کے بعد جس جس کا نمبر تھا وہ فارغ ہوتا چلا گیا۔ ہمارے نانا کی دو بیٹیاں' امبر اور ارم جو کہ سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی عمروں میں دو دو سال کا فرق تھا۔ وہ بھی اب خیر سے بالغ ہو چکی تھیں' پر ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور ارم چھوٹی' وہ مقامی کالج میں بی اے کی طالبہ تھی جب میری نانی نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ نانا تو اس حادثے سے جیسے نیم پاگل ہو گئے کہ اب کیا ہوگا؟ مگر رفتہ رفتہ نانا کو صبر آ ہی گیا۔ انہیں اپنی دو بیٹیوں کے فرض کو بھی پورا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ اگر ان کی ماں حیات ہوتی تو انہیں کوئی فکر نہ ہوتی پر اب ایسا نہیں تھا۔ انہیں یہ کام خود کرنا تھا مگر اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی اور ان کی دونوں بیٹیوں کا رشتہ ایک ہی گھر سے آ گیا۔

پروفیسر ریاض الدین میرے نانا کے دوست اور دور کے رشتے دار بھی تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ بڑے دونوں ایک کمپنی میں ملازم تھے۔ چھوٹا بیٹا ابھی زیر تعلیم تھا۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شکل آپس میں بہت ملتی تھی مگر امبر کے شوہر یوسف کا رنگ گورا اور ارم کے شوہر کا رنگ ذرا دبا ہوا تھا۔ پرکشش ہونے کے باعث وہ یوسف خالو سے بھی اچھے لگتے تھے۔

ایک دن ہلکی پھلکی تقریب کا اہتمام کر کے نانا نے خالاؤں کی منگنی طے کر دی اور شادی کے لیے دو مہینے کے بعد کی تاریخ طے پائی۔ اسی دن خالہ کی ساس ہمارے نانا سے کہنے لگیں۔

''دیکھیے بھائی جان! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس ہماری ایک شرط ہے کہ ہمارے گھر میں ایک دن میں دو دلہنیں بیاہ کر نہیں آتیں۔ آپ کو مشکل تو ہوگی کہ دو دن انتظام کرنا پڑے گا پر یہ ہماری مجبوری ہے۔ امبر اور ارم کی شادی الگ الگ دن ہوگی۔''

یہ سن کر نانا نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگیں۔

''ہمارے گھر ایسی شادی راس نہیں آتی۔ دونوں جوڑوں میں سے کسی نہ کسی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں۔''

ہم آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ ہم دونوں دن ہیں' ہیں ہی باراتی لائیں گے تا کہ آپ کو پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔''

یہ بات سن کر ماموں وغیرہ تو احتجاج کرنے لگے مگر کافی بحث وتمحیص کے بعد ان کی بات مان لی گئی۔

شادی چونکہ دو مہینے بعد رکھی گئی تھی اس لیے نانا نے سب بچوں کے ذمے ان کے کام لگا دیے تھے جسے ہم لوگ بخوبی انجام دے رہے تھے۔ جمعرات والے دن امبر خالہ کی شادی طے پائی تھی 'اس لیے جمعرات کو امبر خالہ رخصت ہوئیں اور اگلے روز ارم خالہ بھی رخصت ہو گئیں مگر ابھی ارم خالہ کو رخصت ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ دلہن کی کار واپس آ گئی۔ جو لوگ ہال سے باہر کھڑے تھے وہ حیران ہو کر دیکھنے لگے کہ دلہن کیوں واپس آ گئی ہے۔ نانا تک یہ اطلاع گئی ی تو وہ بھی پریشان ہو گئے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ جب معلوم کیا تو پتا چلا کہ نکاح سے پہلے جب ارم خالہ کو باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تو انہوں نے اپنی انگوٹھیاں اُتار کر وہیں باتھ روم میں رکھ دی تھیں اور اٹھانا بھول گئیں تھیں اب یاد آیا تو لینے آئی ہیں۔ یہ بات جب امی کو معلوم ہوئی تو انہوں نے فوراً انگوٹھیاں اُن کو دے دیں اور بتایا۔

''جب تم وہاں سے واپس آئی تھیں تو میں چھوٹے بچے کو فارغ کروانے لے کر گئی تھی تو سامنے رکھی ہوئی انگوٹھیوں پر نظر پڑ گئی۔ نئی ہونے کی وجہ سے فوراً پہچان میں آ گئیں اس لیے میں نے اپنے پاس رکھ لی تھیں۔''

انگوٹھیاں لے کر دوبارہ دلہن رخصت ہوئی۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ دونوں خالائیں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ بہت خوش تھیں پھر حسب روایت دونوں کی اطلاع آئی کہ دونوں کچھ عرصے بعد نئی خوشخبری سنانے والی ہیں۔ خالہ کے گھر میں کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے ساس سسر تو گن گن کر دن کاٹ رہے تھے۔ پہلے سے بچوں کے کھلونے' کپڑے اور استعمال کی چیزیں لا لا کر رکھ لی تھیں اور پھر خدا کے فضل و کرم سے دونوں ایک ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئیں۔ بچوں کے نام عالموں سے پوچھ کر آصف اور ادریس رکھے گئے۔ ساس سسر سمیت گھر کا ہر فرد بچوں کا دیوانہ تھا۔ وقت آرام اور سکون کے ساتھ گزر رہا تھا۔ دو سال بعد دونوں خالائیں دوبارہ امید سے ہو گئیں۔ اس دفعہ ارم خالہ کی طبیعت تو ٹھیک رہی مگر امبر خالہ کو ڈاکٹر نے بڑا آپریشن بتایا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان اور اپنے آپ سے غافل رہنے لگی تھیں۔ بہوؤں کی ایسی حالت دیکھ کر ان کی ساس نے گھر میں کام کرنے والی ماسی رکھ لی۔ اس دفعہ ارم خالہ پہلے فارغ ہوئیں تو ان کے گھر جڑواں بیٹی بیٹا پیدا ہوئے۔ کچھ عرصے بعد امبر خالہ کو اسپتال میں داخل کروا دیا گیا اور انہوں نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹا تو ٹھیک ٹھاک تھا خالہ کی کنڈیشن خراب ہو گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ انہیں فوری خون کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسپتال میں جتنے گھر کے افراد موجود تھے' سب نے اپنا خون ٹیسٹ کروایا پر کسی کے بھی خون کا گروپ خالہ کے خون کے گروپ سے میچ نہ کر سکا اس لیے اسپتال میں جو بھی خون میسر تھا' لے کر چڑھایا گیا۔ اس خون کے طفیل خالہ کی جان تو بچ گئی پر کچھ عرصے بعد اس خون کے اثرات 'برص' کی بیماری کی شکل میں سامنے آئے۔ جب انہوں نے ڈاکٹروں کو دکھایا تو ڈاکٹروں نے بھی تشخیص کر دی کہ یہ بیماری آپ کو خون کی غلط گروپنگ کی وجہ سے ری ایکشن کے طور پر ہوئی ہے۔ اس بیماری کا علاج خالہ نے ہر ڈاکٹر' حکیم' روحانی علاج' شعاعوں سے 'عاملوں سے' وظائف سے' غرض ہر طریقے سے کروایا پر کم ہونے کی بجائے' وہ ان کے پورے جسم میں پھیل گیا اور دیکھنے میں ایسا لگتا تھا کہ جیسے پورا جسم جل گیا ہے۔ اس صورت حال میں خالہ احساس کمتری کا شکار ہو گئیں۔ وہ کسی کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ ہر وقت روتی رہتی تھیں اور تو اور بچوں اور گھر والوں سے بھی بچتی تھیں کہ مبادا یہ بیماری کسی اور کو نہ لگ جائے۔ وہ اپنی بیماری کے بارے میں اس قدر حساس ہو گئی تھیں کہ ایک دن تو خالو سے کہنے لگیں۔

''اب میں بہت بدصورت ہو گئی ہوں۔ آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہوگا اس لیے میں آپ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دیتی ہوں۔''

یہ بات سن کر خالو خالہ پر بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ تم تو پاگل ہی ہو گئی ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ بیماری تمہیں شادی سے پہلے نہیں ہوئی۔ نہیں تو شادی کا کتنا مسئلہ ہوتا۔ اب تمہیں کیا فکر ہے۔ ماشاءاللہ دو بیٹوں کی ماں ہو' اپنا گھر ہے' شوہر ہے' ساری نعمتیں میسر ہیں۔ حسن ہی تو سب کچھ نہیں

ہوتا۔ ڈاکٹروں سے میری اس بیماری کے بارے میں بات ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس بیماری کا علاج دریافت ہوگیا ہے۔ وقت تو ضرور لگے گا مگر تمہاری بیوی جلد دوبارہ ٹھیک ہوجائے گی۔''

اس طرح دو سال اور گزر گئے۔ ارم خالہ خیر سے ایک اور بیٹے کی ماں بن گئیں۔ ان کے بیٹے کا نام عاصم رکھا گیا تھا۔ جب وہ چھ ماہ کا ہوا تو خالہ دوبارہ امید سے ہوگئیں مگر اس دفعہ اُن کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ آخر وقت تک ان کی طبیعت خراب ہی رہی۔ آپریشن کے ذریعے اُن کا بیٹا ہوا مگر وہ آٹھ گھنٹے زندہ رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔

اس صدمے کے بعد خالہ بہت بیمار ہوگئیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اُن کی ساس نے گھر میں قرآن خوانی و میلاد کا اہتمام کروایا۔ اس دوران خالہ کے گھر عجیب و غریب واقعات رونما ہوئے کہ خالو جس کمپنی میں کام کرتے تھے وہاں سے انہیں نکال دیا گیا۔ ایک دن چھوٹا دیور آفس سے آ رہا تھا تو اس کا ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ چوٹیں تو بہت آئیں پر خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ خود پروفیسر صاحب پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ بچے بھی اکثر بیمار رہنے لگے۔ گھر میں چوری کی واردات ہوئی۔ ساس بھی بیمار رہنے لگیں۔ ساس نے کئی بار رات کے وقت جاگتی آنکھوں سے کسی سائے کو مختلف جگہوں پر کھڑا دیکھا جس کے جسم پر صرف لال نیکر تھا اور پیشانی پر لال بندیا تھی۔ بال کم تھے مگر پیچھے سے ایک پتلی چوٹی کندھے تک جھول رہی ہوتی تھی۔

انہوں نے سسر سے کئی بار اس بات کا ذکر کیا۔ انہوں نے پہلے تو اسے اُن کا وہم سمجھا مگر ایک دو دفعہ خود انہوں نے بھی اس سائے کو محسوس کیا۔ انہوں نے فوراً استخارہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے گھر پر کسی دوسری مخلوق نے آکر قبضہ جمالیا ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں انڈیا سے ایک بزرگ ہمارے رشتہ داروں کے گھر آئے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے انہیں مدد کے لیے بلوالیا۔

جس دن وہ لوگ آئے انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے گھر میں دعا کریں گے۔ آپ جس کو بلانا چاہتے ہیں' دعا میں شرکت کے لیے بلالیں ہمارے ساتھ عنایت میاں بھی ہیں۔ ان کے پاس بہت علم ہے۔ ان کے پاس ایک چراغ بھی ہے جس کو یہ مریض کے سامنے یا گھر والوں کے سامنے روشن کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ وظائف کا عمل بھی جاری رکھتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں مریض یا گھر کے کسی بھی شخص پر اگر کسی دوسری مخلوق کا سایہ ہوگا تو وہ ظاہر ہوجائے گا اور پھر عنایت صاحب اس مخلوق کو اپنے عمل و وظائف سے نیست و نابود کردیں گے۔

جس دن دعا ہونی تھی' خالہ نے امی کو بھی بلوالیا تھا۔ میں اور امی ہم دونوں اس دن دوپہر کے وقت خالہ کے گھر پہنچ گئے۔ امی کے پوچھنے پر خالہ کی ساس نے امی کو تفصیل سنائی۔

''دیکھو نعیمہ! (یہ میری امی کا نام ہے) یہ لوگ بڑی کرامت والے لوگ ہیں۔ ان کے علم سے بہت سے لوگوں کو فیض پہنچا ہے۔ تمہارے خالو کے بلانے پر یہ لوگ آئے ہیں۔ میں تمہیں پہلے بھی گھر کے حالات بتا چکی ہوں۔ بس یہ اسی سلسلے میں آئے ہیں کہ خدانخواستہ کچھ ہے تو یہ اسے ختم کردیں گے۔ اس چراغ کے سامنے جو بیٹھے گا اسے بہت فائدہ ہوگا۔ اس چراغ کے اندر جو تیل موجود ہے اگر وہ جسم کے کسی بھی درد والے حصے پر لگایا جائے گا تو شرطیہ فوراً آرام آئے گا مگر اس تیل کی پابندی یہ ہے کہ ناف سے نیچے نہ

لگے۔ امبر کی طبیعت اتنی زیادہ خراب رہنے لگی ہے کہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس غریب پر ہی کچھ ہوگیا ہے۔ دیکھو کیسی تھی' کیسی ہوگئی ہے؟ ویسے تو آج سب لوگ چراغ کے آگے بیٹھیں گے مگر میرا اصل مقصد امبر کو آگے بٹھانا ہے۔''

اتنے میں ارم خالہ آگئیں کہ چلو چائے پی لو۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ ابا جی کہہ کر گئے ہیں کہ سب لوگ ہال میں جمع ہو جائیں۔ ہم لوگ مسجد سے سیدھے ادھر ہی آئیں گے۔ مغرب کی نماز ادا کر کے ہم سب ہال میں جاکر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کمرے میں سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیوار سے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں اگربتی کا اسٹینڈ' ایک پانی سے بھرا ہوا جگ اور ایک چراغ تیل سمیت رکھا ہوا تھا۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد ہی عنایت صاحب اور دوسرے مرد حضرات مسجد سے تشریف لے آئے۔ سب کے بیٹھنے کے بعد عنایت صاحب بولے۔

''آج جمعرات کا دن ہے۔ چاند کے لحاظ سے نوچندی جمعرات ہے۔ یہ تاریخ ہر عالم و عامل کے لیے بڑی اہم ہوتی ہے۔ میں اب کام کرنے کا آغاز کرتا ہوں۔ میرے کام کرنے کا انداز یوں ہے کہ گھر کے تمام افراد ایک کمرے میں جمع ہوجائیں۔ عورتیں ایک طرف ہو جائیں' مرد ایک طرف' عورتیں اپنی چوٹیوں کے بل کھول دیں اور سر پر دوپٹا اچھی طرح جمالیں۔ مرد حضرات ٹوپی پہن کر رکھیں۔ چراغ جلنے سے پہلے کمرے میں اندھیرا کردیا جائے گا۔ میں عمل شروع کرنے سے پہلے اس کمرے کا حصار باندھ دوں گا۔ کوئی بھی شخص اٹھ کر باہر نہیں جائے گا اور نہ کوئی اندر آئے گا۔ جب میں چراغ جلاؤں گا تو ساتھ ساتھ وظیفہ بھی پڑھتا جاؤں گا۔ اگر اس دوران میں کسی کو تکلیف آئے یا بے چینی ہو تو پریشان مت ہوئیے گا۔ ہم سب یہاں موجود ہیں۔ جس کی جو کیفیت ہوگی وہ خود سامنے آجائے گی۔ آپ لوگ شور کر کے یا باتیں کر کے میرا دھیان نہیں بٹائیے گا۔''

امبر خالہ اور ارم خالہ اتفاق سے دونوں آگے ہی بیٹھی تھیں۔ ارم خالہ کی گود میں اُن کا چھوٹا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ عنایت صاحب نے کمرے میں اندھیرا کردیا اور پھر چراغ جلانے کے ساتھ ساتھ اپنا عمل شروع کیا تو ہم سب بھی حسب ہدایت درود شریف پڑھنے لگے۔ عنایت صاحب کو عمل شروع کیے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ارم خالہ جو کہ بچہ لے کر بیٹھی تھیں وہ کچھ ہلنے لگیں اور ہلتے ہلتے اپنے بیٹے عاصم کو زور زور سے مسلنے لگیں ہم یہ سمجھے کہ یہ شاید ایسے ہی کر رہی ہیں مگر ایک دم انہوں نے اپنا دوپٹہ سر سے اُتار کر پھینکا اور اپنے کھلے بالوں کو جھٹکا دے کر زور زور سے بیٹھے بیٹھے جھومنا شروع کردیا۔ ان کی آنکھیں عجیب سی بڑی بڑی اور لال ہوگئیں۔ خالہ کی ساس نے جو یہ منظر دیکھا تو فوراً اُن کی گود سے بچہ لے لیا۔ بچہ ویسے ہی پریشان تھا اس افتاد سے ایک دم رونے لگا' مگر فیڈر دے کر اسے چپ کرادیا گیا۔ ارم خالہ جو عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھیں ایک دم چلانے لگیں۔

''بس کرو عنایت......بس کرو...... مجھے چھوڑ دو میں اب نہیں آؤں گا۔ چھوڑ دو' تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چھوڑو نہیں تو میں تمہارے ساتھ ساتھ اس کمرے میں موجود تمام لوگوں کو ختم کر دوں گا۔''

یہ سب کچھ خالہ اپنی آواز میں نہیں بلکہ کسی آدمی کی آواز میں کہہ رہی تھیں اور ایسا محسوس

ہو رہا تھا کہ جیسے اگلے لمحے وہ عنایت صاحب کا گلہ دبوچ لیں گی۔ اتنے میں عنایت صاحب اپنا وظیفہ روک کر بولے۔

’’تو یہاں کب سے ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ پہلے تو مجھے یہ بتا پھر مجھے ختم کرنا اور یہ بتا کہ تو یہاں آیا کیوں؟ تیری یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تو کیوں ان گھر والوں کو ناحق پریشان کرتا رہا ہے؟ بول نہیں تو میں بہت ماروں گا۔‘‘

خالہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور بالکل خاموش، ہاتھ باندھ کر منہ بھینچ کر بیٹھ گئیں اور عنایت صاحب کو گھورنے لگیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اللہ اب کیا ہوگا؟ یہ دیکھ کر عنایت صاحب نے دوبارہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا اور چراغ سے تیل نکال کر جونہی خالہ کے سر پر لگایا تو وہ فوراً چیخنے لگیں۔

’’چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، ابھی بتاتا ہوں۔ اس چراغ سے مجھے نہ جلاؤ۔‘‘

’’یہاں تو آیا کہاں سے ہے؟‘‘ عنایت صاحب نے پھر پوچھا۔

’’حیدر آباد سے آیا ہوں۔‘‘

’’تو حیدر آباد سے یہاں کیسے آیا ہے؟‘‘

’’میں خود نہیں آیا بلکہ پھولوں کے ذریعے آیا ہوں۔‘‘

’’کیا مطلب؟ صحیح بول، گول مول جواب نہ دے، ٹھیک بتا۔‘‘

اور پھر اس جن نے بتایا کہ وہ ارم خالہ کی شادی والے دن آیا تھا۔ جو سہرا خالہ نے پہنا تھا وہ سہرا حیدر آباد سے آنے والے پھولوں سے بنا تھا اور جس باغ سے وہ پھول توڑے گئے تھے اس باغ میں میرا بسیرا تھا۔ پھولوں کے ساتھ میں بھی یہاں آ گیا کہ چلو گھوم لوں گا۔ اور جب میں نے رخصتی کے وقت دلہن کو دیکھا تو میں اپنے ہوش گنوا بیٹھا۔ یہ دلہن مجھے اتنی خوب صورت لگی کہ میں اس وقت سے ہی اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں۔ میں اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور چاہتا ہوں۔ میں تو پہلے ہی دن سے اس پر قابو پانا چاہتا تھا مگر یہ ہر وقت پاک صاف رہتی ہے اور نماز کے علاوہ وظائف بھی پڑھتی رہتی ہے اس لیے میرا اس پہ زور نہیں چلا۔ یہ مجھے حاصل نہیں ہو پا رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے ان لوگوں کو ختم کروں یا اس کی خوبصورتی کو ختم کر دوں۔ تب ہی میں نے اس کے خون چڑھانے میں گڑبڑ کر دی مگر برص ہو جانے کے بعد بھی اس کا شوہر اس سے بیزار نہیں ہوا تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے فساد پھیلانا شروع کر دیا۔ میں نے ہی اس کے بچے کو مارا ہے گھر میں جتنے ہنگامے فساد، دکھ تکالیف آئی ہیں، ان سب کا ذمے دار میں ہوں میں آپ سے بھی یہ بنتی (التجا) کرتا ہوں کہ اس کو میرے حوالے کر دو اور جو چاہے اس کے بدلے لے لو۔ یہ میری محبت ہے۔‘‘

اس پر عنایت صاحب بولے۔

’’تو اسے محبت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ تیری کیسی محبت تھی کہ اس کے گھر والوں کو اور اسے مسلسل نقصان پہنچاتا رہا۔‘‘

اس بات پر اس نے جواب دیا۔

’’مجھے پہل پہلی رات ارم کا شوہر پسند نہیں آیا، کہاں ارم کا حسن اور کہاں بشیر کالیا پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میں اس کے ساتھ رہ سکتا ہوں کیونکہ اس کا میاں اتنا پرہیز گار نہیں ہے پھر میں نے اس کے دیور کا ایکسیڈنٹ بھی کروایا کہ شاید مر جائے مگر اس کو اس کی جیب میں رکھی ہوئی سورۃ

یٰسین نے بچا لیا۔ عنایت میاں، ایک بات کان کھول کر سن لے کہ میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔‘‘ خالہ یہ کہہ کر بالکل خاموش ہو گئیں۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ نارمل آواز میں بولیں۔

’’یہ چراغ ابھی تک جل رہا ہے؟‘‘

اس کے بعد خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو عنایت صاحب نے سب کو جانے کی اجازت دے دی اور پروفیسر صاحب کو روک لیا۔ خالہ اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

امی نے پوچھا۔

’’ارم کیا ہوا؟‘‘

’’آپا میں سوؤں گی، میں تھک گئی ہوں وہاں بیٹھے بیٹھے۔‘‘ وہ بولیں۔

امی اور سب بڑوں نے کہا۔

’’اچھا سو جاؤ۔ کوئی بات نہیں۔‘‘

پھر ہم ان کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ ابھی آئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ خالہ کے رونے اور چیخنے کی آواز آئی ہم فوراً اِدھر بھاگے تو دیکھا خالہ زور زور سے رو رہی ہیں اور چیخ چیخ کر اول فول بک رہی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ عاصم کو بلاؤ میں اس کا خون پیوں گی۔ ایسا منظر ہم سب میں سے کسی نے بھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ساس اور امی نے ہمت کر کے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تو خالہ نے اپنی ساس کو زور سے دھکا دیا اور وہ نیچے گر گئیں پھر امی کی پیٹھ کر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ امی درد سے دہری ہو گئیں۔ امی چونکہ اندازہ کر چکی تھیں کہ اُن پر دورہ پڑا ہوا ہے اس لیے وہ آیۃ الکرسی کا ورد کر رہی تھیں۔ اتنے میں عنایت صاحب اور تمام

ہوا کے ہاتھ

ہوا کے ہاتھ پہ لکھا ہے تیرے نام یہ خط
کہ جس میں اس دل گمنام کی کہانی ہے
ادھورے خواب کی رنگین خامشی اوڑھے
اکیلی راہ پہ بچھڑی ہوئی جوانی ہے

ہوا کے ہاتھ پہ لکھے ہیں وہ سبھی شکوے
کہ جو نظر سے کبھی کنج لب پہ آ نہ سکے
وہ سب خیال مرے، منتشر ہواؤں سے
کسی بھی نقطۂ معنی پہ سر جھکا نہ سکے

میں ان ہواؤں سے کہہ دوں کہ اُن سے جا کے ملیں
یہ رات اب بھی اُسی چاند کو بلاتی ہے
بکھیرتے ہیں ستارے جو روپ کا کندن
نگاہِ شوق اسی راستے پہ جاتی ہے

ہوا کے ہاتھ پہ لکھا ہے تیرے نام یہ خط......

شائستہ مفتی

مرد حضرات آواز سن کر اوپر آ گئے۔ عنایت صاحب نے فوراً سب کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا اور کہا کہ باہر بیٹھ کر سب درود شریف پڑھیں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں یہ ٹھیک ہوجائیں گی اور پھر پروفیسر صاحب اور جیلانی میاں سے کہنے لگے کہ آج کام مکمل کرنا ہے۔

پروفیسر ریاض الدین صاحب کے پاس حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے موئے مبارک' روضہ پاک کی مبارک مٹی اور بزرگوں کے دیے ہوئے کافی تبرکات ہیں جو ان کے پاس محفوظ ہیں اور جن کو وہ بغیر وضو کے کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتے۔ وہ تمام تبرکات لے آئے اور ارم خالہ کے اوپر نچھاور کرتے جاتے اور کہتے جاتے۔

''الٰہی! میری بچی کو ٹھیک کردے۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اتنے بڑے آدمی کو اپنی بہو کے لیے روتے ہوئے دیکھا۔ ان سب کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی رونے لگے۔ ارم خالہ پر جب تبرکات کی بارش کی گئی تو وہ ایک دم نارمل ہوگئیں اور زور زور سے نعتیں پڑھنے لگیں اور کہنے لگیں کہ تم لوگ بھی پڑھو نہیں تو وہ مجھے مار دے گا۔ نعیمہ آپا! ادھر آؤ' میرے پاس' مجھ سے ڈرو نہیں' آپا مجھے کہیں چھپالو۔ پھر یہ کہہ کر رونے لگیں کہ وہ مجھے مار دے گا۔

ان کو صحیح ہوتا دیکھ کر امی نے فوراً اُن کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''بیٹی کیا ہوا' کیوں رو رہی ہو؟'' وہ کہنے لگیں۔

''آپا بہت مارتا' کہہ رہا ہے کہ چپ ہوجا' نعت نہیں پڑھ' نہیں تو ماروں گا۔ آپا' مجھے بچالو' وہ مجھے مار دے گا' ہائے اللہ' مار رہا ہے۔ چھوڑ دو' چھوڑ دے خبیث' میرے بال چھوڑ دے۔'' وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئیں۔

عنایت صاحب اور دوسرے حضرات پھر دوبارہ اسی طرح بڑے ہال میں جمع ہوگئے اور خالہ کو بھی وہیں بلالیا۔ خالو خالہ کو گود میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور وہاں جا کر لٹا دیا۔ خالو کو عنایت صاحب نے باہر جانے کا اشارہ کردیا۔ پروفیسر صاحب' عنایت صاحب اور جیلانی میاں' تینوں مرد حضرات خالہ کے ساتھ اندر رہے اور پھر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ان کو باہر لائے اور کہنے لگے۔

''یہ بالکل نارمل ہیں مگر تھک زیادہ گئی ہیں اس لیے ڈاکٹر بلوا کر ان کو نیند کا انجکشن لگوا کر ان کی نیند پوری کروائیں۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' پھر ہم سب سے بھی بولے۔

''آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔ آرام کریں سب بہتر ہوگیا ہے۔ اب وہ خبیث شیطان کبھی نہیں آئے گا۔''

وہ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب سے کہنے لگے۔

''چلیے حضرت صاحب! نماز پڑھنے چلتے ہیں۔ ویسے بھی قضا پڑھنی پڑے گی۔''

اس کے بعد خالہ کو پھر کبھی دورہ نہیں پڑا۔ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں مگر اب بھی ان کو کچھ باتیں معلوم ہیں اور کچھ نہیں۔ اب تو بچے بھی کافی بڑے ہوچکے ہیں۔ بڑے بچوں کو حالات کا علم ہے۔ اس واقعے کو ہم سب تقریباً بھول ہی گئے ہیں۔ جب کسی دوسرے کا واقعہ سنتے ہیں تو یاد آجاتا ہے۔ ابر خالہ کا برص اب بھی ٹھیک نہیں ہوا ہے مگر ان میں احساس کمتری ختم ہوگئی ہے اور اب ان میں اتنا اعتماد پیدا ہوگیا ہے کہ اب وہ سب کا سامنا آرام سے بغیر میک اپ کے کرتی ہیں۔

☆☆.....☆☆

وہ ذات وہ وجود

معراج جامی کی نظر

جس قدر دھندلے ہیں چہروں کے نقوش
روشنی تو اس قدر مدہم نہیں

فوزیہ فرید

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے اور نمرہ ابھی سے اپنی نانی کے گھر جانے کی تیاریوں میں مگن تھی۔ اس کی امی اس کی اس بے تابی کو دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔ نمرہ



تین بہنیں اور تین ہی بھائی تھے۔ نمرہ سب سے چھوٹی تھی سب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے اپنی ہر جائز ناجائز بات منوانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ان کا گھر چالیس گز پر بنا ہوا تھا اور دو منزلہ تھا۔

نمرہ کو اپنا گھر بہت چھوٹا لگا کرتا تھا۔ بقول اس کے ان کا گھر مرغی کا ڈربہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر ہو تو نانی کے گھر جیسا کھلا کھلا، ہوا دار بڑے بڑے کمروں والا جہاں انسان کا دم تو نہیں گھٹ سکتا۔ اسے نانی کے گھر میں بہت مزا آتا تھا وہاں پر اس کے ہم عمر کزن بھی تھے جو سب مل کر گھر کے ایک حصے میں بنے ہوئے چھوٹے سے باغ میں کھیلا کرتے تھے۔ اس باغ میں پھولوں کے پودوں کے علاوہ آم اور چیکو کے درخت بھی تھے کونے میں ایک چھوٹا سا امرود کا درخت بھی لگا ہوا تھا جس میں تھوڑے بہت امرود نکل آتے تھے۔

بچے اس میں سے کچھ امرود کو کھا کر ہی انجوائے کرلیا کرتے تھے۔ آم کے درخت پر جھولا ڈالا ہوا تھا جس پر باری باری بچے جھولا کرتے تھے آم اور چیکو کے درخت کا سایا پورے باغ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچے بڑے سکون سے اس حصے میں اپنی اپنی پسند کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دن تو ان بچوں کا کھیل کود میں گزر جاتا اور رات کو نانی سے فرمائش کر کے کہانی سننا روز کے معمولات میں شامل تھا۔ یہ تمام ایکٹی وٹیز نمرہ کو بے حد پسند تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نمرہ کو چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ تین دن بھی جیسے تیسے گزر گئے۔ نمرہ نے جب نانی کے گھر جانے کے لیے ابو سے اجازت مانگی تو اس کے ابو بولے۔

''آپ اجازت مانگ رہی ہیں یا اپنے جانے کی اطلاع دے رہی ہیں۔ تیاریوں کو دیکھ کر تو یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کو کوئی اجازت نہ بھی دے تو آپ نے ہر صورت جانا ہے۔'' ابو کے اس طرح کہنے سے نمرہ شرمندہ ہو گئی اور بولی۔

''ابو اگر آپ اجازت نہیں دیں گے تب میں نہیں جاؤں گی۔'' ابو مسکرانے لگے اور بولے۔

''میری بیٹی نے اتنی ڈھیر ساری تیاریاں کی ہیں۔ میں بھلا اسے کیسے منع کر سکتا ہوں۔ جاؤ بیٹا خوشی خوشی جاؤ مگر اس بات کا دھیان رہے کہ کوئی ایسا کام مت کرنا جو مجھے کوئی شکایت ملے۔''

نمرہ اجازت ملتی دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ ابو کا شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے کی طرف بھاگی کہ ابھی تو اور بھی پیکنگ کرنا تھی۔

☆......☆

دوسرے دن نمرہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ نانی کے گھر میں موجود تھی۔ نانی کا گھر ایک سو بیس گز پر مشتمل تھا۔ پہلے نانی کا گھر 80 گز کا تھا۔ اسی گھر سے امی کی شادی ہوئی تھی۔ امی کی شادی کے بعد جب کام کاج کے لیے نانی کو دشواری ہونے لگی تو نانی نے ماموں کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کروی۔ ممانی جان معمولی شکل وصورت کی تھیں مگر سیرت کی اچھی تھیں وہ سب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ نانی کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

نانا کے انتقال کے بعد ممانی نے نانی کا ہر طرح خیال رکھا تھا اور ان کی دل جوئی میں لگی رہتی تھیں یہاں تک کہ نانی نانا کو بھلانے میں کامیاب ہو گئیں۔ نانی نے پورے گھر کا انتظام ممانی کو سونپ دیا تھا۔ غرض کہ ممانی نے نانی کا گھر بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔

نانی کے گھر کے برابر میں کریم الدین صاحب رہتے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی تھی اتفاق سے بیٹی بھی گردن توڑ بخار میں چل بسی تو کریم الدین اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اسی گز گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصے کو کرائے پر چڑھا دیا تھا جب کہ دوسرے حصے میں انہوں نے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر اس میں مختلف قسم کے پودے لگا لیے تھے۔ آم اور چیکو کے درخت تو پہلے ہی موجود تھے۔ کریم الدین کی تنہائی کا یہ اچھا حل تھا وہ سارا وقت ان پودوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے اور کچھ ہی عرصے بعد جب ان پودوں میں ان کی لگائی ہوئی سبزیاں آنا شروع ہوئیں تو وہ بے انتہا خوش ہوتے وہ اکثر موسمی سبزیاں لگاتے اور ان سبزیوں کو ایک جاننے والے سبزی فروش کو سستے داموں فروخت کر دیتے تھے۔

ان کی دن رات کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا گھر ایک چھوٹے سے باغ میں تبدیل ہو گیا مگر خود ان کی صحت گرتی چلی گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بستر سے جا لگے اس وقت نانا نے ان کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ نانا کی خدمت سے متاثر ہو کر کریم الدین نے اپنا گھر نانا کو سستے داموں میں فروخت کر رہا تھا اور کچھ دنوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے انتقال کے بعد نانا نے ان کا گھر اپنے گھر میں شامل کر لیا تھا اور باقی کا گھر کرائے پر ہی رہنے دیا۔ کچھ عرصے بعد نانا کا بھی انتقال ہو گیا تو نانی اداس رہنے لگیں۔ نانی نے اپنی اداسی دور کرنے کا حل یہ نکالا کہ اس باغ کی دیکھ بھال کرنے لگیں اس سے باغ کی دیکھ بھال بھی ہونے لگی اور نانی کا دل بھی بہل گیا تھا باقی کا وقت بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ ان کو تمام پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں میں نمرہ سب ہی کو زیادہ عزیز تھی وہ اس کی کسی بات کو رد نہیں کیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب نمرہ ان سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتی تو وہ باوجود طبیعت کی خرابی کے اسے کہانی سنایا کرتی تھیں۔

اس دن نمرہ نے نانی سے کہانی سنانے کے لیے کہا تو وہ بولیں۔ بیٹا ایسا کرو عاشی کو بھی بلا لو وہ بھی تمہاری طرح کہانی سننے کی شوقین ہے۔ جاؤ بیٹا اسے بھی بلا لاؤ۔'' میں عرشی کو بلانے چل دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نانی کے بیڈ پر بیٹھے ان سے کہانی سن رہے تھے۔ کہانی مکمل ہوئی تو پوتیوں، نواسے نواسیوں نانی نے کہا۔

''بیٹا اب رات ہو گئی ہے تم بھی جا کر سو جاؤ اور مجھے بھی آرام کرنا ہے۔'' میں نے عاشی سے کہا۔

''عاشی تم جاؤ میں نانی کے ساتھ سوؤں گی۔'' عاشی بولی۔ ''میں بھی دادی کے ساتھ سوؤں گی۔'' میں نے عاشی سے کہا تم تو ہر وقت نانی کے ساتھ رہتی ہو تم کسی اور وقت سو جانا آج مجھے سونے دو۔'' عاشی نے کہا۔

''یہ میری دادی ہیں۔ میں ان کے ساتھ سوؤں گی تم مجھے کیوں منع کر رہی ہو۔ یہ تمہاری نانی بعد میں پہلے میری دادی ہیں۔''

ہماری تکرار سے تنگ آ کر نانی نے کہا تم دونوں جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو۔ میں نے نانی سے کہا۔

''نانی آپ عاشی سے بولیں یہ اٹھے اور اپنے کمرے میں جائے۔ بس مجھے آپ کے ساتھ سونا ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اور مجھے بھی یہیں سونا ہے۔'' یہ کہہ کر عاشی نانی کے برابر میں لیٹ گئی۔

یہ دیکھ کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے ان کے کمرے سے نکل کر باہر آئی اور اپنا تکیہ اور چادر اٹھا کر نانی کے کمرے کی دہلیز پر اپنا تکیہ رکھا اور چادر تان کر لیٹ گئی۔

نانی نے مجھ سے کہا۔ ''نمرہ بیٹا دروازے کے بیچوں بیچ نہیں لیٹا کرتے۔ آؤ تم میرے پاس آ جاؤ۔'' پھر انہوں نے عاشی سے کہا۔ ''عاشی بیٹا تم اپنے کمرے میں جاؤ نمرہ تو کبھی کبھار آتی ہے۔ اسے میرے پاس لیٹ جانے دو تم کل لیٹ جانا، جاؤ بیٹا اچھے بچے بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔'' نانی کے کہنے پر عاشی بیڈ سے اتر کر دروازے کے پاس آئی اور رک کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''نمرہ مجھے باہر جانا ہے راستے سے ہٹو۔'' مگر میں ایسے ہی لیٹی رہی اس نے مجھ سے دوبارہ ہٹنے کو کہا مگر میں اسی طرح لیٹی رہی۔ اس نے مڑ کر نانی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''دیکھیں نانی! نمرہ مجھے باہر جانے کا رستہ نہیں دے رہی۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

نانی نے مجھ سے کہا۔ ''نمرہ! بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے پریشان مت کرو آ جاؤ میرے پاس اور عاشی کو جانے دو۔''

میرا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ اس لیے نانی کی بات بھی میں نے نظر انداز کر دی۔ کچھ دیر تک نانی مجھے آ جانے کے لیے کہتی رہیں مگر میری ہٹ دھرمی دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ عاشی نے بھی جب دیکھا کہ میں ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہوں تو وہ واپس جا کر نانی کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

کمرے میں مکمل خاموشی ہو گئی تو مجھے بھی نیند آنے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ابھی ابھی میرے چہرے پر لال بیگ چل کر گیا ہو۔ اس کی کانٹے دار ٹانگیں میرے چہرے سے مس ہوئی تھیں جس کی چبھن سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ لال بیگ کو ماروں معاً مجھے اپنے چہرے پر ایک بار پھر وہی احساس ہوا۔ میں نے پھرتی سے ہاتھ سے اسے چہرے پر سے جھٹکا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پھر وہی لال بیگ میرے چہرے پر چل رہا تھا۔ میں نے جب اپنے پورے جسم پر یعنی سر سے پیر تک چادر ڈال لی تو اس لال بیگ کا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔ میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتی تو کچھ نہ ہوتا تھا مگر ہاتھ ہٹاتے ہی پھر وہی محسوس ہوتا اس کے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے چہرے پر کسی کی انگلیوں کا مارنا محسوس ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنے ہاتھوں کی پوروں سے میرے چہرے پر ضرب لگا رہا ہو۔ ان انگلیوں کے ناخن مجھے اپنے چہرے پر چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے ہمت کر کے ان ہاتھوں کو پرے دھکیلا تو وہ میکانی انداز میں دوبارہ میرے چہرے پر آ موجود ہوئے۔ مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان ہاتھوں کو دور کیا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ ہاتھ میرے ہاتھ کے ساتھ لگ کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا اور پھر اسی طرح میرے چہرے پر انگلیاں مارنے لگا۔ خوف سے میرا برا حال تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے سینے پر کسی کی

موجودگی کا احساس ہوا۔ میری ساری توجہ کیونکہ اپنے چہرے پر تھی اس لیے میں کچھ اور محسوس ہی نہ کرسکی تھی۔ اس دوہری مصیبت کی وجہ سے مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ اتنی بے بسی کی موت میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے ایک بار پھر کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا واقعی میرے ساتھ یہ سب کچھ کسی غیر مرئی مخلوق کی کارستانی ہے یا کسی کی شرارت ہے۔ یہ جاننے کے لیے میں نے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی چادر کو ہاتھوں پر تان کر چادر کے اندر سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

باہر کا منظر میرے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ خوف سے میرا پورا جسم کانپ رہا تھا پسینے کی وجہ سے میرا پورا جسم تر ہو چکا تھا۔

میں نے جب چادر تان کر باہر دیکھا تو کوئی میرے سینے پر سوار تھا اور وہ تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا۔ کبھی اس کا چہرہ میرے چہرے کے پاس آجاتا کبھی واپس چلا جاتا، اس وجود کے اردگرد دودھیا روشنی نے ہالا کیا ہوا تھا۔ اس روشنی کی وجہ سے میں اس وجود کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرے خوف اور اس وجود کی حرکت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وجود کے وزن کی وجہ سے میری سانس رکتی جا رہی تھی میں بے بسی سے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

میرے اندر جینے کی امنگ نے اسی لمحے مجھے آخری کوشش کر لینے پر اکسایا میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اس وجود کو پرے دھکیلنے کی کوشش کی جس میں، میں کامیاب رہی اور پھر ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر میں اپنی نانی کے کمرے کی طرف دوڑ گئی چادر بھی میرے پیروں میں الجھتی ہوئی میرے ساتھ تھی۔ میں چادر سمیت گرتی پڑتی نانی کے بیڈ پر چڑھ گئی۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ میرے اس اچانک ردعمل کی وجہ سے بے خبر سوئی ہوئی نانی کا کیا حال ہوگا۔ میں بیڈ پر آتے ہی نانی سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے رونے کی آواز سن کر دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے ماموں اور ممانی بھی گھبرائے ہوئے نانی کے کمرے میں آگئے۔ نانی مجھے خود سے چمٹائے ہوئے یہی پوچھے جا رہی تھیں کہ آخر ہوا کیا ہے۔ "تم بتاتی کیوں نہیں ہو۔"

میرے الفاظ جیسے میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

میرے الفاظ جیسے میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

میرے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔ ممانی نے عاشی کو پانی لانے کو کہا۔ عاشی پانی لے کر آئی تو ممانی نے مجھے پانی پلایا اور مجھے حوصلہ دیا۔

ماموں نے مجھ سے پوچھا۔

"بیٹا کیا بات ہے تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو اور تم اتنی بری طرح رو رہی ہو۔ ہمیں بتاؤ دیکھو پریشان مت ہو ہم سب تمہارے پاس ہیں۔ ڈرو نہیں کیا ہوا تھا جو تم یوں رو رہی ہو۔"

سب کو اپنے آس پاس دیکھ کر پھر ماموں کے تسلی کی بدولت مجھے حوصلہ سا ہوا پھر جو کچھ مجھ پر بیتا تھا میں نے حرف بہ حرف سب کے گوش گزار کر دیا اس کے ساتھ ہی میں نے کل ہی گھر واپس جانے کا فیصلہ بھی سنا دیا۔

سب حیران تھے کہ اس گھر میں رہتے ہوئے انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ کبھی بھی اس قسم کا کوئی بھی واقعہ ان کے ساتھ پیش نہ آیا تھا پھر اب یہ کیسے ہو گیا تھا۔ انہیں اس بات کو لے کر بڑی حیرت تھی مگر میری بدحواس صورت دیکھ کر انہیں یقین کرنا پڑا تھا۔ وہ رات سب نے جاگ کر گزاری تھی۔

☆......☆

صبح ماموں جیسے ہی ناشتے سے فارغ ہوئے تو میں اپنا بیگ لے کر آگئی اور ان سے کہا۔ چلیں ماموں میں تیار ہوں۔"

انہوں نے میری تیاری دیکھی پھر کہا۔ "بیٹا پہلے ناشتا تو کرلو۔" پھر وہ بولے۔

"بیٹا تم نے سوچا ہے تمہارے یوں صبح ہی صبح جانے سے باجی اور بھائی صاحب کتنے پریشان ہوں گے۔ میری بات مانو دوپہر تک رک جاؤ پھر چلی جانا یا پھر شام تک انتظار کرلو میں دفتر سے آتے ہی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

ان کی بات سن کر میرا چہرہ لٹک گیا اس وقت اس گھر کی کوئی چیز بھی اچھی نہ لگ رہی تھی۔ اس لیے ماموں کی بات سن کر میں چپ ہو گئی۔

میرے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے دیکھ کر ماموں نے کہا۔

"بیٹا! پرامس آج ہی آپ کو میں آپ کے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے۔"

میں جانتی تھی ماموں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اس لیے مجھے ان کی باتوں کا یقین کرنا پڑا اور واقعی اسی شام کو میں اپنے گھر میں موجود تھی۔ اس واقعے کے بارے میں ماموں نے امی کو مختصراً بتا دیا تھا۔

نانی کے گھر سے آنے کے بعد میرا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ابو کے ایک جاننے والے نے ابو کو ایک صوفی صاحب کا پتا دیا تھا۔ ابو مجھے لے کر وہاں گئے تھے۔ انہوں نے پوری بات سننے کے بعد کہا تھا کہ دن اور رات کے ممنوع اوقات میں دروازوں کے درمیان لیٹنا بیٹھنا نہیں چاہیے۔ بچی سے بہرحال یہ غلطی سرزد ہو چکی ہے آپ اسے لے کر دوبارہ اسی جگہ جائیں اور اسی ٹائم میں کہ جس وقت اس نے وہاں لیٹنے کی غلطی کی تھی معافی مانگے۔"

اس کے علاوہ انہوں نے ایک تعویذ گلے میں پہننے کے لیے دیا تھا اور دم کیا ہوا پانی پینے کے لیے دیا تھا۔ ان کے بتائے گئے طریقے پر عمل کرنے کی وجہ سے آج تک دوبارہ پھر میرے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

اس کے بعد پھر کبھی میں نانی کے گھر رکنے کے لیے نہیں گئی بس دن ہی دن کے لیے جاتی اور اسی دن واپس آجاتی تھی۔ اس واقعے کو گزرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے مگر آج بھی اس رات کو پیش آنے والا واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

☆☆......☆☆

اسپانڈئو

برلن کا اسپانڈؤ قید خانہ 1887ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں 600 قیدیوں کے رکھنے کی گنجائش تھی۔ تاہم بعد میں ایک وقت آیا جب اسپانڈؤ قید خانے میں صرف ایک قیدی رہا کرتا تھا۔ وہ قیدی دوسری جنگ عظیم کا نازی مجرم رڈولف ہیس (پیدائش 16 اپریل 1894ء وفات 17 اگست 1987ء) تھا 1976ء میں اس جیل خانے کے عملے کی تعداد 105 تھی اور ان لوگوں پر سالانہ 4 لاکھ 15 ہزار ڈالر خرچ کئے جا رہے تھے۔ 19 اگست 1987ء کو یہ اعلان کیا گیا کہ ہیس نے بجلی کے تار کی مدد سے گلا گھونٹ کر خودکشی کر لی ہے اور اس نے مرنے سے پہلے ایک تحریر چھوڑی جو قدیم جرمن زبان میں لکھی ہے۔۔ اسپانڈؤ کی ایک کال کوٹھری میں اس نے اپنی زندگی کے 40 سال قید تنہائی میں گزار دیے تھے ۔۔اس کی موت کے دو ماہ بعد یہ قید خانہ مسمار کر دیا گیا۔



ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ پُراسرار سلسلہ جسے آپ عرصۂ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید اجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا موقلم
تمثال پہ نقطے لگا کیے' تصویر بدلتی چلی گئی

(چوتھی قسط)

شازلی سعید مغل

سید صاحب کے بارے میں کچھ باتیں مشہور تھیں کہ بچپن سے جنات اُن کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں' اس میں کتنی سچائی تھی' کتنی نہیں' لیکن ایک بات ضرور تھی کہ جب بھی سید صاحب اپنے کسی بھی قسم کے دورے پر گھر سے نکلے ہوتے تھے' اُن دنوں بھی اُن کے گھر پُراسرار قسم کے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری وساری رہتا تھا۔

اول تو اُن کے پیچھے اُن کے گھر کوئی جاتا ہی نہیں تھا مگر اگر کوئی رشتہ دار بحالت مجبوری کسی قسم کی مصیبت میں پھنس کر اس طرف بغیر اطلاع کے نکل جاتا تو اُن کے مریدین (بقول سید صاحب یہ چند پُراسرار قسم کے قد آور انتہائی پُرکشش مرد و زن اُن کے مریدین ہیں) جنگل کی حدود میں داخل ہونے والے اس فرد کا راستہ روک لیتے اور انتہائی ملاحت بھرے بے شکن چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے اُس فرد کے گوش گزار کر دیتے کہ سید صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ اس کے بعد کسی رشتے دار کی کبھی ہمت ہی نہیں پڑی جو وہ اُن سے اس سلسلے میں کوئی لمبی چوڑی بحث کرے۔

محسن شیرازی اور صولت بیگم نے بھی کبھی اُن سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُن کے لیے یہ بات بھی بڑے اعزاز کی تھی کہ اُن کے کاندان کی ایک انتہائی معتبر اور بزرگ ہستی اُن کے اکلوتے بیٹے کی شادی میں نہ صرف شریک ہوئی بلکہ خلافِ معمول وہ محسن اور فائزہ کی شادی میں تین دن متواتر اُن کے گھر ٹھہرے' ایسا اعزاز سید صاحب نے آج تک خاندان میں کسی کو نہ بخشا تھا کہ وہ کسی کے بیٹے یا بیٹی کی شادی میں ٹھہرے ہوں۔

ہاں اُن کا یہ اصول بڑا کڑا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں خوشی اور غم کے مواقع میں شرکت ضرور کرتے' اس کے علاوہ چاہے سالوں گزر جائیں وہ کسی کے گھر شاذ ہی جاتے تھے' جیسا کہ اُن کے ہاں محسن کی شادی پر آئے تھے اور اب اُن کو چار سال ہو رہے تھے' بس فون پر ہی حسن شیرازی ان سے علیک سلیک

کر لیتے تھے۔

اِس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد صولت جہاں نے سید صاحب کو فون کیا تھا' وہ سید صاحب کو اس نئے گھر میں بلانا چاہتی تھیں' سید صاحب نے دعوت بھی قبول کر لی تھی' مگر انہیں فرصت نہ مل سکی اور یوں ابھی تک وہ اس گھر میں نہیں آ سکے۔ اب جو اُن کے گھر میں یہ واقعات ہو رہے تھے تو اُن کا ذہن فوراً سید صاحب کی طرف چلا گیا' وہ تو اس وقت اپنی عقل پر ماتم کر رہی تھیں کہ اتنے دن سے اُن کے دل و دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ وہ سید صاحب سے رجوع کر لیں' اب وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئیں کہ رات ہی وہ اپنے شوہر سے بات کریں گی' انہوں نے اب تمام واقعات شوہر کو تفصیل سے بتانے کی ٹھان لی تھی۔

''کیا..... کیا کہہ رہی ہو؟'' حسن شیرازی نے صولت جہاں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُن کو اُن کی دماغی صحت پر شبہ گزر رہا ہو۔

''مگر یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ آپ سب سن کر اتنا بگڑ رہے ہیں' مجھے حیرت ہو رہی ہے اور پھر میں تو سید صاحب سے بس مشورہ کرنا چاہ رہی ہوں۔''

''سید صاحب کیا سوچیں گے کتنا فالتو سمجھ رکھا ہے ہم نے اُن کو' اوٹ پٹانگ خواب فضول سوچیں باتیں' ہمیں تو اب تک ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ حسن شیرازی اب بیٹھے سے ہی اُکھڑ گئے تھے۔ انہوں نے ناک پر عینک درست کر کے صولت جہاں کو گھورا۔

اِس وقت وہ ایک تاریخی ناول پڑھ رہے تھے۔ صولت جہاں نے جب بات شروع کی اور تمہید باندھی کہ ایک بہت ضروری بات ہے اور آج ہی کرنی لازمی ہے تو انہوں نے اپنا پسندیدہ ناول ایک طرف دھر دیا تھا' اور ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔

وہ رات میں کچھ دیر مطالعے کے عادی تھے اور پھر اسیران کا تاریخی من پسند ناول جو انہوں نے کل ہی شروع کیا تھا' اس وقت کلائمکس پر تھا کہ صولت جہاں کی پُراسرار سرگوشی' کہ بے حد ضروری بات ہے نے اُن کا کلائمکس توڑا.....

اور پھر اُن کی ضروری بات سن کر حسن شیرازی کا ٹھیک ٹھاک موڈ خراب ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر ناول اُٹھا کر نشانی لگاتے ہوئے ورق کو نکالا اور ناول منہ کے آگے کر لیا۔

''آپ جانتے ہیں میں وہمی نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ڈرپوک قسم کی عورت واقع ہوئی ہوں۔'' صولت جہاں نے دبے دبے لہجے میں بولا اور چور نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں سے صحن کا آدھا حصہ بہ خوبی نظر آتا تھا' اور وہ آدھا حصہ املتاس کے درخت پر مشتمل تھا۔

اُن کی کھڑکی کے سامنے صحن میں املتاس کا درخت ہوا کی تال پر جھوم رہا تھا' رات کے اس پہر بارہ بجنے جا رہے تھے صحن میں برقی قمقموں کی ہلکی دودھیا سی روشنی اسرار پھیلا رہی تھی۔ اس سے زیادہ ان سے نظارہ نہیں ہوا آگے بڑھ کر پردہ گرا دیا۔ انہوں نے ایک نظر شوہر کی طرف ڈالی' وہ ناول میں از سرِ نو منہمک ہو چکے تھے۔

صولت جہاں نے ایک بار پھر بات جہاں سے ٹوٹی تھی جوڑی' انہوں نے جیسے ٹھان ہی لی تھی وہ حسن صاحب کو آج رات قائل کر کے ہی دم لیں گی۔

''صرف خواب کی حد تک بات ہوتی تو یقین کیجیے میں دو چار دن میں بھول سکتی تھی' مگر آپ ہی مجھے بتائیے کہ بیداری کی حالت میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ایسے واقعات کے ایک تسلسل سے گزرنا' وہ مانوس انوکھی مہک جو خواب و بیداری دونوں حالتوں میں اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی ہے کیا ہے؟ اور اور پھر یہ سب میرے ساتھ نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے اب بالکل واضح یقین ہو چلا ہے کہ یہ سب میری بچی میری املتاس سے جڑا ہے۔ کہتے کہتے صولت جہاں اب روہانسی سی ہو گئیں تھیں' کچھ ہی پل تھے آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔

''مجھے ہماری املتاس کچھ انوکھی سی کچھ خاص سی بچی لگتی ہے' دوسرے بچوں سے مختلف..... ہر ماں باپ کو اپنا بچہ دنیا کے تمام بچوں سے انوکھا اور خاص نظر آتا ہے' اور بعض لوگ تو اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔''

حسن شیرازی کو صولت جہاں کے گلوگیر لہجے اور اُن کی حالت نے ایک بار پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔

''دیکھو صولت..... محسن ہمارا اکلوتا بیٹا ہے' میں جانتا ہوں تم نے ہمیشہ سے ایک ننھی گڑیا کے خواب دیکھے تھے' تم اورنگ زیب کے وقت بھی شاید ایسی خواہش اور اس کے لیے پاگل نہ تھیں' جیسا کہ املتاس کے لیے ہو' یہ نیچرل ہے صولت' ہوتا ہے ایسا' اب جا کے تمہیں ایک ننھی گڑیا ملی تو تم نے اُسے کانچ کی گڑیا بنا لیا' انوکھی اور خاص' جب تمہاری سوچ انوکھی ہے خاص ہے' سب سے الگ ہے' یہ گردش کریں گی تو تمہارے ساتھ واقعات بھی ایسے ہی ظہور پذیر ہوں گے' انوکھے خاص۔'' حسن صاحب نے اپنے تئیں املتاس کے حوالے سے ہونے والے پے در پے واقعات کو صولت جہاں کا املتاس کے حوالے سے اتنا حساس ہونا ثابت کیا تھا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے بلکہ دکھ ہو رہا ہے کہ میں اپنی بات آپ کو' یا یوں کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہے کہ اپنی انتہائی پریشانی آپ کو سمجھا نہیں پائی۔' صولت دلگیر لہجے میں گویا ہوئیں۔

''آپ میری اس تمام پریشانی کو جو ان پے در پے ہونے والے پُراسرار واقعات کی وجہ سے آج انتہائی عروج پر تھی' پاگل پن پہ محمول کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ بھی آپ میری اس بات پر غور کرنے کو تیار نہیں ہو رہے تو بس ٹھیک ہے۔'' صولت جہاں شکست خوردہ لہجے میں بولیں اور تھکے تھکے انداز سے چلتی ہوئی بستر تک آئیں اور جیسے ڈھے سی گئیں۔

حسن شیرازی کچھ دیر صولت جہاں کی طرف دیکھتے رہے' اُن کا دل کچھ ملول سا ہونے لگا تھا اندر سے ایک آواز سی اُبھری۔

''کیا مجھے صولت کی باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ اور ایسی باتوں کے لیے سید صاحب کو تکلیف دینا بہتر ہو گا؟''

اُن کے دل و دماغ میں ہلکا سا شور برپا ہو چکا تھا' حسن شیرازی نے یک لخت سر کو جھٹکا اور خود بھی اب سونے کی تیاری کرنے لگے' دیوار گیر گھڑی ایک بجنے کا عمل دکھا رہی تھی۔

دوسری صبح صولت جہاں خلافِ معمول بہت خاموش تھیں' یہ بات سب نے نوٹ کی' بیٹے بہو نے

دریافت کیا بھی تو انہوں نے طبیعت کی سستی موسم کے بدلاؤ پر رکھ دی' اس بات سے کوئی بھی واقف نہ ہوسکا سوائے حسن شیرازی کے طبیعت کے اس بوجھل پن میں موسم قصور وار نہ تھا۔ انہیں معلوم تھا ساری رات صولت سُو نہیں سکی تھیں' سو تو وہ بھی نہیں سکے تھے' صولت جہاں کو تو انہوں نے کہہ سن دیا تھا' اُن کی باتوں سے اختلاف کیا تھا مگر دل و دماغ میں برپا ہونے والا شور صبح تک اپنی حجت قائم کر گیا تھا' انہوں نے محسوس کیا تھا کہ انہیں ایک بار ضرور صولت کی باتوں پر توجہ دینی چاہیے اور اس نہج پر ایک بار ضرور سوچ لینے میں کوئی حرج نہیں' مگر یہ بات وہ صولت جہاں سے ابھی کہہ نہ سکے تھے۔

کیونکہ انہیں محسن کے ساتھ نکلنا تھا اور اس سلسلے میں دیر ہو رہی تھی وہ سوچ کر اٹھے تھے کہ رات میں وہ اپنے فیصلے سے صولت جہاں کو آگاہ کریں گے تو' وہ ضرور سکون محسوس کریں گی اور طبیعت کا یہ بوجھل پن ختم ہو جائے گا۔

ناشتے کے بعد حسن شیرازی محسن کے ساتھ آفس کے لیے نکل گئے۔ صولت جہاں کمرے میں آ کر لیٹ گئیں۔ پوری رات میں ایک آدھ بار غنودگی سی طاری ہوئی تھی اُن پر' مگر وہ نیند کے حواسوں میں داخل نہ ہوسکی تھیں' ابھی بھی انہوں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

باہر سے فائزہ اور جمن دادا کے بولنے کی متواتر آوازیں آ رہی تھیں' دونوں دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے' یہ روز کا معمول تھا۔

ناشتے کے بعد جمن دادا کاپی پنسل سنبھال کر کھانے کی میز پر آ جاتے اور دوپہر' رات کے کھانے سے متعلقہ سبزی ترکاری' گوشت' مچھلی جو جس کی پسند ہوتی' اس کی لسٹ بناتے اور بازار کا رخ کرتے اِس وقت چونکہ صولت بیگم کی ناسازی طبع کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا' چنانچہ وہ فائزہ کے ساتھ بیٹھ کر لسٹ بنا رہے تھے۔ جمن دادا کی پاٹ دار آواز یکبارگی فائزہ کو کسی بات پر ابھری تو صولت جہاں کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔

''جمن دادا...... جمن' ہاں جمن مجھے اب یہی کرنا ہوگا۔'' یہ سوچ کر تھوڑا سا سکون آیا اور آنکھ لگ سی گئی۔

☆......☆......☆

دوپہر کے کھانے کے بعد ایک طویل نشست میں جمن دادا اور فائزہ بیگم کے مابین کچھ طے پایا تھا۔

پروگرام کے تحت دوسرے دن وہ جمن دادا کے ساتھ ساحل سمندر کی جانب سفر کر رہی تھیں۔ وہ راستے میں تقریباً تین سے چار بار تو پوچھ ہی چکی تھیں۔

''جمن دادا تم کو پتہ تو اچھی طرح معلوم ہی ہے نا؟'' جمن نے ہر بار اُن کی تسلی کی تھی۔

''ارے صولت بی بی' آپ ناحق پریشان مت ہوں' مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور نگریز' ہمیں ملے گا نا ساحل سے پہلے' نگریز سے ہمارا ملنا جلنا ہے' ہم جانتے ہیں اس کو۔''

جمن دادا نے تسلی دی تھی۔

صولت جہاں کو فکر راستے کی نہیں تھی' اصلی بات انہیں اندر ہی اندر بہت پریشان کر رہی تھی' اور وہ یہ کہ وہ زندگی میں پہلی بار عہد شکنی کی مرتکب ہونے جا رہی تھیں' جب سے اُن کی شادی ہوئی تھی انہوں نے اپنے

شوہر کے علم میں لائے بغیر بنا اجازت کوئی بھی کام نہیں کیا تھا اور آج وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہی تھیں اُن کے شوہر کو اس کا علم تو کجا ایسا تصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ایک دن اولاد کی محبت میں وہ ایسی عہد شکنی کی مرتکب ہو سکتی ہیں مگر اب تو وہ گھر سے نکل ہی گئیں تھیں۔

کل رات جب حسن شیرازی نے اُن کی بات بری طرح رد کر دی تھی تو انہوں نے جمن دادا سے سارا احوال کہہ دیا۔ جمن دادا غیر نہیں تھے' اس گھر کے جدی پشتی نمک خوار تھے' صولت جہاں کے بڑے بھائی بنے ہوئے تھے' سارا ماجرا سن کر ہول اٹھے تھے اور جب صولت بیگم نے حسن صاحب اور اپنے درمیان الماس سے جڑے واقعہ کی گفتگو بتائی اور جمن دادا سے کچھ کرنے کو کہا وہ فوراً تیار ہو گئے وہ کافی سوشل قسم کے انسان تھے۔ ہر طرح کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ عجیب حیران کن اور عقل سے ماورا انسانوں کے ساتھ ساتھ چلتی آس پاس بستی' دوسری دنیاؤں پر یقین رکھتے تھے' جن کا عام انسانوں کو ادراک یا یوں کہہ لیں احساس تک نہیں ہو پاتا جب تک ان پُراسرار متوازی چلتی دنیا کے کردار خود اپنا آپ آشکار نہ کرنا چاہیں۔

جمن دادا ایک تھرل پسند طبیعت کے مالک تھے فوراً سے پیشتر صولت جہاں کو کسی عامل بابا سے ملنے اور خود لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ شومئی قسمت کہ حسن شیرازی کو دو دن کے لیے نواب شاہ جانا پڑ گیا۔ جانا تو محسن کو بھی تھا مگر چونکہ ابھی وہ لوگ نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے اور چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا چنانچہ حسن صاحب نے محسن کو منع کر کے خود جانا پسند کیا' اور پھر وہ اکیلے نہ تھے' ان کے ساتھ محسن کا پارٹنر بھی جا رہا تھا' چنانچہ وہ اطمینان سے اپنے کاروباری سفر پر نکل گئے' دو دن کی ہی تو بات تھی' انہوں نے سوچا آ کر وہ صولت جہاں سے بات کریں گے' مگر اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی صولت جہاں جمن کے ساتھ نکل پڑی تھیں اور اب سارے راستے عجیب سی متضاد کیفیات کا شکار ہو رہی تھیں۔

اِس میں سے ایک خیال تو یہی ستا رہا تھا کہ جمن اُن کو کسی روایتی عامل بابا سے ملوانے لے جا رہا ہے' انہیں کسی آستانے یا کسی درگاہ مزار وغیرہ پر لے جایا جائے گا۔ جہاں حاجت مندوں کا جم غفیر ہوگا' عامل بابا کی روایتی تن و توش سی شخصیت نگاہوں میں گھوم جاتی' انہیں معلوم تھا کہ طرح طرح کے لوگ باقاعدہ دکانیں سجا کر بیٹھے ہوئے ہیں' جن بھوت آسیب ہوائی چیزوں کے باقاعدہ ماہر کہلاتے تھے خود کو' محبوب کو قدموں میں ڈالنے کا دعویٰ' پلک جھپکتے دشمن مٹی میں ملا دینے کا دعویٰ کرنے والے' راتوں رات کایا پلٹنے کا دعویٰ ہو یا سٹے کا نمبر سے لے کر پرائز بانڈ کا نمبر تک بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور شہر کی دیواریں ایسے نت نئے اشتہار کی مفت ترسیل کا سبب بنتی جا رہی تھیں' کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں تھا' باقاعدہ مافیا کام کر رہا ہو ایسا محسوس ہوتا تھا انہیں' کبھی کبھی' اور آج وہ خود اس موڑ پر آ گئی تھیں کہ سید صاحب جیسے خاندانی معتبر اور سچے بزرگ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک انجان عامل سے ملنے پر مجبور ہو گئیں تھیں۔

صولت جہاں اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھیں کہ جمن دادا نے ٹیکسی رکوائی' ٹیکسی رکتے ہی کچھ فاصلے پر بنی ایک سڑک کنارے ٹائر شاپ پر کھڑا ایک درمیانی قد کاٹھ کا لڑکا ٹیکسی کی طرف بڑھ آیا' اور ہاتھ کے اشارے سے اُس نے جمن دادا کو اور صولت جہاں کو سلام کیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کدھر چلنا ہے نگریز؟'' جمن دادا نے پوچھا۔

گلریز نے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور ڈرائیور کو راستہ سمجھانے لگا' دو رویہ چھوٹی سڑکیں گزرتی تھیں جن کے اطراف قدیم و جدید امتزاج سے ہم آہنگ بنگلو بنے ہوئے تھے' تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی ڈرائیو کے بعد' وہ سرسراتے درختوں کے درمیان مٹیالی رنگت اور بدہیئت گیٹ والے بنگلے کے سامنے کھڑے تھے جس کی دیواروں سے جابجا سوکھی بیلیں یوں چمٹی ہوئیں تھیں جیسا کہ کوئی خون آشام' بنگلے کے اندر بل کھاتی روش کے دونوں اطراف جابجا سوکھی پیلی مدقوق گھاس' ٹنڈ منڈ درخت تقریباً اجڑی ہوئی پھولوں کی کیاریاں عجیب سا منظر پیش کر رہی تھیں' سوکھے پتے اِدھر اُدھر یوں شور مچاتے پھر رہے تھے جیسے وہ اس اجاڑ پر احتجاج کر رہے ہوں۔

''اوہ یار گلریز یہ تو کہاں لے کر آ گیا مجھے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں اُتار کر ٹیکسی ایک درخت کے نیچے آگے جا کے لگائی تھی اس بات کے قطع نظر کہ سواریاں کہاں اور کیوں آئی ہیں وہ مگن سا اپنی ٹیکسی کی جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا۔

ٹیکسی جمن دادا نے آنے اور واپس جانے کی طے کی تھی' انتظار کرنے کے پیسے الگ سے دینے کا وعدہ تھا' ٹیکسی والا فوراً راضی ہو گیا اس ساحلی آبادی میں سواری ملنا کوئی آسان نہ تھا اس ویسے بھی ساحل سے دور اس طرف حال حال آبادی تھی۔ صولت جہاں پریشان تھیں۔

''لگتا ہے اس مکان میں کوئی نہیں رہتا...... جمن واپس چلنا چاہیے' شکر ہے ہم نے ٹیکسی روک کے رکھی ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائیں' گلریز نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ارے لڑکے ہم تم سے کچھ کہہ رہے ہیں؟'' جمن دادا اس مرتبہ تھوڑے طیش میں آئے' گلریز مسکراتا ہوا' انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا' کیونکہ اس بدہیئت سال خوردہ گیٹ تک پہنچنے کے لیے چار پانچ سیڑھیاں تھیں۔

گلریز نے اطلاعی گھنٹی بجائی' گیٹ کے پیچھے کھٹ پٹ کی آواز آئی اور گیٹ کھل گیا۔ گلریز نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا' جمن دادا اور صولت جہاں گلریز کے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔

گیٹ تو کھل چکا تھا مگر کسی ذی روح کا وہاں نام و نشان نہ تھا' قطع نظر اس کے کہ بنگلہ اجاڑ اور خستہ حال نظر آ رہا تھا' مگر اندر کار پورچ تازہ دھلا نظر آ رہا تھا اور ایک شاندار گاڑی کھڑی تھی' گلریز اندر کہیں کمروں میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد صولت جہاں اور جمن دادا آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے' باہر کی نسبت گھر کی اندرونی حالت بہت بہتر تھی' مگر در و دیوار وحشت زدہ تھے۔

کمرے کے وسط میں رکھی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا ٹھگنے قد کا کالا بھجنگ شخص بیٹھا ہوا تھا' جس کے کاندھوں پر پڑے ہوئے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں آنکھوں میں زردی نے اس کے چہرے کو انتہائی خوفناک بنا رکھا تھا' ایسا کہ بندہ دیکھے تو لرز کر ہی رہ جائے۔

صولت جہاں کو اسے دیکھ کر اختلاج قلب سا ہونے لگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا' تھوڑی دیر میں ہی وہ سارا ماجرا 'بابا' کے گوش گزار کر چکی تھیں۔

''میں آپ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں اور بچی بھی۔'' اس کالے بھجنگ دیو نے بڑی ہی اضطرابی کیفیت میں کہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ابھی اٹھ کر صولت جہاں کے ساتھ چل پڑتا۔

''ارے نہیں میں بچی یہاں نہیں لا سکتی۔'' صولت جہاں بہت پریشان تھیں' اس کی بات سن نہ سکیں شاید۔

''بی بی یہ گھر آنے کا بول رہے ہیں۔'' جمن دادا نے بابا کی بات دہرائی۔

''اوہ مگر کیسے؟''

''ایک منٹ......'' کہہ کر عامل بابا گہرے استغراق میں مشغول ہو گیا' سیاہ ماتھے پر سوچ و فکر کی گہری لکیریں تھیں...... کچھ دیر گزری' صولت جہاں کی طبیعت اب اُکتانے لگی تھی۔ ایک تو انہیں یہاں آ کر پچھتاوا ہوا تھا اور پھر وحشت کے علاوہ نہ جانے کن کن کیفیات نے گھیر لیا تھا' اگر حسن صاحب ساتھ دیتے تو یوں کسی کالے دیو کے سامنے انہیں اپنے حالات کھولنے نہ پڑتے۔

حسن صاحب کا خیال آتے ہی ایک دکھ افسوس اور غصے کی لہر اُن کے اندر اٹھی۔ کیا وہ اور اُن کی بات اتنی ارزاں تھی کہ حسن صاحب یقین کرنے سے قاصر تو تھے ہی اِس پر ایک بار غور بھی نہیں کر سکتے تھے؟ ہزاروں سوالات اُن کے اندر پھر سے شور مچانے لگے' ٹھیک ہے میں بھی اب یہ معمہ خود ہی اپنے طور پر انہیں حل کر کے دکھائے دیتی ہوں' صولت جہاں نے از خود خود کو تسلی دی۔

''یاد رہے گی نا میری بات جمن دادا؟'' اندر کے شور سے گھبرا کے انہوں نے جمن سے سرگوشی کی۔

''حسن صاحب اور محسن کو اس کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔''

''مجھے یاد ہے بی بی! میں بھلا بھول سکتا ہوں کہ یہ بات کس قدر اہم اور کتنا نازک معاملہ ہے۔''

''اوہ ہو...... بس ویسے ہی ہم تمہیں دوبارہ یاد دلا رہے تھے۔ تم تو منہ ہی بنا لیتے ہو فوراً۔''

''ہمارا کام جلدی ہی ہو جائے گا دیکھ لیجیے گا...... وہ اسلم سبزی فروش' جس نے بابا کا بتایا ہے اس کے تو گھر کو میں نے خود دیکھا' سارے بچوں پر ہوائی چیز یکے بعد دیگرے مسلط ہو گئی تھی' بڑا برا حال تھا بیچارے کا...... آس پاس پڑوس سب گواہ ہیں کہ ان ہی عامل بابا نے علاج کیا' آج سب ٹھیک ہے' دہیں مارکیٹ کے ساتھ ہی تو اس کا کوارٹر ہے آپ مطمئن رہیں۔ ہم درست جگہ آئے ہیں۔''

جمن نے پھر سے صولت جہاں کو ساری کہانی دہرائی' اسی لمحے اس بابا نے نظریں اٹھائیں صولت جہاں لرز کر رہ گئیں انہیں اس عامل بابا کی آنکھوں سے آگ کے شعلے لپکتے محسوس ہوئے تھے۔

''آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں' کل میں آپ کے گھر آتا ہوں۔''

''مگر......'' صولت جہاں' گڑبڑا سی گئیں۔

''آپ کوئی فکر مت کیجیے۔'' وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔

''میں سب سنبھال لوں گا' آپ کے شوہر بیٹا بہو کوئی آپ سے سوال نہیں کر سکے گا۔''

صولت جہاں سوچ میں پڑ گئیں' عامل بابا کی شاطرانہ نظریں صولت جہاں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ عامل بابا کے نام سے مشہور' یہ ایک سفلی گر تھا کالے علم کا ماہر' کالی دیوی کا پجاری کہلاتا تھا خود کو...... نام چرن داس تھا مگر عامل بابا کے نام سے مشہور تھا۔

چرن داس جادو ٹونے ٹوٹکے کا ماہر تھا' کوئی بھی منفی کام ہو جیسا کہ کالے علم کے ماہر کرتے ہیں اُس سے کرایا جا سکتا تھا۔ صولت جہاں کی بدقسمتی تھی جو وہ کسی جعلی عامل کے ہتھے نہ چڑھیں تھیں' جیسا کہ جگہ جگہ فراڈ

ہوتا ہے عامل کامل کے نام سے' کاش کہ وہ کسی جعلی فراڈیے سے مل لیتیں' قسمت دور کھڑی کف افسوس مل رہی تھی' وہ حقیقت میں چرن داس کالی کے داس کے سامنے بیٹھی تھیں' اُس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا' بے بڑے لوگ اس کے حلقے میں شامل تھے' عامل بابا کے حلقے میں صولت جہاں جیسی بیگمات کثیر تعداد میں شامل تھیں' جو کام کے عوض بھاری رقم ادا کرتی تھیں۔ جمن دادا کو ساری معلومات حاصل ہو چکی تھیں' انہی کے کہنے پر صولت جہاں بھی ایک موٹی رقم اپنے پرس میں رکھ کر لائی تھیں۔

''میں کل آپ کے گھر آرہا ہوں۔'' عامل بابا کی نظریں اُن کی پیشانی پر گڑی ہوئی تھیں۔

''میری ساری امیدوں اور تمناؤں کا مرکز و محور ہے میری ال...... میرے منہ میں خاک اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔'' ان کا لہجہ دکھ سے بھر گیا' پھر دل کے تمام آبلے پھوٹ پڑے' اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' بس یہاں سے اس جادوگر کا راستہ صاف ہو گیا۔ صولت جہاں نے گھر کا ایڈریس دے دیا۔

یہ ایک بہت بڑا قدم تھا یہ بہت بڑا خطرہ بھی بن سکتا تھا' انہیں رہ رہ کر شوہر کا خیال ستا رہا تھا مگر جب وہ وہاں سے اٹھیں تو بس ایک خیال تھا کہ التماس کی سلامتی کی خاطر چرن داس کو گھر بلا لینا چاہیے۔ باقی تمام خیالات تو چرن داس نے سلب کر لیے تھے۔

ٹیکسی اُن کا باہر انتظار کر رہی تھی' راستہ خاموشی سے کٹا' گھر پہنچتے ہوئے خاصا وقت ہو چلا تھا' وہ فائزہ کو مطمئن کر کے گئیں تھیں کہ جمن کی خالہ کی مزاج پرسی کے لیے جا رہی ہیں' مگر گھر میں داخل ہوئیں تو فائزہ لاؤنج میں ہی مل گئیں پریشان سی تھیں۔

''اماں کافی دیر ہو گئی آپ کو' میں پریشان ہو رہی تھی۔ ابا جان کا بھی فون آیا تھا آپ کا پوچھ رہے تھے' بس اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔'' فائزہ نے صولت جہاں کو پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے ساری روداد سنائی۔

''اور وہ کیسی ہیں اب جمن دادا کی خالہ......'' فائزہ نے بیمار کا حال جاننا چاہا۔ مگر صولت جہاں بہانہ کر کے لاؤنج سے اٹھ آئیں' وہ فائزہ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں' جمن دادا کچن میں تھے فائزہ کچن میں چلی گئی۔

صولت جہاں کمرے میں آکر لیٹ گئیں۔ ابھی وہ لیٹی ہی تھیں کہ ایک جھٹکے سے دوبارہ اٹھ بیٹھیں' بلکہ اٹھی نہیں اُن کو اٹھایا گیا تھا۔ وہ ایک تیز ریلا تھا خوشبو کا' جس نے اُن کو لیٹتے لیٹتے اپنی لپیٹ میں ایسا لیا' جیسا کہ اُن کو کسی نے دھکا دے کر اُٹھا کر بٹھایا ہو۔ انہیں لگا وہ خوشبو کے ایک سمندر میں غوطہ زن ہیں گویا خوشبو مانوس تو تھی مگر آج اس میں انتہائی تیزی تھی۔ اتنی تیزی کہ اُن کو دم گھٹنے کا احساس ہوا وہ خوشبو کا جھونکا پوری قوت سے اپنا اظہار کر کے کمرے سے باہر نکل چکا تھا' اس کے باہر نکلتے ہی اُن کا سانس سینے میں بحال ہوا تو کھانسی کا ایک دورہ سا اٹھ گیا' صولت جہاں کے کھانسنے کی آوازوں سے جمن دادا اور فائزہ دونوں ہی دوڑے چلے آئے۔

''کیا ہوا بی بی......''

''ارے کیا ہوا؟'' فائزہ نے پانی کا گلاس صولت جہاں کے منہ سے لگا دیا' اور ایک ہاتھ سے اُن کی پیٹھ سہلانے لگی' کھانستے کھانستے صولت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ پانی کے گھونٹ گلے سے

نیچے اترے تو کھانسی تھمی' وہ گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

''جمن' فائزہ تمہیں میرے کمرے میں تیز خوشبو محسوس ہو رہی ہے کیا؟ یا باہر جاؤ جمن دادا' دیکھو پورے گھر میں۔'' وہ بے ربط سے جملے بول رہی تھیں۔

جمن دادا سارا گھر چھان کر یا یوں کہہ لیں سونگھ کر آ گئے مگر کہیں کسی بھی قسم کی خوشبو کا شائبہ تک نہیں ملا...... فائزہ نے بھی ہر جگہ گھوم کر گہرے گہرے سانس لے کر دیکھا مگر ایسی کوئی مہک محسوس نہ ہوئی جس کی وجہ سے بقول صولت جہاں اُن کی یہ حالت ہوئی تھی۔

صولت جہاں کی حالت سنبھل چکی تھی۔

''التماس...... التماس کہاں ہے؟ جاؤ اس کے پاس ملے گی شاید خوشبو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔

''اماں؟'' فائزہ نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہ انہیں صولت جہاں کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہو' صولت جہاں کو ہوش سا آیا' وہ تیزی سے دوڑتی خود التماس کے پاس پہنچیں' التماس سکون سے سو رہی تھی' اورنگزیب اس کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا...... صولت جہاں نے لپک کر سوئی ہوئی التماس کو اٹھا لیا' اور سونگھنے لگیں التماس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' دادی کو پہچان کر ہاتھ پیر مارنے لگی' خوشبو یہاں بھی نہیں تھی' فائزہ یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھی۔

''اماں کیا ہو گیا ہے آپ کو' لگتا ہے وہمی ہو رہی ہیں آج آپ' بہت دیر التماس سے دور رہی ہیں نا...... اس نے بھی آپ کو بہت مس کیا ہے' یہی تو بتانا چاہ رہی تھی میں' بہت ستایا ہے آپ کی پوتی نے آج مجھ کو۔''

التماس ایسے قلقاریاں مارنے لگی جیسے اسے سب سمجھ آرہا ہو' صولت جہاں نے التماس کو پیار کیا اور فائزہ کو دے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں' فائزہ نے تو صولت جہاں کی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا' التماس کو بھوک لگی تھی اور اورنگ زیب بھی اس وقت کچھ کھاتا تھا چنانچہ وہ دونوں کو لیے کچن میں چلی گئی' جمن دادا نے دونوں بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اورنگ زیب کے پسندیدہ سینڈوچز اور التماس کا فیڈر دونوں تیار تھے...... اِدھر فائزہ واپس کمرے میں جا کر بچوں کو کھلانے پلانے میں لگ گئی۔

اِدھر فائزہ بچوں کے کمرے میں گئی' اُدھر صولت جہاں اور جمن دادا اس تازہ واقعہ پر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''تمہیں تو میرا یقین ہے نا۔'' صولت جہاں نے انتہائی پریشانی سے جمن سے پوچھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو بی بی۔ یقین ہے کیوں نہیں ہے' نہیں ہوتا تو میں آج آپ کے ساتھ جاتا۔'' جمن کا اشارہ عامل بابا کی طرف تھا۔ ابھی وہ اور باتیں کر ہی رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز آئی جمن نے صدر دروازہ کھولا تھا۔

حسن شیرازی اور محسن آ چکے تھے' دونوں باتیں کرتے آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے' اس کے بعد کھانا بچوں کے ساتھ کھیلتا' دو روز کے بعد اورنگ زیب نے دادا کو دیکھا تھا وہ اُن کو چھوڑ ہی نہیں رہا تھا' ان سب میں بارہ بج گئے معلوم ہی نہیں ہوا' سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ نشست برخاست ہوئی اور سب اپنے اپنے

کمروں میں سونے چلے گئے' حسن شیرازی نے صولت جہاں سے بس اتنا کہا کہ کل وہ گھر پر ہی ہیں اور صولت جہاں کو کہیں لے کر جائیں گے۔

صولت جہاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلیں گے......'' مختصر کہا اور سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

رات سکون سے کٹی تھی' صبح اذانوں کے ساتھ آنکھ کھلی وہی صبح کے معمولات شروع ہو گئے ابھی سب ناشتے کی میز پر جمع ہی ہوئے تھے کہ صدر دروازے کی اطلاعی گھنٹی نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔

فائزہ کچن سے نکل رہی تھی' گھنٹی کی آواز سن کر دروازہ کھولنے جانے لگی' جمن دادا نے انہیں روک کر صحن میں قدم رکھ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دروازے تک پہنچے حسب معمول اونچا نیچا بڑبڑا بھی رہے تھے' اتنی صبح کسی کا آنا ناگوار گزر رہا تھا انہیں۔

دروازہ کھولا تو سامنے 'عامل بابا' کو کھڑے پایا ساکت سے ہو گئے۔

''پہچانا نہیں دادا؟'' عامل بابا نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''اتنی سویرے؟'' جمن دادا سٹپٹا گئے۔

''نیک کام میں دیر کیسی ہو پرے۔'' عامل بابا اندر گھستا چلا آیا۔

''کون آیا ہے جمن؟'' حسن شیرازی اتنی دیر میں خود وسط صحن تک آ گئے تھے۔

''یہ ہیں حسن میاں' انہیں نوکری کی ازحد تلاش ہے' بے چارے بہت پریشان ہیں۔ مجھے ملے تھے' ملتے رہتے ہیں مارکیٹ میں' آپ سے ذکر کرنا تھا' آپ چلے گئے۔ بی بی سے ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا بلا لوں' آپ کچھ کر دیں حسن میاں ان کا۔'' جمن دادا نے بہت مہارت سے بات بنائی تھی۔ اتنا وقت بہت تھا' چرن داس نے پورے گھر کا جائزہ صحن میں کھڑے کھڑے لے ڈالا اُس کی نظریں اب املتاس کے درخت پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''اچھا......اچھا......آیئے بیٹھیں۔'' حسن شیرازی نے اس کے دل کی بات پوری کر دی۔

چرن داس اب اُن کے ساتھ املتاس کے نیچے بچھے تخت پر بیٹھا تھا۔ اندر سے املتاس کے اچانک بے تحاشہ رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فائزہ اُسے لے کر لاؤنج میں آ گئی' صولت جہاں نے املتاس کو لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بہانے سے اُٹھ کر صحن میں آ گئیں۔ جیسے ہی وہ پروگرام کے مطابق املتاس کو چرن داس کے سامنے لائیں۔ موسم برہم سا ہو گیا' سرد ہوائیں تو چل ہی رہی تھیں جھکڑ چلنے لگے۔ گرد آلود ہواؤں نے آسمان کو ڈھانپ لیا...... ریت تھی کہ آنکھوں میں گھسی چلی جا رہی تھی املتاس کا درخت خطرناک انداز میں جھوم رہا تھا جیسے صحن میں آن گرے گا' موسم کے اتنے کڑے تیور وہ بھی آناً فاناً...... چرن داس کی آنکھوں میں اس قدر ریت بھر گئی تھی کہ وقتی طور پر اُس نے یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی ...... ایسے میں اسے کون روکتا' پھر آنے کا وعدہ کر کے کھلے دروازے سے باہر نکل گیا' اس کے گلی کے آخری سرے سے نکلتے ہی موسم اعتدال پر آ گیا تھا۔

اِس نہایت ہی منفرد دلچسپ پُراسرار ناول کی پانچویں قسط کے لیے آئندہ ماہ انتظار کیجیے

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

امیر اور فقیر

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ ہر قسم کے دنیاوی لالچ سے بے نیاز تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے نذرانے کے طور پر آپ کو ایک ہزار درہم پیش کیے مگر آپ نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ میں فقیروں سے کچھ نہیں لیتا۔ درہم دینے والے نے عرض کیا کہ میں تو بہت امیر ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے اس سے دریافت کیا۔

"کیا تجھے مزید دولت کی آرزو نہیں ہے؟"

جس پر درہم دینے والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ آپ نے اُس شخص سے کہا۔

"تو پھر یہ رقم لے جا کیونکہ تو فقیروں کا سردار ہے۔"

حضرت فریدالدین عطار کی تصنیف 'تذکرۃ اولیاء' سے اقتباس

انتخاب: آصف زیدی۔ کراچی

اخلاقیات

ایک بار حضرت ابوبکرؓ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوبکرؓ پہلی بار سن کر چپ رہے۔ اُس نے دوسری بار برا بھلا کہا تو اس وقت بھی آپؓ چپ رہے مگر جب تیسری بار بدزبانی کی تو آپؓ خاموش نہ رہ سکے اور جواب میں بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہؐ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا۔

"اے خدا کے رسولؐ! آپ کیوں اٹھ گئے؟"

آپؐ نے فرمایا۔

"ابوبکرؓ! جب تک تم چپ تھے خدا کا فرشتہ ہماری طرف سے جواب دے رہا تھا۔ جب تم بول پڑے تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا۔" اس طرح رسول اللہؐ نے بتایا کہ برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے موجود ہوتا ہے مگر جب آدمی خود بدلہ لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملے کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

مولانا وحیدالدین کی تصنیف 'پیغمبرِ انقلاب' سے اقتباس

انتخاب۔ شمائلہ نوید۔ کراچی

تنہا آواز

میرے چاروں طرف آوازوں کا شور ہے۔ ہر آواز کے گرد سماعتوں کا ایک میلہ ہے۔ ایسے میں میری تنہا آواز کچھ دیر کو حیران آنکھوں کی طرح ہر طرف بھٹکتی ہے اور پھر فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ میرے سفر کی کوئی سمت نہ کوئی منزل' میرے ہم سفروں کا کوئی خیمہ' نہ زادِ سفر' آخر کب تک کوئی ایک دوسرے کا ساتھ دے سکے گا؟ میں کس کس محرومی کا ماتم کروں؟ ابھی تو مجھے وسعتِ صحرا میں رقص کرتے بگولوں کی طرح نجانے کب تک اپنی دھن میں مگن رہنا ہے؟ شعر کہنے کی دھن' زخم کھانے اور مسکرانے کی دھن' ہر لحہ مرنے اور ضبط کرنے کی دھن' اپنے آپ کو لوح و قلم کی میزان میں تولنے کی دھن اور سب سے بڑھ کر اپنی تنہائی کا کرب' اپنی آنکھوں میں گھولنے کی دھن۔

محسن نقوی کی تصنیف 'عذاب دید' سے اقتباس

انتخاب' اشعر جواد۔ کراچی

انتخاب

اللہ ارحم الراحمین ہیں

رسول پاک کی ایک حدیث ہے کہ حشر میں ایک ایسا آدمی اللہ کی عدالت میں آئے گا کہ جس کے اعمال میں صرف ایک عمل کی کمی ہو گی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے جاؤ اپنے عزیز رشتے داروں' بھائی 'باپ سے ایک نیکی مانگ کر لاؤ۔ اگر ایک نیکی مل جائے تو تم جنت میں جا سکتے ہو۔ وہ برادری کے پاس جائے گا' دوستوں کے پاس جائے گا' والدین کے پاس جائے گا لیکن وہاں تو نفسا نفسی کی پکار ہو گی۔ کوئی اس کی نہیں سنے گا۔ نیکی نہیں ملے گی۔ وہ بے چارہ مایوس ہو کر جب واپس لوٹے گا تو ایک آدمی بیٹھا ہو گا' وہ اسے دیکھے گا کہ وہ بڑا پریشان' بڑا مضطرب آرہا ہے' تو وہ پوچھے گا کیا ہوا میاں' یہ کہے گا کہ ایک نیکی کم تھی اگر وہ مل جاتی تو جنت میں چلا جاتا لیکن کسی نے بھی نہیں دی۔ نہ بھائیوں نے نہ دوستوں نے یہاں تک کہ ماں باپ نے بھی آج نہیں پوچھا۔ تو وہ آدمی کہے گا کہ میرے پاس ایک ہی نیکی ہے' اسے تُو لے جا' ایک اکلوتی نیکی سے میرا کیا بنے گا؟ وہ بڑا خوش ہو گا۔ اس سے ایک نیکی لے کر وہ رب کے پاس حاضر ہو کر کہے گا کہ مجھے نیکی مل گئی۔ مجھے جنت عطا کیجیے' حق تعالیٰ فرمائیں گے' یہ نیکی تجھے کس نے دی؟ اس آدمی کو بلایا جائے گا جس نے نیکی دی تو رب العالمین فرمائیں گے۔ آج تو ماں بیٹوں کو نہیں پوچھتی' باپ اولاد کو نہیں پوچھتا' بھائی بھائیوں کو بھول چکے ہیں' یہ نیکی تو نے کیسے دے دی؟ تو وہ کہے گا۔ اے رب العالمین! میرے پاس تو تھی ہی ایک نیکی۔ میں نے سوچا کہ میرا تو کچھ بنے گا نہیں' یہ تیرا بندہ کیوں نہ جنت میں چلا جائے۔ حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے دوسرے کا خیال کیا' جاؤ تم دونوں کو جنت میں بھیجتا ہوں۔"

سید عبدالمجید ندیم شاہ کی تصنیف "جواہرات ندیم" سے اقتباس

حسن انتخاب: مور شاہد حسین۔ قمبر

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں کیونکہ اسے ضرورت ہو گی لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو گھر سے باہر نکال دو کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے ہمیں مٹر چھیلنے پر لگا دیا۔ میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی لیکن مٹر چھیل رہا تھا حالانکہ میں نے ساری زندگی کبھی مٹر نہیں چھیلے تھے پھر انہوں نے لہسن چھیلنے پر لگا دیا اور میرے ہاتھوں سے بو آنا شروع ہو گئی پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے اور ڈنٹھل الگ الگ کر دو۔ اس مشقت سے تو اب خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا' اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھئی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی مشکل میں جانے جیسا کام شاید) میں نے کہا کہ یہ خط تو پہنچا دیتی' کہنے لگی یہ تو بابا جی بس پڑا ہی رہ گیا میرے

پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے باپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپلن آئے۔

اشفاق احمد کی تصنیف ''زاویہ'' سے اقتباس

قرۃ العین زینب' ملتان۔

انمول خزانہ

باتیں اشفاق احمد کی

☆ منزل قریب آنے پر مسافر ایک دوسرے سے اور ساربان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

☆ جب زندہ آدمی کا اندر مرجاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہوجاتا ہے اور شمع زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دور دور سے اڑ کر آنے لگتے ہیں۔

☆ راستہ جب پتھریلا ہو' سورج کی تمازت تیز ہو' ہر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوتی ہے۔

☆ سمجھوتے میں زبردستی کا عنصر ہوتا ہے' مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی' سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتا کرنا بڑا تاب ناک ہے مگر ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شرجیل اقدس' جیکب آباد۔

اقوال ولیم شیکسپیئر

☆ دوستی بہم رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نام نہیں بلکہ یہ دو دلوں کے باہمی ربط کا نام ہے۔

☆ انسانیت کا زیور نیک نامی ہے۔

☆ میں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہوں۔

☆ زندگی ہر شخص کو عزیز ہے' لیکن بہادر انسانوں کے لیے عزت زندگی سے بھی عزیز ہوتی ہے۔

☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہی ہے خواہ بچے کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ بزدل اپنی موت سے قبل کئی بار مرتے ہیں لیکن جرأت مند لوگ ایک ہی مرتبہ مرتے ہیں۔

☆ حسین صورت' نیک سیرت کے بغیر ایسی ہے جیسے خوشبو سے تہی داماں گلاب' عقل مند انسان کبھی بیٹھ کر اپنی تکلیف کا رونا نہیں روتا بلکہ اپنی تکلیف کے تدارک میں بخوشی مصروف عمل ہوتا ہے۔

☆ خوشامد کرنے والا اور سن کر خاموش رہنے والا دونوں کمینے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

☆ عورتیں ایسی کتابیں' ایسی تصویریں اور ایسی دبستان ہیں جو تمام دنیا کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں۔

☆ سچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔

☆ وہ لوگ جو اونچی جگہوں پر کھڑے ہوتے ہیں' انہیں گرانے کے لیے بہت ہی تند و تیز ہوائیں آتی ہیں۔ اگر وہ گر پڑیں تو ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔

☆ دنیا آنکھوں سے نہیں دیکھتی' دل سے دیکھتی ہے' یہی وجہ ہے کہ محبت کا دیوانہ اندھا بتایا گیا ہے۔

☆ دانش مند صرف وہی ہیں جو محبت میں اندھے نہ ہوں۔

☆ قطرہ قطرہ بھی مسلسل گراتے ہوئے رہو تو چٹان آپ کے عزم سے چکنا چور ہوجائے گی۔

☆ جب حسن بولتا ہے تو بڑے بڑے عالم اور دانش ور گونگے ہوجاتے ہیں۔

مرسلہ: کنول عمران خان' کراچی۔

خیالِ جدائی

☆ شب بخیر' شب بخیر' جدا ہونا اتنا میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی' میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)

☆ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)

☆ جدائی دل کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ (بیلی)

☆ جدائی بعض اوقات دوستی میں رَس گھول دیتی ہے اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)

☆ جانے والا اُن لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

☆ ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

مرسلہ: ثانیہ بھٹی' سیالکوٹ۔

انمول موتی

☆ وقت صالح تو ہے ہی' لیکن یہ نصیب کی پرچھائیاں اپنے دامن کیوں بھگوتی ہیں؟

☆ تم تو دامنِ وقت کے سائے تلاش کرتے ہو' کبھی وقت کا دامن خود کو بھلا پائے گا؟

☆ شکستہ آرزوؤں کی پٹاریاں لیے میں اُسی ترب کے آگے جاؤں گا جس کے گھر میں داخل ہونا بھی ایک سال بعد نصیب ہوا۔

☆ وقت مرہم تو ہے ہی' دوائی لگنے کے بعد زخم آہستہ آہستہ کیوں بھرتا ہے؟

☆ اوروں کی خوشیوں میں خالی ہونے والے دامن دولت سے نہیں۔ ربِ کریم عزوجل کی رحمت سے بھرا کرتے ہیں۔

☆ وقت کے انمول رنگوں کی پہچان وہی کرتے ہیں جو انمول کو بے مول بنا دیتے ہیں۔

☆ محبت کے نام پہ ملا ہوا' ہوا کا جھونکا تمام تر ساعتوں سے بھاری ہوتا ہے۔

☆ تسلیم کی ہوئی غربت' مانگی ہوئی دولت سے بہتر ہے۔

☆ حاصل کے بعد جذبوں کی قدریں منجمد کیوں ہوجاتی ہیں؟

☆ اندھی خواہشیں خواب سراب سے بڑھ کر ''میرا ہے۔'' ہونے کا پتا دیتی ہیں۔

مرسلہ: سدرہ انور علی' جھنگ۔

ذرا مسکرایئے

نشانہ

ایک گاؤں میں ایک تھیٹر کمپنی آئی۔ اُس کے ایک فنکار نے وقفے کے دوران خنجر پھینکنے کا کرتب دکھانا شروع کیا۔ اُس نے اپنی ساتھی فنکارہ کے چاروں طرف آہستہ آہستہ اِس مہارت سے خنجر پھینکے کہ وہ چمکتے ہوئے خنجروں کے درمیان صحیح سلامت رہی جبکہ کبھی کبھی تو خنجر اس کے صرف بال برابر دور رہ جاتا۔ تمام حاضرین دم سادھے اس مظاہرے کو دیکھتے رہے کہ ہال کے عقبی حصے سے غصے میں بھری ایک آواز ابھری۔ ''بل' چلو' یہاں سے چل پڑو۔ اس بے وقوف نے اپنا نشانہ پھر ضائع کردیا۔''

مرسلہ: فہیم صدیقی' کراچی۔

مجبوری

''میرے امی ابو میرے لیے ایک چھوٹی سی بہن لائے ہیں۔'' بچے نے اپنی ٹیچر کو بتایا۔

''کیا وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

''ہاں' اچھی تو لگتی ہے' لیکن وہ لڑکا ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔'' بچہ بولا۔

''تو آپ اپنے امی ابو سے کہیے کہ اُسے بدل کر

آپ کو بھائی لا دیں۔'' ٹیچر نے مسکرا کر کہا۔
''اَب اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔'' بچے نے افسردگی سے کہا۔ ''اَب تو ہم چاروں اُسے استعمال بھی کر چکے ہیں۔''

نمائندگی

امریکا کی ایک سڑک پر ایک جنازہ جا رہا تھا۔ ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ تابوت کے ہمراہ گولف کھیلنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے جنازے میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا۔ ''یہ شخص یقیناً زندگی میں گولف کا اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟''
''رہا ہوگا سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' اُس نے جواب دیا۔ ''وہ اچھا کھلاڑی ہے' تبھی آج کا فائنل کھیلنے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا اس لیے اس کے گولف کا سامان نمائندگی کی صورت ہمراہ ہے۔''

بلال احمد۔ کراچی۔

بدقسمتی

ایک نوآموز وکیل اپنا پہلا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ عدالت کے روبرو دلائل دیتے ہوئے وہ خاصا نروس ہوگیا۔ ''مائی لارڈ' میرا بدقسمت مؤکل......'' اس نے کہا اور خاموش ہوگیا' ذہن الجھ گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔ اس نے دوبارہ پھر سہ بارہ کوشش کی لیکن ہر بار وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ ''مائی لارڈ' میرا بدقسمت مؤکل......'' یہ دیکھ کر فاضل جج آگے جھکا اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کہیے کہیے جناب' رک کیوں گئے؟ یہاں تک تو عدالت آپ سے پوری طرح متفق ہے۔''

ساجدہ خان۔ کوئٹہ۔

☆☆

چراغ بے نظر ہے' یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے
وہی شخص جس پہ اپنے دل وجاں نثار کر دوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے
کبھی پا کے تجھ کو کھونا' کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ ترے میرے درمیاں ہے
مرے ساتھ چلنے والے' تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے' وہی غم کا آسماں ہے
میں اِسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر' مرا پیار جاوداں ہے
انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے
(بشیر بدر)

حسنِ انتخاب: قرۃ العین زینب' ملتان۔

☆☆

جو بھی مشکل کام تھا' کرنا اچھا لگا
اِس ندی کے پار اترنا اچھا لگا
لفظوں میں تصویر بنا کر چاہت کی
اِس میں رنگِ معانی بھرنا اچھا لگا
ہم نے دیکھا اُس کو ایک بلندی پر
اور وہاں پر اُس کا ڈرنا اچھا لگا
وہ خوشبو کی صورت آ کر پھیلا تو
ہمیں بھی اپنا اور بکھرنا اچھا لگا
جس رستے سے سارے لوگ پلٹ آئے
اس رستے سے مجھ کو گزرنا اچھا لگا
جس منظر پر دھیان کیا' وہ ڈوب گیا
میری خشک آنکھوں سے جھرنا اچھا لگا
سعد نگاڑ کی صورت اس نے پیدا کیا
جس کو بننا اور سنورنا اچھا لگا
(سعد اللہ شاہ)

حسنِ انتخاب: عائشہ اشعر' کراچی۔

☆☆

دیکھ کر دور اُسے ایسے پکارا میں نے
جس طرح دل میں کوئی خواب اتارا میں نے
پہلے اشکوں سے کیا درد کا صحرا سیراب
پھر تری یاد کو جنگل سے گزارا میں نے
رات بھر چہرہ ترا بھیگتی آنکھوں میں رہا
چاند دیکھا نہ میری جان' ستارہ میں نے
کیا بتاؤں ترے یک لخت بچھڑ جانے پر
کتنی مشکل سے دیا خود کو سہارا میں نے
میں جو نکلا ہی نہیں دکھ کے سمندر سے کبھی
خواب میں دیکھا ترے ساتھ کنارا میں نے
ورنہ یہ لوگ کہاں ملنے کے لائق تھے میرے
تیری خاطر کیا ہر شخص گوارہ میں نے
(فرحت عباس شاہ)

حسنِ انتخاب: ام عادل' کراچی۔

مگر تمہیں کیا

میں آڑے ترچھے خیال سوچوں
کوئی بے ارادہ کتاب لکھوں
کوئی شناسا غزل تراشوں
کوئی اجنبی انتساب لکھوں
گنوا دوں اِک عمر کے زمانے
کہ ایک پل کا حساب لکھوں
میری طبیعت پہ منحصر ہے
میں جس طرح کا نصاب لکھوں

یہ میرے اپنے مزاج پر ہے
عذاب سوچوں' ثواب لکھوں
طویل تر ہے سفر' تمہیں کیا
میں جی رہا ہوں مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ تم تو کب سے
میرے ارادے گنوا چکے ہو
جلا کے سارے حروف اپنے
میری دُعائیں بجھا چکے ہو
میں رات اوڑھوں کہ صبح پہنوں
تم اپنی رسمیں اٹھا چکے ہو
سنا ہے کہ سب کچھ بھلا چکے ہو
تو پھر مرے دل پہ جبر کیسا
یہ دل تو حد سے گزر چکا ہے
گزر چکا ہے مگر تمہیں کیا
خزاں کا موسم ٹھہر چکا ہے
ٹھہر چکا ہے مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ اِس خزاں میں
میں جس طرح کے بھی خواب لکھوں
(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: اشعر جواد' کراچی۔

دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اَب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے' کیا کہوں
کم بخت......!
بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں
وہ اِک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

(جاوید اختر)

حسنِ انتخاب: کرن شبیر، کراچی۔

برہا کا گیت

بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بادل برسے
ہم کو دھیان میں لاکر اتنا رو دو کہ
آنکھوں کا کاجل
بہہ کر
سندر گال بھگو دے
بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بجلی چمکے
چاہت کے سنگیت سنا کر ہمیں بلاؤ
ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں
ہرا جڑے نگر میں جاتے ہیں
اور گیت پرانے گاتے ہیں

(منیر نیازی)

حسنِ انتخاب: صائمہ شاہ، حیدرآباد۔

......☆☆......

سائیں بابا

میرے سائیں بابا بڑے برکتوں والے ہیں۔ وہ میرا ہر مسئلہ چٹکی بجانے میں حل کر دیتے ہیں۔ انہوں نے میرے بہت سے کانٹے رستے سے صاف کیے ہیں اور میری زندگی کو بہت پر آسائش بنا دیا ہے۔ ایک دن میں اداس بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں مکیش کے گانے سنوں مگر یہ کیسے ممکن ہو وہ تو اپنے پرسوز گانوں کے ساتھ کب کا اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے میں نے سائیں بابا سے اپنی محرومی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا یہ کون سا کوئی مشکل کام ہے۔ انہوں نے چٹکی بجائی اور مکیش کی درد بھری آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ صرف یہی نہیں سائیں بابا چٹکی بجاتے تھے اور میری پسند کے مطابق مکیش وہ گیت سناتا چلا جاتا تھا۔ ایک روز میرا گدھا بیمار تھا اور سفر بھی بہت دور کا درپیش تھا اگر میں اپنے گدھے پر بیٹھ کر اس سفر پر روانہ ہوتا تو دس برسوں میں بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ راستے میں سات سمندر آتے تھے اور میں اور میرا گدھا دونوں تیرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ میں نے مشکل کے ان لمحات میں اپنے سائیں بابا کو یاد کیا۔ انہوں نے چٹکی بجائی اور میں چشم زدن میں سات سمندر پار پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اپنے گھر والوں کی یاد ستائی میں ان کی آواز سننے اور ان کی شکل دیکھنے کو ترس گیا۔ اس مشکل وقت میں ایک دفعہ پھر سائیں بابا میرے کام آئے۔ انہوں نے چٹکی بجائی اور میں اپنی ساری بیویوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے وہ میرے سامنے بیٹھے ہوں۔ میں اگر بابا سائیں کے فیوض و برکات گنوانے بیٹھوں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ بس یہ جان لیں کہ سائیں بابا چٹکی بجاتے ہیں تو اندھیرا روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے گرمی ٹھنڈک میں بدل جاتی ہے اگر شدید سردی پڑ رہی ہو تو سائیں بابا کے چٹکی بجاتے ہی کمرے میں ٹمپریچر خوشگوار ہو جاتا ہے۔ میں اگر سمندر کی گہرائی میں اتر کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہاں کون کون سے جانور ہیں ان کی عادات کیسی ہیں اور وہ کس طرح کی زندگی گزارتے ہیں تو سائیں بابا کی وساطت سے میں یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔ میں گھنے جنگلوں میں درندوں چوپایوں اور زمین پر رینگنے والے سیکڑوں جانوروں کو ان کی جلوت اور خلوت دونوں میں دیکھ چکا ہوں۔ مجھے سائیں بابا نے آسمانوں کی سیر بھی کروائی ہے۔ میں کہکشاؤں کے

درمیان میں سے گزرا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایسی دنیاؤں کے بارے میں بتایا جو زمین سے اربوں کھربوں میل کے فاصلے پر ہیں۔ سائیں بابا کو سب علم ہوتا ہے کون سی دنیا کے کون سے حصے میں کیا ہو رہا ہے۔ سائیں بابا مجھے چاند پر بھی لے گئے تھے۔ وہاں میں بہت بور ہوا اتنا بور کہ چاند جیسی شکلوں سے بھی بیزار ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک دن سائیں بابا سے کہا ''سائیں بابا! میں چاہتا ہوں کہ یہ کمالات مجھے بھی حاصل ہو جائیں۔'' یہ سن کر سائیں بابا خوش ہو گئے اور بولے کیوں نہیں لیکن اس وقت تم کچھ ان سے بھی زیادہ ضروری کاموں میں مشغول ہو، تم نور اور بشر کا مسئلہ حل کرنے میں لگے ہوئے ہو، تمہیں یہ بھی فکر ہے کہ چودہ سو سال پہلے کس کی حق تلفی ہوئی تھی اور کس کی نہیں ہوئی تھی۔ تم لباس اور چہرے کی وضع قطع کا بہت عرق ریزی سے مطالعہ کرتے ہو، تمہیں چاول کے دانے کے برابر باتوں والے مسئلے کی بھی بہت فکر ہے۔ تم نے طہارت پر بہت تحقیقی قسم کا کام کیا ہے اور ابھی تک مسلسل کر رہے ہو۔ اسی طرح جنت کی حوروں، ان کے لباس، ان کے رہن سہن اور ان کے حسین سراپے کے بارے میں اتنا میں نہیں جانتا جتنا تمہارے ہاں کا ایک معمولی پڑھا لکھا شخص جانتا ہے۔ یہ سب کام بہت ضروری ہیں تم ان سے فارغ ہو لو پھر کمالات کے حصول کے بارے میں سوچنا۔ اس روز مجھے بابا سائیں اچھے نہیں لگے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے کمالات خود تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لمحوں میں مجھے یاد آیا کہ میرے مرشد سائیں کوڑے شاہ بھی تو ہیں، وہ بھی صاحب کمالات ہیں۔ میں ان کا فیض حاصل کیوں نہ کروں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کی شاہ جی مجھے بھی فضاؤں میں اڑنا سکھائیں۔ اس پر انہوں نے اپنے کرتے کی سامنے کی جیب میں سے ایک بھرا ہوا سگریٹ نکالا اور کہا لو سوٹا لگاؤ۔

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف ''روزنِ دیوار'' سے اقتباس

انتخاب: بابر محبوب، کراچی۔

زندگی کی قوت

گھر کے آنگن میں ایک بیل اگی ہوئی تھی۔ مکان کی مرمت ہوئی تو وہ ملبے کے نیچے دب گئی۔ آنگن کی صفائی کراتے ہوئے مالک مکان نے بیل کو کٹوا دیا۔ دور تک کھود کر اس کی جڑیں بھی نکلوا دی گئیں۔ اس کے بعد پورے صحن کو اینٹوں سے پختہ کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد بیل کی سابق جگہ کے پاس ایک نیا واقعہ رونما ہوا۔ پختہ اینٹیں ایک مقام پر ابھر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دھکا دے کر انہیں اٹھا دیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ چوہوں کی کارروائی ہے۔ کسی نے کوئی اور قیاس کرنے کی کوشش کی آخر کار اینٹیں ہٹائی گئیں۔ تو معلوم ہوا کہ بیل کا پودا اس کے نیچے مڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ بیل کی کچھ جڑیں زمین کے نیچے رہ گئی تھیں۔ وہ بڑھ کر اینٹ تک پہنچیں اور اوپر آنے کے لیے زور کر رہی تھیں۔

''یہ پتیاں اور...... جس کو ہاتھ سے مسلا جائے تو وہ آٹے کی طرح پس اٹھیں۔ ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ اینٹ کے فرش کو توڑ کر اوپر آ جائیں۔''

مالک مکان نے کہا۔ ''میں ان کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا اگر یہ بیل مجھ سے دوبارہ زندگی کا حق مانگ رہی ہے تو میں اس کو زندگی کا حق دوں گا۔''

''جناب' انہوں نے چند اینٹیں نکلوا کر اس کے لیے جگہ بنا دی۔'' ایک سال کے بعد ٹھیک اسی مقام پر تقریباً پندرہ فٹ اونچی بیل کھڑی ہوئی تھی جہاں اس کو ختم کر کے اس کے اوپر پختہ اینٹیں

جوڑی گئی تھیں۔

درخت کے ننھے پودے میں اتنا زور ہے کہ وہ پتھر کے فرش کو دھکیل کر باہر آ جاتا ہے؟ یہ طاقت اس کے اندر کہاں سے آئی؟ اس کا سرچشمہ عالم فطرت کا وہ پراسرار مظہر ہے جس کو زندگی کہا جاتا ہے۔ ایسی قوت جو اس دنیا میں اپنا حق وصول کر کے رہتی ہے۔ جب زندگی کی جڑیں تک کھود دی جاتی ہیں' اس وقت بھی وہ کہیں نہ کہیں اپنا وجود رکھتی ہے اور موقع پاتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

مولانا وحیدالدین خان کی تصنیف ''رازِ حیات'' سے اقتباس

انتخاب: تحسین جونیجو بورڑی۔

حلال مرغ

میں اس وقت پندرہ سولہ سال کا تھا اور پہلی بار ولایت جا رہا تھا جہاز میں میرے برابر کی نشست پر ایک مولانا براجمان تھے۔ وہ خاصے سادہ سے تھے۔ میں نے دریافت کیا کیوں چچا جان آپ کس سلسلے میں انگلستان جا رہے ہیں تو کہنے لگے۔

''بیٹا میں کافروں کو مسلمان کرنے جا رہا ہوں'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کو انگریزی آتی ہے؟'' کہنے لگے۔ ''نہیں آتی' جس کو مسلمان ہونا ہوگا' اسے خود بخود میری زبان سمجھ آ جائے گی۔''

ہم کراچی سے تہران' قاہرہ' ایتھنز رکتے ہوئے روم پہنچے۔ ایئر لائن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافر حضرات ایئر لائن کے ریستوران میں اپنی مرضی کا کھانا تناول فرمائیں۔ بل کمپنی کے ذمے ہو گا۔ ریستوران میں بیٹھتے تو میں نے ایک چکن روسٹ کا آرڈر دیا۔ ''مولانا' آپ کیا کھائیں گے'' میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ''اس گوری لڑکی سے کہو میرے لیے ابلی ہوئی سبزیاں لے آئے کیونکہ گوشت تو یہاں پر حلال نہیں ہوگا۔'' میں نے بھی بھوک کی وجہ سے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ بہرحال خوشبودار مرغ کے گرد انڈے اور آلو کے قتلے اور سلاد وغیرہ بہار دکھا رہے تھے جبکہ گوری لڑکی نے ایک پلیٹ مولانا کے آگے رکھی جس میں ایک ابلی گاجر اور دو ابلے ہوئے آلو پڑے تھے۔ مولانا نے گاجر کھانے کی کوشش کی مگر میرے روسٹ سے ان کی نظریں ہٹتی نہیں تھیں۔ بالآخر انہوں نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''برخوردار اس گوری ہوٹل والی زنانی سے کہو میرے لیے بھی یہی مرغ لے آئے یہ شکل سے حلال لگتا ہے۔''

مستنصر حسین تارڑ کی تصنیف ''چک چک'' سے اقتباس

انتخاب: صدف اسحاق نگین' کراچی۔

اے رات

اے رات! میں تیرے ساتھ رہا یہاں تک کہ تجھ سے مشابہہ ہو گیا۔ تجھ سے مانوس ہوا' اس قدر کہ میری خواہشیں' تیری خواہشوں میں مکمل مل گئیں میں نے تجھ سے محبت کی۔ اتنی شدید محبت کی کہ میرا وجدان تیرے وجود کی ایک چھوٹی سی تصویر بن گیا۔ چنانچہ میری تاریک روح میں چمکتے ہوئے ستارے ہیں جنہیں جذبہ شوق رات کو بکھیرتا ہے اور دوسرے صبح کو سمیٹ لیتے ہیں۔ میرے قلب نگراں میں ایک چاند ہے جو کبھی بادلوں سے رنگین فضا میں طلوع ہوتا ہے اور کبھی پرچھائیوں سے لبریز خلاء میں۔ میری بیدار روح میں ایک خاموشی ہے' جو اپنے اثرات سے عاشقوں کے راز کھولتی ہے اور جس کی خلائیں عابدان شب زندہ دار کی دعاؤں کو دہراتی ہیں اور میرے سر کے چاروں طرف ایک طلسمی غلاف تنا ہوا ہے جسے مرنے والوں کی خرخراہٹ پارہ پارہ کرتی ہے اور شاعروں کے نغمے سیتے ہیں۔

اے رات! میں تجھ سے مشابہہ ہوں کیا لوگ میری اس مشابہت کو قابل فخر سمجھیں گے جب کہ وہ دن سے مشابہہ ہونے کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔

میں تجھ سے مشابہہ ہوں اور ہم دونوں اس گناہ کے سلسلے میں متہم ہیں جس کا ارتکاب ہم نے نہیں کیا۔

میں تجھ سے مشابہہ ہوں اپنی فطرت' اپنے اخلاق' اپنی امیدوں اور اپنی آرزوؤں کے لحاظ سے۔

میں تجھ سے مشابہہ ہوں اگرچہ شام نے اپنے سنہری بادلوں کا تاج میرے سر پر نہیں رکھا۔

میں تجھ سے مشابہہ ہوں اگرچہ صبح نے اپنی گلابی شعاعوں سے میرے دامن کو نہیں سنوارا۔

میں تجھ سے مشابہہ ہوں اگرچہ کہکشاں کی پٹی میری کمر میں نہیں ہے۔

میں خاموش و مضطرب رات ہوں جس کی زلفیں کھلی ہوئی ہیں اور پہنائیاں ہمہ گیر' میری ظلمت کا کوئی آغاز ہے نہ میری گہرائیوں کی کوئی انتہاء۔

جب بھی روحیں اپنی مسرتوں کی روشنی میں بہ انداز دلکشی کھڑی ہوتی ہیں تو میری روح اپنے غم کی تاریکیوں کے ساتھ عظمت و بزرگی کی بلندیوں کی طرف اڑتی ہے۔

اے رات! میں تجھ سے مشابہہ ہوں اور جب تک موت مجھے اپنی آغوش میں آسودہ نہ کر لے میری صبح نہیں ہوگی۔

خلیل جبران کی تصنیف ''شیطان'' سے اقتباس

انتخاب: پروفیسر صفیہ سلطانہ' جیکب آباد

سنہری باتیں

☆ جن لوگوں کے دلوں میں محبت کی کونپلیں بغیر کسی صلے یا تمنا کے پھوٹیں' وہ بے حس نہیں' بے غرض ہوتے ہیں۔

☆ کتنی عجیب بات ہے' ہم بیماری کے ڈر سے خوراک تو چھوڑ دیتے ہیں' پر افسوس' صد افسوس' آخرت کے ڈر سے گناہ نہیں چھوڑتے۔

☆ شہرت وہ ہے جو مرد اور عورت ہمارے بارے میں جانتے ہیں اور کردار وہ ہے جو خدا اور فرشتے ہمارے بارے میں جانتے ہیں۔

☆ آپ اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیں کہ کسی کا برا کرنے میں آپ پہل نہیں کریں گے۔ یقین جانیے' آپ سرخرو رہیں گے۔

☆ آپ کی ذاتی کائنات میں آپ نے جتنا حصہ اللہ تعالیٰ عزوجل کا رکھا ہے' اتنا ہی اللہ تعالیٰ عزوجل کی کائنات میں آپ کا ہے۔

☆ لوگ زندگی کے اندیشوں میں جیتے ہیں حالانکہ انہیں موت کے اندیشوں میں جینا چاہیے۔

مرسلہ: صنم ماروی' نواب شاہ۔

دوستی

☆ پھولوں کی دوستی سے پہلے کانٹوں سے دوستی رکھو۔

☆ دوستی ایک سمندر کی لہر کی طرح ہے۔ جس طرح لہریں دوسری لہروں کے ساتھ مل کر کبھی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں اور کبھی واضح نظر آتی ہیں' یہی مثال ایک دوست کی ہے۔

☆ دوستی ایک پانی ہے جو دل اور دماغ کو سیراب کرتی ہے۔

☆ جس کا کوئی دوست نہیں' وہ اس گلشن کی مانند ہے جس میں پودے ہیں مگر پھول نہیں۔

☆ دوستی ایک بلند تخیل ندی کے پانی کی طرح جھلمل کرتا رشتہ' بارش کی بوندوں کی طرح نرم و نازک' چاند کی روشنی کی طرح پرسکون اور تاروں کی طرح چمکتا ہوا رشتہ ہے۔

مرسلہ: سعدیہ بلوچ' کوئٹہ

☆☆.....☆☆

طنز کہانی

مختصر خبروں پر مختصر تیکھا تبصرہ



ا۔ش۔خ

☆ حالات 99 سے بُرے ہیں' سابق وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار......!

○ چوہدری صاحب حالات اب اتنے بھی بُرے نہیں ہیں 99 میں میاں صاحب تو جیل گئے تھے۔

☆ اسمبلی قبل از وقت تحلیل کرنے کا مطالبہ پارلیمانی سسٹم کو کمزور کرنے کی سازش ہے ایک خبر......!

○ الیکشن اگست 2018ء میں ہی ہوں گے' سیاست دان بھی چاہتے ہیں جتنا نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں۔

☆ تحریک انصاف کی اسمبلیاں توڑنے کی تجویز احمقانہ ہے' مولانا فضل الرحمٰن......!

○ مولانا اچھے آدمی ہیں' ہمیشہ دوستوں کا خیال رکھتے ہیں۔

☆ رانا ثناء اللہ پاگلوں کا آئی جی ہے' شیخ رشید......!

○ شیخ صاحب پولیس میں نیا محکمہ آپ کو اور قوم کو مبارک ہو......!

☆ نواز شریف مارشل لاء لگوانا چاہتے ہیں' عمران خان......!

○ مارشل لاء لگتا تو پھر بھی میاں صاحب کو گھر جانا تھا' وہ بغیر مارشل لاء کے چلے گئے اور کیا چاہیے خان صاحب آپ کو؟

☆ دنیا جانتی ہے یہ احتساب نہیں' انتقام ہے' مریم نواز......!

○ دنیا؟ کون سی دنیا جو آپ کے گرد گھومتی ہے؟

☆ کراچی میں صورت حال بہت خراب ہے' امن و امان نظر نہیں آتا' جماعت اسلامی......!

○ ماضی میں کب اچھی تھی' وہ وقت بھی بتا دیجیے ذرا۔

☆ کے الیکٹرک کے خصوصی اضافی ٹیرف میں سات سال کا اضافہ' ایک خبر......!

○ کراچی والوں پر بجلی گرانا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔

☆ بجلی چوری کا بوجھ میٹر والے برداشت کرتے ہیں' وفاقی وزیر اویس لغاری......!

○ جی ہاں روڈ پر دہی بڑے والے' سبزی والے' پنکچر والے' جوس والے بھی آپ اُن پر بھی شفقت کی نگاہ ڈالیں' آپ وفاقی وزیر ہیں۔

☆ چوروں لٹیروں کو وی آئی پی پروٹوکول مل رہا ہے' عمران......!

○ سیاسی چور بادشاہ لوگ ہوتے ہیں انہیں کچھ نہ کہو کرپشن نظر آنے کے بعد یہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ''مریضوں کا خیال رکھیں اُن کی دل آزاری نہ کریں۔''

☆ جہانگیر ترین کے خلاف ثبوت غائب کردیے گئے' وفاقی وزیر دانیال عزیز......!

○ یہ فیشن اب عروج پر ہے' جو ادارہ کرپشن میں ملوث پایا جاتا ہے اکثر اُس کی بلڈنگ میں آگ لگ جاتی ہے۔ بلڈنگ محفوظ جبکہ ریکارڈ جل جاتا ہے' ہے نا جادو' کرپشن جو سر چڑھ کر بولے۔

☆ ن لیگ اور پی ٹی آئی دکھاوے کی سیاست کرتے ہیں' پی پی پی......!

○ ارے بھئی اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے آپ اپنے آپ کو بھی اُن میں شامل کرلیں۔

☆ سابق وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار لندن میں ہنوز بیمار ہیں اور استعفیٰ بھی دے دیا' ایک خبر......!

○ اللہ کا نظام بھی ہے جو آپ نے سینئر سٹیزن (عمر رسیدہ افراد) کے ساتھ سلوک کیا ہے کسی کی تو دعا تھی جو عرش پر پہنچی گی جبکہ آپ خود عمر رسیدہ ہیں۔

☆ 12 اکتوبر 1999ء کا آمرانہ قدم ترقی کا راستہ روکنے کی سازش تھی' شہباز شریف......!

○ بھائی اب تو نئی سیریل 'دیکھا جائے گا' شروع ہوئی ہے اُس کا کیا ہوگا؟

☆ حکومت مذاکرات کے نام پر ہم سے مذاق کرتی ہے مطالبات نہیں مانتی' نابینا افراد......!

○ صبر سے کام لو' جن سے مطالبات کیے جا رہے ہیں وہ آنکھوں کے نہیں دل کے نابینا ہیں۔

☆ پی پی پی نے سندھ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے' ایک خبر......!

○ جی ہاں کچرے کے ڈھیر' ٹریفک کا نظام تباہ' لوٹ مار بھی تو ہو رہا ہے مگر اس میں ترقی کہیں نظر نہیں آرہی' کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ سب نہیں ہوتا تو پھر واقعی یہ ترقی ہے۔

☆ نواز شریف نے بیوقوف بنایا' سپریم کورٹ......!

○ ''دھماکہ خیز جملہ'' مجھے کیوں نکالا کا جواب بھی آخر مل گیا۔

☆ آصف زرداری نے قوم کا 6 ارب روپیہ ہڑپ کیا اور اب ہمیں بھاشن دے رہے ہیں' شہباز شریف......!

○ وزیراعظم آپ کا' وزیر داخلہ آپ کا' پولیس آپ کی' آپ نے کرپشن کے لیے کیا کیا؟ قوم کو تو آپ بھی بھاشن دے رہے ہیں۔ او خیر ہو وے۔

☆ گرفتار سعودی شہزادے کرپشن کی رقم لوٹانے پر تیار ہیں' ایک خبر......!

○ لگتا ہے شہزادے آج کل پاکستانی اخبار

پڑھ کر کرپشن کا توڑ سمجھ گئے ہیں۔

☆ضمیر کی آنکھوں سے دیکھیں سب کچھ نظر آجائے گا' چیئر مین سینیٹ......!

○ اگر ضمیر کی آنکھیں ہوتیں تو آج سیاستدان عدالتوں کے چکر نہ لگارہے ہوتے۔

☆انتخاب میں تاخیر ہوئی تو ذمے دار زرداری ہوں گے' سعد رفیق......!

○ شکرادا کرنا چاہیے کہ کچھ عرصہ اور حکومت کومل جائے گا۔

☆اداکارہ میرا کے شوہر نے میرا الزام لگاتے ہوئے کہا ہے کہ میرا میری بیوی ہے' اسے دوسری شادی سے روکا جائے' ایک خبر......!

○ ارے جناب میرا تو اب فلموں میں نہیں آرہی' نہ انہیں کوئی کاسٹ کرتا ہے اور پھر ہر چیز کی عمر ہوتی ہے۔

☆عباسی شہید اسپتال کی حالت زار بلدیاتی قیادت کے لیے شرمناک ہے۔ نعیم الرحمن جماعت اسلامی......!

○ میئر کراچی اس خبر پر توجہ دیں کہ یہ سچی ہے یا جھوٹی؟

☆ہماری کوشش ہوگی کہ سرکاری ٹی وی کے نظریہ کو واپس لایا جائے' مریم اورنگزیب......!

○ نظریہ تو اب واپس نہیں آسکتا بی بی' یہی تو وہ معصوم ٹی وی ہے جو حکومتی ناکامی کو آنکھوں سے چوم کر آن ایئر کرتی ہے۔

☆جو افسر کام نہیں کرے گا وہ گھر جائے گا' شہباز شریف......!

○ جناب ہاتھ ہلکا رکھیں 2013ء سے یہ مزے کررہے ہیں' اب تو چند ماہ رہ گئے ہیں الیکشن میں۔

☆سینیٹ میں کھلونوں نما اسلحے کی تیاری اور فروخت پر پابندی کی قرارداد منظور' ایک خبر......!

○ حیرت ہے کرپشن 'لوٹا ماری' ٹریفک کا نظام اسپتالوں میں دوائیاں ناپید' پانی گیس' بجلی غائب 'لوٹا ماری کے حوالے سے قتل' ایئر لائن ریلوے کے نظام میں خرابیاں اس پر قرار داد کیوں نہیں' قومی اسمبلی' صوبائی اسمبلی اور سینیٹ میں پیش نہیں کی جاتیں کوئی جواب اس کا ہے؟

☆بلاول بھٹو زرداری کا پورے پاکستان میں انتظار ہورہا ہے' پی پی پی......!

○ کس حوالے سے برائے مہربانی روشنی تو ڈالیں۔

☆وفاقی وزیر قانون زاہد حامد نے ملکی مفاد میں استعفیٰ دیا' مریم اورنگزیب......!

○ بی بی زاہد حامد نے جو بھی ملکی مفاد میں کام کیے ہیں پریس کانفرنس کرکے قوم کو ضرور بتائیں تاکہ آپ بھی اِس بیان کے بعد سرخرو ہوں۔

☆میں نے کبھی شوٹنگ منسوخ نہیں کرائی' اداکارہ کا جل......!

○ بی بی 25 سال سے فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو اور جب انسان عمر رسیدہ ہوجاتا ہے تو اپنی ذمے داری زیادہ محسوس کرتا ہے سارا چکر عمر کا ہے۔

☆مرکز قومی بچت کا اوورسیز پاکستانیوں کے لیے اسکیم شروع کرنے پر غور' ڈی جی کا بیان......!

○ اللہ کو راضی کیجیے پرائیویٹ بینکوں کی طرح اچھی شرح پر بزرگوں کے لیے اسلامی سرٹیفکیٹ کا اجرا کریں' اُن غریب اور ایماندار لوگوں کو کب تک سود کی ٹرین میں سوار کرائیں گے کچھ خوف خدا کا بھی کام کرجائیں۔

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو محض فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ ایک اور انگریزی سال تمام ہوا۔ اللہ کرے یہ نیا سال میرے وطن اور اس میں بسنے والوں کے لیے صرف خوشیاں اور کامیابیاں لائے۔ ایک بار پھر اُن تمام بچوں کا شکریہ جن کے تعاون کے باعث کئی سفید پوش کنبے عزت نفس مجروح ہوئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ اس عظیم نیکی کا اجر اللہ انہیں نیک اولاد وافر رزق اور کامیاب اور صحت مند زندگی کی صورت ضرور عطا کرے گا۔ زندگی سے رکاوٹیں دور ہوں گی انشاء اللہ......

سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات سب اپنی عادت میں شامل کرلیں۔ رات کو سونے سے قبل ضرور پڑھیں۔ سورۃ ناس، سورۃ فلق اور آیت الکرسی جب جب یاد آئے پڑھیں۔ موجودہ دور میں سفلی عملیات کا استعمال بدبخت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بہت کر رہے ہیں۔ اللہ سب کو شیطان اور شیطانی عمل سے محفوظ رکھے آمین۔

☐ انجم زبیر۔ لیہ۔

o باباجی! میں نے پہلی بار آپ کا کالم پڑھا تو دل کو بہت سکون ہوا۔ یقین ہوگیا کہ دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ باباجی! میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ میں عرصہ 7 سال سے کسی کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے کسی طور نہیں مان رہے خاص طور پر والد اور بڑے بھائی۔ اگر میرے گھر والے مان جائیں تو وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دیں گے۔ باباجی! میں اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ ظہر اور عصر قضا ہو جاتی ہیں۔ آج کل دن ویسے بھی چھوٹے ہیں، گھر آتے آتے مغرب کا وقت ہو جاتا ہے۔ اب برائے مہربانی مجھے تعویذ عنایت کیجیے اور طریقہ استعمال بھی بتائیے۔

☆ بیٹی انجم......اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تعویذ میں ضرور تیار کردوں گا مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے والد اور بھائی اس رشتے کے خلاف کیوں ہیں؟ بیٹی......والدین کا تجربہ بہت ہوتا ہے، پھر وہ اپنی اولاد سے محبت بھی بہت کرتے ہیں لہٰذا برا چاہ ہی نہیں سکتے۔ تمہارا خط واضح نہیں ہے تفصیل سے مجھے خط لکھو اس کے بعد میں تمہیں حل بتاؤں گا مگر بیٹی......ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ والدین کو دکھی کرکے اولاد کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔

☐ جاوید جمالی۔ کوئٹہ۔

o باباجی! میں اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھتا رہا ہوں اور اللہ کے فضل سے میرے مسائل بھی حل ہوئے ہیں۔ آج آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ باباجی! اس کی شادی 2015ء میں میرے سگے ماموں زاد سے ہوئی اور بدلے میں

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

میری شادی وہاں ہوئی۔ اس طرح ایک گھر کے دو لوگ ہمارے پاس ہیں۔ باباجی! میری بہن کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہے۔ یہ بات اس لیے محسوس زیادہ ہوتی ہے کہ میری شادی بہن کی شادی کے ایک ماہ بعد ہوئی اور میرے گھر میں ایک بیٹا بھی ہے اور دوسری اولاد کی امید ہے۔ بہن میرے بچوں کو بہت حسرت سے دیکھتی ہے۔ آپ اتنا مؤثر تعویذ دیں کہ وہ جلد از جلد ماں بن سکے۔

☆ بیٹے جاوید......اللہ تمہاری بہن کو خوش اور آباد رکھے۔ تعویذ میں تیار کردوں گا مگر مجھے کچھ تفصیلات درکار ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ بہن مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھے۔ میں تفصیل سے جواب دوں گا۔ بس بچی اللہ پر بھروسا رکھے۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے اور جو لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں وہ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔

☐ گل حمید۔ پنڈی۔

o باباجان! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس کو آپ نے شادی کے لیے تعویذ اور ورد دیا تھا۔ باباجان! اللہ کا بڑا کرم ہے، آپ کی دعاؤں سے میری شادی ہوگئی اور میں اپنے گھر میں بہت سکون سے ہوں۔ باباجان! اصل میں مسئلہ میری نند کا ہے۔ وہ اچھی شکل و صورت کی ہے، تعلیم یافتہ ہے سلیقہ مند ہے مگر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں، پسند کر جاتے ہیں اور پھر بلاوجہ انکار ہو جاتا ہے۔ باباجان! پہلے تو ہم نے یہ بات محسوس نہیں کی مگر اب احساس ہونے لگا ہے۔ اس کے ساتھ کی تمام بچیوں کی یا تو شادی ہوگئی ہے یا کم از کم بات تو طے ہی ہے۔ میری ساس دل کی مریضہ ہیں اور یہ مسئلہ اُن کی تکلیف میں اضافہ کر دیتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی حل نکالیے۔

☆ بیٹی گل! اللہ کا شکر ادا کیا کرو اور عہد کرلو کہ اب ہر کام میں اللہ کی رضامندی لیا کروگی۔ جہاں تک تمہاری نند کا تعلق ہے تو بیٹی سے کہو بعد نماز فجر ایک بار سورۃ احزاب پڑھے اور دعا کرے۔ اپنی ساس سے کہو بچی کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔ بعض اوقات بچے بدنظر کا شکار ہو جاتے ہیں اور اُن کے تمام معاملات میں پھر رکاوٹ نظر آنے لگتی ہے۔ بہرحال اللہ پر بھروسا رکھو وہ بہتر کرنے والا ہے۔

☐ امجد خان۔ بنوں۔

o باباجی! آج بہت ہمت کرکے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نبرد آزما ہوں مگر اب بیٹی کی بیماری نے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ باباجی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے، اب سے چھ ماہ پہلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک رات اچانک درد اٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ٹیسٹ ہوئے جن سے پتا چلا کہ گردے صحیح کام نہیں کر رہے لہٰذا Dialysis ضروری ہے۔ ہفتے میں 3 دن بچی کے ساتھ اسپتال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو باباجی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، پھر اب ڈاکٹرز Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ اُن کے مطابق گردے آہستہ آہستہ ناکارہ ہو رہے ہیں اور اب تک جو بھی علاج ہوا ہے، اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آرہا لہٰذا گردے کی پیوندکاری ضروری ہے۔ باباجی! اس بات نے ہمارے ہوش اُڑا دیے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اس مہنگے ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ باباجی! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت

خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیئے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے معجزہ ہوجائے اور میری بیٹی پہلے جیسی صحت مند ہوجائے۔ باباجی! اس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں' مجھ سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اُس کی ماں کو کیسے سمجھاؤں؟ رحم کیجیے اور اِس مشکل وقت میں مدد بھی۔

☆ بیٹے امجد! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا مگر بیٹے! ہمت سے اِس آزمائش کا سامنا کرو۔ تمہیں اپنے اندر ہمت پیدا کرنی ہوگی ورنہ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بیٹے! بے شک میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اِن رپورٹوں کو حرفِ آخر سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بے نیاز ہے' وہ جب چاہے' جسے چاہے نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو' بچی کا علاج کرواؤ۔ اِس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ دُعا اور دوا دونوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اَسباب بھی پیدا کرے گا۔ بس اپنا یقین پختہ رکھو۔ بعد نمازِ فجر اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی دو دو گھونٹ بیٹی کو پلاؤ۔ میں بھی خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں' انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ نور بانو۔ حیدر آباد۔

o باباجی! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے بڑے ہیں اور ماشاء اللہ' دونوں انجینئرز ہیں۔ تعلیمی ریکارڈ دونوں کا ہمیشہ بہت شاندار رہا مگر عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اُن کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے۔ پڑھائی کے حساب سے نوکری نہیں ملتی۔ میں نے بچوں کو انتہائی جدوجہد سے پڑھایا ہے۔ اُن کے والد بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ میں نے یہ ذمے داریاں

تن تنہا اٹھائی ہیں۔ اَب اپنی زندگی میں' میں اپنے بچوں کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے وظیفہ عنایت فرمایئے اور مدت ضرور تحریر کریں۔

☆ بیٹی نور! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 3-3 تسبیح سورۃ آلِ عمران' آیت 17 پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ یقیناً تم نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہوگی۔ انشاء اللہ' اِس کا اَجر بھی ملے گا۔ بس اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ یاسمین۔ حیدر آباد۔

o باباسائیں......! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ باباسائیں......! میری عمر 24 سال ہے' 2 بچے ہیں۔ میاں بینک میں جاب کرتے ہیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے' زندگی پرسکون ہے مگر اِس کے باوجود میں اکثر راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔ مختلف سوچیں ذہن منتشر رکھتی ہیں۔ جاگنے کی وجہ سے چہرے کی تازگی بالکل ختم ہوگئی ہے۔ بے شمار جھائیوں کی وجہ سے چہرہ بہت بدنما لگتا ہے۔ مہنگی ترین کریمز اور لوشن استعمال کرکے دیکھ چکی ہوں مگر کوئی فائدہ نہیں۔ آپ مشورہ دیں' کیا کروں؟

☆ بیٹی یاسمین......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ پانی بہت پیو اور رات میں سوتے وقت ایک گلاس گرم دُودھ ضرور پیا کرو۔ مناسب ہوگا' مجھ

سے چہرے کی تازگی کے لیے دوا منگوالو۔ انشاء اللہ' ضرور فائدہ ہوگا۔ سردیوں میں ویسے بھی جلد خراب ہوجاتی ہے' ایسے میں یہ دوا بہت فائدہ مند ہے۔

□ نواز۔ لاہور۔

o باباجی! میں اپنے مسئلے کے لیے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اِس سے پہلے بھی خط لکھا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ باباجی! میں اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر میرے گھر والے تیار نہیں' خاص طور سے میرے والد اور بڑی بہن۔ وجہ یہ ہے کہ میرے گھر والے چاہتے تھے کہ خالہ زاد بھائی سے بہن کی شادی ہوجائے مگر میری پسند کو دیکھتے ہوئے اُن لوگوں نے بہن کا رشتہ رَد کردیا کہ یہ ادلہ بدلہ ہوجائے گا۔ مجھے وہ لوگ ہمیشہ سے بہت پسند کرتے ہیں' بس اِس بات کو میرے گھر والوں نے اَنا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ باباجی! میں ایک ملٹی نیشنل میں اچھی جاب پر ہوں اور بہت آرام سے شادی شدہ زندگی کی ذمے داریاں اٹھا سکتا ہوں۔ آپ مجھے ایسا تعویذ دیں جس کی بدولت یہ رُکاوٹ دور ہوجائے کیونکہ اَب اُس کی پڑھائی بھی مکمل ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسا تعویذ دیں جس کی برکت سے ہمارا رشتہ سب کی مرضی اور رضامندی سے طے پائے کیونکہ میں بڑوں کو ناراض کرکے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ وظیفے کے لیے معذرت چاہوں گا۔ اکثر نمازیں قضا ہوجاتی ہیں۔

☆ بیٹے نواز......! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ طاقت رکھنے کے باوجود تم قدم اٹھانے سے گریزاں ہو' صرف اِس لیے کہ بڑوں کو دُکھ نہ پہنچے۔ اللہ تمہیں اِس کا صلہ ضرور کامیابی کی صورت میں دے گا۔ بیٹے......اگر تم تعویذ لینا چاہتے ہو' میں تعویذ ضرور تیار کردوں گا مگر اِس کے لیے کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ مینا خان۔ پشاور۔

☆ بیٹی مینا......! تمہارا مسئلہ شائع کرنا مناسب نہیں۔ تم مجھے براہِ راست خط لکھو۔ مجھے اِس بات کا خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی میرے کالم میں شائع نہ ہو جو مناسب نہیں۔ گھروں میں خواتین یہ رسالہ پڑھتی ہیں' کم عمر بچیاں پڑھتی ہیں لہٰذا بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

□ فضل الٰہی۔ اسلام آباد۔

o باباجی! میں عرصہ 12 سال سے گارمنٹ کا کام کررہا ہوں مگر اَب کچھ عرصے سے کاروبار سے برکت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ سارا سارا دن گزر جاتا ہے' کوئی گاہک نہیں آتا۔ مہنگائی کے اِس دور میں بچوں کا بھی ساتھ ہے۔ مہینہ گزارنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ بچوں کی فیس' اِس کے علاوہ بجلی' پانی' گیس' راشن اِن خرچوں نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ سارا مہینہ ٹینشن میں گزرتا ہے۔ باباجی! نوکری تو ہے نہیں کہ اگلے مہینے تنخواہ کے آسرے ہاتھ روک کر گزارہ کرلیں۔ بڑی پریشانی ہے' کوئی حل بتایئے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

☆ بیٹے فضل الٰہی! رزق میں برکت کے لیے بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ پڑھنا بہت مبارک ہے۔ اِس کے علاوہ ہر جمعے کو بعد نمازِ جمعہ کچھ رقم ضرور خیرات کرو۔ کبھی کبھی حالات بہت مشکل ہوجاتے ہیں' ایسے میں صبر اور مستقل مزاجی سے معاملات کو

سنبھالنا چاہیے۔ اللہ سے ضرور مدد مانگتے رہو' وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ خالدہ۔ جہلم۔

o باباجی! میں آپ سے مستقل رابطے میں رہتی ہوں مگر کچھ حالات کی وجہ سے اِس بار خط کالم میں شائع کروانا چاہتی ہوں۔ میں نے پچھلے خط میں بھی آپ کو لکھا تھا کہ میرے بیٹے بہو آپس میں بہت لڑتے ہیں' ہفتوں دونوں آپس میں بات نہیں کرتے۔ باباجی! اَب تو حالات بہت سنگین ہوگئے ہیں۔ میرا بیٹا بہو دونوں ڈاکٹر ہیں اور C.M.H. پنڈی میں ہوتے ہیں۔ مجھے بہو بتا رہی تھی کہ میرا بیٹا اَب کسی نرس میں دلچسپی لینے لگا ہے' جس کی وجہ سے اُن میں جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں۔ تین بچے ہیں' وہ الگ سہمے سہمے رہتے ہیں۔ باباجی! قصور دونوں کا ہے مگر بہو کا زیادہ ہے۔ مرد تو اَنا پرست ہوتا ہے مگر عورت کو گھر اور بچوں کی خاطر جھکنا چاہیے' وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ پڑھی لکھی ہے' خوش شکل ہے مگر اَب تک اُس نے اپنے شوہر کو منانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا بیٹا اگر ناراض ہوجائے اور بات چیت بند کردے تو وہ بھی اُس وقت تک بات نہیں کرتی جب تک بیٹا خود سے بات نہ کرے۔ بچے مجھے فون کرکے بتاتے ہیں پھر میں درمیان میں پڑ کر صلح صفائی کرواتی ہوں مگر باباجی! ایسے کب تک چلے گا؟ میں کون سا ہمیشہ رہوں گی؟ پچھلے سال اِسی موسم میں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی اور میں 15 دن اسپتال میں رہی۔ جب گھر واپس آئی اور بچوں کو قسم دے کر حالات پوچھے تو پتا چلا' دونوں میاں بیوی ڈیڑھ مہینے سے بات نہیں کر رہے' کمرے بھی الگ کرلیے ہیں۔ باباجی! آپ میرا دُکھ سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کے لیے' ایسا وظیفہ دیں' جس کی برکت سے دونوں کو عقل آجائے اور میرا بیٹا بیوی بچوں کے پاس لوٹ آئے۔

☆ عزیزہ خالدہ! تمہارا خط پڑھ کر دُکھ ہوا۔ اتنی تفصیل سے شائع کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کو اندازہ ہو کہ اُن کے آپس کے رویے کا بھی ماں باپ پر اثر پڑتا ہے۔ جن گھروں میں محبت اور خلوص ہو' ایسے بچوں کے والدین بھی مطمئن رہتے ہیں مگر جہاں یہ سب نہ ہو' وہاں صرف ایک کنبہ ہی نہیں بلکہ پورا خاندان متاثر ہوتا ہے۔ بچوں کو سوچنا چاہیے کہ اِس بڑھاپے میں والدین کو اپنی ذات سے دُکھ نہ پہنچائیں اور جو بچے یہ بات سمجھتے ہیں' وہ اپنے گھر بہت سنبھال کر لے جاتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد اَنا پرست ہے مگر اِسلامی معاشرے میں مرد اپنے کنبے کا سربراہ ہے' وہ محبت اور ایثار کی زندہ مثال ہے' صبر و برداشت کا نمونہ ہے۔ اپنے لیے تو سب جیتے ہیں' دوسروں کے لیے جینا اَصل زندگی ہے۔ تمہاری صحت اچھی نہیں' اِس لیے سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ بعد نماز ظہر اور عشاء 3-3 تسبیح یَاحَفِیظُ یَاحَافِظُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔

□ جہاں بیگم۔ خیرپور۔

o باباجی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سُکھ میسر نہیں۔

میری 5 لڑکیاں ہیں' سب شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لکھی ہیں' قبول صورت ہیں' پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ باباجی! میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ بچیوں کے والد تو ہیں نہیں۔ میں بھی نہیں رہی تو اُن کا کیا ہوگا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھ نہیں سکتی۔ یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں' بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری دُعا جلد از جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے' چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے' اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی! صرف ایک لمحے کے لیے سوچو' تم بچیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہو تو وہ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچیوں کے لیے بہترین اَسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اِس پاک ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ مجھ سے تعویذ منگوا کر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ رضوان شیخ۔ مسقط۔

o باباجی......! میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔ میری نوکری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اِس لیے دیر ہوئی کہ کام نیا تھا لہٰذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ میں نیند بھی صرف 4 گھنٹے کی لیتا تھا مگر اَب اللہ کا شکر ہے' پہلا ڈرافٹ گھر بھیجا تو امی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا شکر اَدا کرو اور پھر باباجی کو خط لکھو۔ بس باباجی! اِسی طرح دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت کرسکا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔

☆ بیٹے رضوان......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب دُرست سمت کوشش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہوجاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹے......! والدین کی بہت خدمت کرنا۔ انہوں نے تمہاری پرورش بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع مت دینا۔ میری دُعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

□ نور جہاں۔ گجرات۔

☆ بیٹی نور جہاں......! اللہ تمہیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسا رکھو' وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فیصلہ کرو گی' اُس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو' جو شخص تمہیں تمہارے والدین سے متنفر کرسکتا ہے' وہ تم سے کبھی بھی مخلص نہیں ہوگا۔ اَب بھی وقت ہے' اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔

□ ثمینہ۔ لاہور۔

☆ بیٹی ثمینہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ورد جاری رکھو۔ بیٹی! میں بار بار ایک ہی بات کہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں اور مکمل یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہوجاتے ہیں۔ خوش حالی میں اللہ تعالیٰ ربّ العزت کا شکر اَدا کرنا اور مشکل میں بھی صابر و شاکر رہنا ہی اصل مومن کی پہچان ہے۔ تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ مہناز۔ کراچی۔

☆ بیٹی مہناز.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تم جس قدر جلد ممکن ہو' مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ منگوانے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے جوابی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

لفافے کے ہمراہ تفصیلی خط اِرسال کرو۔

□ شاہد علی۔ آزاد کشمیر۔

○ محترم المقام واجب الاحترام جناب باباجی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں نے پہلے بھی ایک عرض نامہ بھیجا تھا لیکن شاید وہ آپ کو موصول نہیں ہوسکا۔ باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ میری والدۂ محترمہ جن کی عمر تقریباً 58 برس ہے (اللہ تعالیٰ اُن کی عُمر دراز کرے!)' اُن کی دائیں ٹانگ اور دائیں بازو میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ یہ صورتِ حال عرصہ بیس سال سے ہے اور ساتھ ہی کمر میں بھی درد رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ کافی عرصے سے بائیں نتھنے سے نکسیر پھوٹتی رہتی ہے اور اِس کے علاوہ اکثر اُوقات دَم گھٹ سا جاتا ہے اور گہرے گہرے سانس لیتی ہیں اور سر میں بھی کھنچاؤ اور درد سا رہتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا' سب کا یہی کہنا ہے کہ یہ مجموعی طور پر جسمانی کمزوری ہے اور بس۔ باباجی! ہم غریب لوگ ہیں' جو کچھ بن پڑتا ہے' اُن کے لیے اچھی غذا وغیرہ لیتے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہورہا اِس لیے آپ کی خدمت میں عرض کررہا ہوں' یقیناً اللہ کے کلام میں بہت شِفا ہے اور آپ کی دُعاؤں سے مسئلہ حل ہوجائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ! باباجی! میری ایک نوجوان بہن اور جوان العمر ماموں یکے بعد دیگرے وفات پاگئے ہیں۔ والدہ کو اُن کا بھی بہت صدمہ رہتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں اور ہمیں کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میری والدہ صحت یاب ہوجائیں۔ ہم تاعمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد اَلحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر والدہ پر ضرور دَم کیا کرو۔ اللہ سے دُعا کرو کہ جو اُن کے حق میں بہتر ہو' وہ فرمائے۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات بھی دیا کرو۔ انشاء اللہ مکمل صحت عطا ہوگی۔

□ شاہدہ گل۔ بدین۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں اور میری صرف ایک بیٹی ہے۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کے بعد پتا چلا ہے کہ کچھ اندرونی مسائل کے باعث مزید بچے نہیں ہورہے۔ پلیز' باباجی! مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میری اولاد ہوسکے اور وہ بھی اولادِ نرینہ یعنی کہ بیٹا کیونکہ میرے شوہر پہلے سے شادی شُدہ ہیں اور میرے لیے بہت سے مسئلے ہیں۔ پلیز' میرے اِس خط کا جواب جلد از جلد دیں۔

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' ہدیہ اور تفصیل جوابی لفافہ اِرسال کرو تو بتائی جائے گی۔

□ شاہین۔ سیالکوٹ۔

☆ بیٹی شاہین! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! ایسا نہیں ہوتا ہے کہ آج کوئی کام شروع کیا اور وہ فوراً ہی کامیابی کی طرف بڑھنا شروع ہوجائے۔ کچھ وقت بلکہ بعض اُوقات کافی وقت درکار ہوتا ہے لہٰذا مستقل مزاجی سے کام کرنا چاہیے۔ تم ہر نماز کے بعد سورۃ مزمّل' آیت 7'...... 99-99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ شیر علی۔ نامعلوم مقام۔

○ السلام علیکم! میرا نام علی شیر ہے' عمر 30 سال ہے۔ آپ کو پہلے بھی ایک خط لکھا تھا مسئلے کے لیے' وہ آپ نے اگست کے شمارے میں شائع کیا ہے۔

میں نے مسئلے کا لکھا تھا کہ میری بیوی سے انجانے میں زنا ہوا ہے' وہ اس پر بہت نادم ہے اور دوسرا میری بیوی پر الزام لگا ہے کہ اس کے اپنے بھانجے سے ناجائز تعلقات ہیں۔ باباجی! میں اپنی بیوی کو جانتا ہوں' وہ اپنے بھانجے کو بیٹے کی طرح چاہتی ہے۔ بھانجے کی عمر 24 سال ہے۔ میری بیوی کی عمر 26 سال ہے۔ آپ نے کوئی وظیفہ نہیں بتایا جس سے میری بیوی کو اور مجھے سکون مل جائے۔ باباجی! آپ کو علم ہے کہ خراب کردار کی عورت کبھی بھی اپنے شوہر کو زنا کے بارے میں نہیں بتاتی مگر میری بیوی نے مجھے یہ بات بتائی کہ میں بہت نادم ہوں۔ مجھے کوئی وظیفہ بتا دیں جس سے دل کو سکون مل جائے۔ باباجی! میری بیوی میں ایک عادت لڑکوں والی ہے' جہاں پر لڑکوں کی محفل ہوگی' وہ عورتوں والی محفل چھوڑ کر لڑکوں والی محفل میں جا بیٹھے گی۔ میں نے کئی بار منع کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے لمبے اور خوب صورت لوگ پسند ہیں مگر میں گندے کردار کی نہیں ہوں۔ باباجی! میری بیوی سے زنا رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا تھا۔ میری بیوی ناپاکی کی حالت میں تھی۔ باباجی! آپ بتلائیں کہ میری بیوی کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہیں یا نہیں؟ اور دوسرا ہمارے چار بچے ہیں' تین لڑکیاں' ایک لڑکا ہے۔ میں اُسے معاف کردوں یا طلاق دے دوں؟ میری رہنمائی ضرور فرمائیں۔ ہمارا مسئلہ ضرور شائع کرنا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری بیوی ہر ایک سے محبت سے پیش آتی ہے جس کی وجہ سے میری بیوی پر الزامات لگے ہیں۔ باباجی! آپ بتائیں کہ عورتوں کو مردوں سے فاصلہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

☆☆......☆☆

اس ٹریول گائیڈ میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی جاتی ہیں

ملکہ کی سرزمین کی سیر

ایک ایسے سفر کی داستان جس نے میری زندگی بدل دی

دیس دیس گھومیے......!

زین شمسی

آج ملکہ کے ملک برطانیہ کے بارے میں کچھ خاص باتیں آپ سے شیئر کرنی ہیں۔ بہت سے پڑھنے والوں نے برطانیہ کا سفر کیا ہوگا مگر ہوسکتا ہے



کہ وہ ان باتوں سے واقف نہ ہوں تو چلیں کچھ معلومات میں اضافہ ہوجائے۔

برطانیہ یا انگلستان دراصل چار ملکوں پر محیط مملکت ہے ایک طرف آئیرلینڈ' اسکاٹ لینڈ اور دوسری جانب انگلستان اور ویلز واقع ہیں۔ انگلستان پر حکومت ملکہ برطانیہ کی ہے مگر قانون پارلیمنٹ کا چلتا ہے۔ یہ دنیا کی گیارہویں سب سے بڑی جمہوری مملکت ہے۔ برطانیہ کا دارالخلافہ لندن ہے انگلستان جنوبی یورپ میں واقع آبادی کے لحاظ سے

چوتھی بڑی مملکت ہے۔ یہاں تقریباً ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں جس میں سب سے بڑی آبادی عیسائیوں کی ہے۔ مسلمان کل آبادی کا 4 فیصد ہیں' کل آبادی 64 ملین ہے۔ سرکاری زبان انگریزی ہے اور ریجنل زبان کورنش ہے۔ برطانیہ کے امیگریشن کے قوانین بہت سخت ہیں مگر دنیا بھر سے لوگ برطانیہ کمانے کے لیے جاتے ہیں۔ برطانیہ ویلفیئر اسٹیٹ ہے اور یہ اپنے شہریوں کے حقوق کا بہت خیال رکھنے والی مملکت ہے۔ دنیا کی پانچویں بڑی معیشت ہے۔ کرنسی پاؤنڈ اسٹرلنگ کہلاتی ہے۔ حال ہی میں برطانیہ یورپی یونین سے باہر آیا ہے لہٰذا کچھ معاشی مشکلات ہیں۔ ٹیکسز میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مانچسٹر وہ شہر ہے جہاں ہر جگہ پاکستانی' بھارتی اور چینی نظر آتے ہیں۔ یہاں تمام تر پاکستانی کھانے دستیاب ہیں۔ کاروبار بھی زیادہ تر پاکستانیوں کے پاس ہی ہے۔ موسم شدید ہے اور موسم گرما صرف دو ماہ رہتا ہے۔ تعلیمی نظام بہترین ہے۔ قائداعظم' علامہ اقبال' لیاقت علی خان یہ سب انگلستان کے ہی گریجویٹ ہیں دنیا کی بہترین یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمرج یہاں واقع ہیں۔

اس کے علاوہ دنیا کی 93 ٹاپ یونیورسٹیاں بھی انگلستان میں ہیں۔ اگر آپ لوگ اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں پلان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پارک شائر' کورن وال' لندن' ڈیوان اور لیک ڈسٹرکٹ بہت خوبصورت سیاحتی مقام ہیں یہاں بہترین ہوٹلز اور موٹلز بھی موجود ہیں۔ پارک شائر اپنے ریسٹورنٹ کی وجہ سے مشہور ہے۔ لیک ڈسٹرکٹ ان لوگوں کے لیے جنت ہے جنہیں فطرت میں دلچسپی ہے۔ مشہور انگلش شاعر ولیم وڈورڈز کا شہر ہے موسم غیر



یقینی ہے اچانک رم جھم بھی ہوسکتی ہے اور سورج بھی نکل سکتا ہے۔ انگلستان کی تاریخ کیونکہ بہت پرانی ہے لہٰذا یہاں قدیم اور خوبصورت آرکیٹکٹ ہر جانب نظر آتا ہے۔ لوگ بہت ملنسار نہیں ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن اگر آپ کو مدد درکار ہو تو پھر بہت لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد برطانیہ میں حصولِ معاش کے لیے مقیم ہے۔ اب تو ان کی تیسری چوتھی نسل وہاں پروان چڑھ رہی ہے۔ اُن کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو انگلستان کے گوروں کو' سچی بات تو یہ ہے کہ جو ایک بار اس سرزمین پر قدم رکھ دیتا ہے واپس نہیں آنا چاہتا۔

مختلف کھیلوں سے برطانیہ کے لوگ بہت شغف رکھتے ہیں Wembly اسٹیڈیم دنیا کا مہنگا ترین اسٹیڈیم ہے۔ فٹبال' ٹینس' رگبی' کرکٹ اور گالف بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ سینٹ انڈریوز دنیا کا خوبصورت ترین گالف کلب ہے۔ تو جناب یہ بات ثابت ہوئی کہ کامیاب قوموں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا کچھ وقت کھیلوں کیلئے بھی مختص کریں۔ جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے کھیل بہت ضروری ہیں افسوس کہ ہم لوگ اس نعمت سے کافی حد تک محروم ہیں۔

یہ بات میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ شیکسپیئر برطانیہ کی پہچان ہیں یا برطانیہ شیکسپیئر کی' بہرحال اس قد آور رائٹر کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے اور صرف یہی نہیں جارج ایلیٹ' جان ملٹن' تھامس موز' جین آسٹن' چارلس ڈکنز' گراہم گرین' اے اے ملن' ایچ جی ویلز وغیرہ وغیرہ بہت لمبی فہرست ہے دنیا کے مشہور ترین رائٹرز اور شاعر اسی سرزمین سے ابھرے۔ Bigben' بکنگھم پیلس اور Beetles مشہور زمانہ بینڈ شاید ہی کوئی ہو جو آج بھی اُن سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ الفریڈ ہچکوک فلم میکر' چارلی چپلن' رچرڈ برٹن' سین کونری' کیٹ ونسلیٹ' انتھونی ہاپکنز وغیرہ...... اور لیڈی ڈیانا...... کون اس حسین شہزادی سے واقف نہیں...... لیڈی ڈیانا کی ذاتی زندگی جو بھی ہو مگر انہوں نے کوڑھ کے مریضوں اور لینڈ مائنز میں معذور ہونے والے لوگوں کے لیے بہت کام کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی لوگ ان کی تصویر دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں اُن کا نام سن کر ٹھہر جاتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ برطانیہ بھی اللہ کی زمین پر واقع ایک ملک ہے بالکل ایسے ہی جیسے ہمارا پاکستان' مگر انگلستان کو گریٹ برٹن بنایا قانون کی پاسداری نے' آج بھی پولیس والا صرف ایک ڈنڈا لے کر چلتا ہے۔ ہماری طرح بھاری بھرکم ہتھیار نہیں...... وجہ صرف قانون پر عمل داری ہے جو وہاں کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ جہاں قانون ہوتا ہے وہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ امن وامان ہو تو ملک ترقی کرتے ہیں اور جہاں لاقانونیت ہو وہاں ہر دن کی ابتدا بری خبر سے ہی ہوتی ہے۔

آخر میں بس صرف یہ دعا ہے کہ میرے اللہ میرے پاکستان کو بھی بری نظر اور بری نظر والوں سے محفوظ رکھنا اور ہمارا شمار بھی ان قوموں میں ہو جو اپنی تاریخ خود بناتی ہیں۔

☆☆......☆☆

ڈاکٹر صغرا صدف کا تخلیقی وجدان

اُن کے ہاں روحِ عصر کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے

شبیر ناقد

تخلیق' تخلیہ اور تخیل سے عبارت ہے اور تخیل کو خیال سے نسبت ہے فنِ شاعری میں جس شاعر یا شاعرہ کے ہاں افکار میں جس قدر وفور اور تنوع پایا جاتا ہے اس کا تخلیقی وجدان بھی اس قدر بسیط و عمیق ہوتا ہے' اکثر و بیشتر شاعرات کے احساسات چند مخصوص قسم کے موضوعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے ہاں فکری وسعت کا اہتمام نہیں ہو پاتا کسی کے آورش کی وسعت کا اندازہ اُس کے موضوعات سے لگایا جاتا ہے شذرہ ہذا میں ڈاکٹر صغرا صدف کے شعری مجموعہ 'وعدہ' کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار میں سے اُن کے تخلیقی وجدان کی صراحت کرتے ہیں ڈاکٹر صغرا صدف کا تعلق لاہور سے ہے 'وجدان' نامی ادبی جریدے کی ادارت بھی کرتی رہی ہیں اس کے علاوہ شام وسحر' ارژنگ اور دیگر متعدد ادبی جرائد میں بھی ان کا کلام تواتر سے چھپتا رہتا ہے' بین الاقوامی طور پر مشاعروں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

اُن کے ہاں رومانوی افکار بھی کثرت سے ملتے ہیں' اُن کا طرزِ اظہار جداگانہ ہے اُن کے کلام میں وہ تاثیر ہے کہ قاری کے دل پر براہ راست اثر کرتا ہے اُن کی غزل کے چار اشعار دامنِ دل تھام رہے ہیں

اس وحشتِ آرزو میں بکھرنے تو دے مجھے
اعلان وحشتوں کا وہ کرنے تو دے مجھے
یہ میرا مسئلہ ہے کہ کیسے کروں قیام؟
پہلے وہ اپنے دل میں اُترنے تو دے مجھے
دیکھے تو ایک بار مجھے وہ بھی پیار سے
تکمیل اپنی ذات کی کرنے تو دے مجھے
قطرے سے میں بنوں گی سمندر مگر صدف
یہ شرط ہے وہ جاں سے گزرنے تو دے مجھے

وہ عمومی احساسات کو مخصوص شعری پیرہن عطا کرتی ہیں' عمومیت اُن کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے' اُن کے شعور کی کئی پرتیں ہیں' کئی پہلو ہیں جو تہہ در تہہ کھلتے چلے جاتے ہیں رومان اُن کے کلام کا مستقل حوالہ ہے' رومان نگاری کی ذیل میں ان کی غزل کے دو اشعار دیکھتے ہیں۔

نقصان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئینہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں خوش ہوں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا

اُن کے ہاں روحِ عصر کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے' کہیں کہیں اُن کا تخیل قبائے کرب وسوز اوڑھ لیتا ہے' کہیں حزن وملال عروج پر پہنچا ہوا ہوتا ہے پرآشوب کیفیات کا بیان بھی دامنِ دل تھام لیتا ہے' اُن کی غزل کے پانچ حزنیہ اشعار جو عصر حاضر کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں زیبِ قرطاس ہیں۔

مقتل بنا ہوا ہے مرا شہر ان دنوں
اب راہ سوجھتی نہیں کوئی نجات کی
سانسیں ہیں زخم زخم موسم ہیں بے روا
دہرا رہا ہے وقت کہانی فرات کی
پہلے قدم قدم پہ بہاروں کا راج تھا
اب خون میں نہاتی ہے وادی سوات کی
صحنِ وطن میں ایسا اندھیرا بکھر گیا
دن کا شعور مجھ کو نہ پہچان رات کی
بے خواب موسموں میں لٹا قافلہ مرا
اپنے ہی لکھ رہے تھے کہانی یہ بات کی

خیالات کا مجسم ہونا کسی اعجازِ مسیحائی سے کم نہیں اور تخیل کی نادرہ کاری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے' شعر کی ایک بہت بڑی خوبی اس کی پہلو داری بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ معرفت ومجاز کے سانچے میں ڈھل جائے اسی حوالے سے اُن کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے۔

اس نے مرے خیال کو تجسیم کر دیا
وہ جو دکھائی دیتا ہے مجھ کو چہار سو

ہر دور میں عشق وجہِ بے کاری سمجھا جاتا رہا ہے جیسے مرزا اسد اللہ غالب نے کہا تھا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اُن کے ہاں عشق کی تباہ کاریوں کا بیان بھی ہے اور آرزوؤں کا کرب بھی ہے حسرتوں کا ماتم بھی ہے' ان کے علاوہ ان کے ہاں رجائی حوالے بھی ملتے ہیں' حالات جیسے بھی ہوں امید کی کرن زندگی کرنے کا ولولہ بخشتی ہے' اسی نسبت سے ان کی غزل کے تین اشعار ودیعت ہیں۔

جینے نہیں دیا مجھے مرنے نہیں دیا
کوئی بھی کام عشق نے کرنے نہیں دیا
میری ہتھیلیوں پہ بھی سورج تھے بے شمار
لیکن انہیں کسی نے ابھرنے نہیں دیا
میرے لیے تو زندگی جنگل کی رات ہے
پر اس کی یاد نے تو ڈرنے نہیں دیا

متعدد شعری مجموعوں کی خالق اور بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کرنے والی یہ شاعرہ بے پناہ شعری اوصاف کی حامل ہے بین السطور کائی دلچسپ کیفیات کے اشعار رہ دل پر دستک دینے لگتے ہیں قاری پر ان کے تخلیقی رجحانات گہرے اثرات چھوڑتے ہیں' ایسے سخنور بساطِ فکروفن میں لائقِ اکرام ہوا کرتے ہیں۔

☆☆......☆☆

سفر کہانی

جہاں کی ریت سفید رنگت کی ہے

زندگی تو نمک ہوگئی ہے صاحب...!!

کرشن چندر نے افسانہ 'پانی کا درخت'
شاید انہی نمک کے مزدوروں پر لکھا تھا

اختر حفیظ

کسی ریگستان سے اگر بارش روٹھ جائے تو برسوں تک وہاں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے' اور ریگستان میں پانی کے بنا زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تپتی ریت پر جینے والے یہ لوگ قحط کی صورت میں پانی والے علاقوں کا رخ کرتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے پالتو جانور بھی لے جاتے ہیں اور پھر جیسے ہی قدرت مہربان ہوتی ہے اور بادل برستے ہیں تو بے جان ریت میں گھاس اگتے ہی زندگی لوٹ آتی



ہے۔ درختوں کی شاخوں پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں پرندے چہچہاتے ہیں' ریت کے ٹیلے اور خالی میدان گھاس اور پودوں کی سبز چادر اوڑھ کر کئی آنکھوں کو اس بات کا پیغام دیتے ہیں کہ جانے والے لوٹ آئے ہیں۔ ضلع سانگھڑ کے علاقے 'اچھڑو تھر' (سفید تھر) کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اسے اچھڑو تھر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں کی ریت سفید رنگت کی ہے۔

یہاں ہر طرف ریت ہے مگر ریت کے ٹیلوں کے دامن میں چند ایسی بھی جھیلیں ہیں جہاں سے نمک نکلتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو ریتیلے میدان کی سطح سے ریت اس طرح اڑتی ہے جیسے کوئی سانپ رینگ رہا ہو۔ میں جس جھیل کی جانب گیا تھا' اسے نمک والی جھیل کہا جاتا ہے مگر اس کا نام ایک نمبر جھیل بھی ہے۔ یہ جھیل آٹھ ایکڑ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس جھیل میں قدم رکھتے ہی ایک عجیب سا احساس ہونے لگا۔ کہیں پانی تھا کہیں نمک کے ذرات' کہیں سخت فرش تو کہیں مخمل کی طرح نرمی محسوس ہوئی۔ دور سے ایسا لگا کہ سردیوں کی وجہ سے جھیل کا پانی برف بن کر جم گیا ہے۔ مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ جسے ہم برف سمجھ رہے تھے وہ نمک کی سخت سطح تھی ان ریت کے ٹیلوں کے دامن میں ایسی آٹھ جھیلیں ہیں جن سے نمک نکالا جاتا ہے وہی نمک جس کے بغیر ہمارے تمام لذیز کھانے ادھورے ہیں۔

میں جب جھیل میں اترا تو اس وقت مزدور اپنے کام میں معروف تھے کہیں نمک کھود کر نکالا جا رہا تھا کہیں اسے خشک کرنے کے لیے جمع کیا جا رہا تھا تو کہیں بوریوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ ایک جانب میرے چاروں اطراف ریت کے بڑے بڑے ٹیلے تھے جو جھیل میں نمک کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے' جن کی سفیدی آنکھوں کو بھا رہی تھی۔ نمک کی جھیل میں پاؤں رکھتے ہی مجھے اس بادشاہ کی وہ لوک داستان یاد آگئی جو اپنی سات بیٹیوں سے ان کے پیار کی آزمائش لیتا ہے۔

جب وہ سوال کرتا ہے کہ اس کی بیٹیاں اس سے کتنا پیار کرتی ہیں تو کوئی کہتی کہ بادشاہ شہد جتنا میٹھا ہے کوئی کہتی ہے کہ مصری جتنا میٹھا ہے تو کوئی یہ کہہ کر پیار کا اظہار کرتی ہے کہ بادشاہ گڑ جتنا میٹھا ہے مگر سب سے چھوٹی بیٹی اس سے کہتی ہے وہ نمک جتنا میٹھا ہے' جس کے بعد بادشاہ غصے میں آکر اسے محل بدر کر دیتا ہے۔ حالات کا مارا بادشاہ ایک دن اسی بیٹی کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ نمک جیسا میٹھا ہونے کا مطلب کیا ہے اور نمک کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ اسی لوک کہانی کو شیکسپیئر نے 'کنگ لیئر' کے نام سے لکھا جو کہ شیکسپیئر کے مقبول ترین ڈراموں میں سے ایک ہے۔



اچھڑو تھر میں پانی کی کئی جھیلیں اور بہاؤ ہیں مگر جہاں جہاں موسم ہے وہاں کی زمین نمک پیدا کرنے

میں کافی بہتر ہے۔ بارشیں پڑنے کے بعد یہ جھیلیں پانی سے بھر جاتی ہیں اور نمک کی سطح سے مل کر بارشوں کا پانی اور بھی زیادہ نمک پیدا کرتا ہے۔ ایک صحرا میں ایسی جھیل اور سورج کی کرنیں اس کا پانی جذب کرتی رہتی ہیں جس کے بعد پانی کو نمک بننے میں دیر نہیں لگتی۔

آچر کولی جھیل پر کام کرنے والا ایک ایسا مزدور ہے جسے بس اتنا پتہ ہے کہ اس کے مقدر میں بس نمک نکالنا اور نمک صاف کرنا ہے۔ پہلے پہلے وہاں پر میری ملاقات اسی سے ہی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں، ٹانگوں اور بازوؤں پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اگر میں اسے کھرچتا تو اس کے جسم سے شاید صرف نمک ہی نکلتا۔ میں نے جب اس کے پیروں کی جانب دیکھا تو مجھے چند سبز رنگ کے نشانات نظر آئے۔

"یہ آپ کے پیروں کو کیا ہوا ہے، کیا لگا رکھا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"صاحب یہ صمد بونڈ لگا ہے میرے پاؤں میں اسی جھیل میں کام کرتے کرتے زخم ہو جاتے ہیں تو میں صمد بونڈ لگا لیتا ہوں، کوئی اور چیز نمک میں ٹک نہیں سکتی، صمد بونڈ لگانے کے بعد پانی زخموں کے اندر نہیں جا سکتا اور پھر کام کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔" وہ سوال کا جواب دینے کے بعد مجھے جھیل کے اور اندر لے گیا۔

"مگر یہ تو کوئی علاج نہ ہوا، صمد بونڈ نہ تو کوئی دوا ہے اور نہ ہی مرہم۔"

"وہ آپ کے لیے نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک نمک مزدور کو یہاں دوا اور مرہم نہیں ملتے، بس ہم اپنے زخموں کو اس نمک والے پانی سے بچالیں یہی بہت ہے۔" وہ مجھے نمک کے ڈھیر کی جانب لے گیا جہاں اسے بوریوں میں بند کیا جا رہا تھا۔ آچر بچپن سے اس کام میں ہے، صبح 6 بجے سے شام کے 6 بجے تک وہ کام میں لگا رہتا ہے۔ وہ پھاوڑے سے نمک کی وجہ سے سخت بن جانے والے جھیل کے جسم کو کھودتا ہے اور اسے باریک کرتا ہے، اسے پانی سے صاف کرتا ہے اور پھر بوریوں میں بند کرتا ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی جب اس نے بتایا کہ اسے ایک بوری بھرنے کی اجرت صرف ڈیڑھ روپے ملتی ہے۔ ایک دن میں سو بوریاں بھرنے کے اسے ڈیڑھ سو روپے ملتے ہیں۔ میں نے جب اسے کہا کہ یہ تو بہت کم مزدوری ہے تو اس نے آنکھیں جھکالیں۔

"ہاں بہت کم ہے گزارا بھی نہیں ہوتا، مگر کیا کریں یہاں تو اتنا ہی ملتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پانی سے نمک صاف کرنے لگا۔

"اس سے بہتر نہیں کہ تم کوئی اور کام کرو جس میں کچھ پیسے زیادہ مل جائیں۔"

"کون سا اور کام؟ میرا باپ بھی اسی جھیل میں نمک صاف کرتا تھا، میں بھی یہیں نمک کھودتا ہوں، شاید میرے بیٹے کے حصے میں بھی یہی کام آئے گا، اپنی زندگی تو نمک ہوگئی ہے صاحب۔"

اس کی آنکھوں میں مایوسی ظاہر ہو رہی تھی اور آواز ہلکی ہوگئی۔ میرے چہار سو نمک ہی نمک تھا۔ مگر نمک تو آچر کی آنسوؤں کے پانی میں بھی ہوگا جو شاید اس نے میرے سامنے اس لیے نہیں بہائے تھے کہ وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

جھیل میں نمک کا کام سارا سال جاری رہتا ہے۔ یہ نمک سارے ملک میں بھیجا جاتا ہے جہاں اسے اور بھی بہتر کیا جاتا ہے مگر کوئی نمک کا ٹھیکیدار آچر جیسے مزدوروں کی اجرت بڑھانے کو تیار نہیں۔

آچر کا گھر بھی اسی جھیل کے کنارے ہے جہاں وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ گھر کیا ہے، ایک دو جھونپڑیاں، جہاں پینے کا پانی بھی میسر نہیں ہے، پانی

لانے کے لیے بھی انہیں ہرن کی طرح اس صحرا میں بھٹکنا پڑتا ہے۔

جھیل کی سطح کو غور سے دیکھنے کے بعد کسی مقام پر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سطح پر شریانیں ابھر آئی ہوں اور نمک ان شریانوں میں خون کی مانند بہہ رہا ہو۔

آچر مجھ سے بات چیت کرتے وقت بھی اپنے کام میں مصروف عمل تھا۔ میرے لیے نمک کی سخت سطح پر چلنا مشکل تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آچر کے زخم کیسے ہوں گے جن کے لیے کوئی مرہم بھی دستیاب نہیں ہے۔ اور جب اس جھیل میں کام کرنے والے مزدور کے پیروں میں زخم بن جائیں تو نمک والا پانی گوشت کو گلانے میں دیر نہیں کرتا۔

میں جب تک وہاں تھا ہر ایک کو اپنے کام میں مصروف دیکھا۔ ہر ایک کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر آج کام پورا نہ ہوا تو مزدوری نہیں ملے گی۔ آچر کولی کو بھی یہ فکر تھی کیونکہ پاس ہی اس کی جھونپڑی میں اس کے بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ نمک کی بوریاں تیار کرنے کے بعد انہیں ٹرکوں کے ذریعے ملک کے دیگر شہروں میں بھیجا جاتا ہے اور اسی طرح ایک دن کا کام تمام ہوتا ہے۔ دوسری صبح آچر جیسے کئی مزدور پھر نمک کی جھیل میں اتر کر نمک بن جاتے ہیں۔

اردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر نے افسانہ 'پانی کا درخت' شاید انہی نمک کے مزدوروں پر لکھا تھا جو نمک کا کام کرتے کرتے نمک بن جاتے ہیں۔ جس میں بانو کی محبت روتی ہے، کیونکہ محبت صرف نمک ہی نہیں تھوڑا سا میٹھا پانی بھی چاہتی ہے۔ ان مزدوروں کی زندگی کو دیکھ کر لگا کہ ان کی زندگی میں بس نمک کا ذائقہ ہی رہ گیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کی جھلک نظر نہیں آتی اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی بے بسی نے انہیں خوشیوں کے ذائقوں سے محروم



کر دیا ہے۔ میں جھیل کو دیکھتا رہا اور مجھے بس کرشن چندر کی کہانی کا ایک اقتباس یاد آنے لگا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

"میرے دل کے اندر نمک کے کتنے بڑے ڈلے اکٹھے ہوگئے تھے۔ میرے دل کے اندر نمک کی ایک پوری کان موجود تھی۔ نمک کی دیواریں، ستون، غار اور کھارے پانی کی ایک پوری جھیل۔ میرے دل و دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی جھلی چڑھ گئی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں اپنے جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنسو ڈھلک کر بہہ نکلیں گے اس لیے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔"

☆☆......☆☆

ان خاص لوگوں کی کہانیاں اور باتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

عظیم موسیقار

خواجہ خورشید انور

خواجہ صاحب کا علمی مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا

اے۔آئی۔رشیدی

سرزمین پنجاب نے یوں تو تمام شعبہ ہائے حیات ہی میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں انبساط بھی..... عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور پنجاب کے ایک معزز (کشمیری برادری)



لیکن فلم وفن میں اس خطہ زمین کی کنٹری بیوشن بلاریب وگمان قابل قدر بھی ہے اور باعث فخر و گھرانے کا یہ چشم وچراغ بھی برصغیر اور پھر خصوصاً پاکستانی فلمی صنعت کی ایک عظیم المرتبت اور

باکمال شخصیت کی حیثیت سے اپنی فنی عظمتوں کے ان مٹ نقوش چھوڑ کر اس جہان رنگ وبو سے رخصت ہوگیا۔

سنگیت سے تعلق رکھنے والے کسی گھرانوں میں اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک اصطلاح عطائی استعمال ہوتی ہے جو محض ذاتی لگن اور شوق پھر اپنی جہد مسلسل سے شہرت ومقبولیت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور اہل فن میں اپنا ایک مقام بنا کر واجب الاحترام ہوجاتے ہیں' نثار بزمی' حیدر رکھا جو اپنے استاد مکرم ماسٹر غلام حیدر سے ان کی گہری والہانہ عقیدت ومحبت کی ایک دلیل ہے' اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ فن کسی کی میراث نہیں ہوتا خواجہ خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین لاہور کے معروف وکیل تھے۔ پھر ان کے دو بھائیوں خواجہ سلطان اور خواجہ افضل کا شمار بھی شہر کے مقبول وکلاء میں ہوتا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں خواجہ خورشید انور اور فیض احمد فیض ہمعصر بھی تھے اور دوست بھی۔



سہیل رعنا' روبن گھوش کی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں' وادی مہران (سندھ) کے ایک اور سپوت سائیں فضل علی جاموٹ جو ایک معزز وڈیرا ہوتے ہوئے بھی فلمی دنیا میں محض اپنے شوق کی تکمیل کے لیے آئے اور ایس گل کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے لیکن موسیقی کے شوق نے انہیں ماسٹر غلام حیدر کے اتنا قریب کردیا کہ انہوں نے بحیثیت موسیقار اپنا نام ہی گل حیدر رکھ لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے بیٹے کا نام بھی فاروق عجیب سی بات ہے کہ خواجہ خورشید انور کا رجحان شعر وسخن کی طرف تھا اور فیض ساز وآواز کی دنیا میں گہری دلچسپی رکھتے تھے مگر ذات باری کی رضا ملاحظہ ہو کہ اول الذکر فلمی موسیقی کے افق پر درخشندہ ستارہ بن کر جگمگایا اور موخر الذکر عالم فکر وسخن کی ایک عظیم المرتبت اور عہد آفریں شخصیت بن گیا۔ خواجہ خورشید انور نے بھی پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ریڈیو لاہور میں پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا

آغاز کیا۔ ایک زمانے میں تین اہم شخصیات کرشن چندر، خورشید انور اور فیروز نظامی ریڈیو لاہور میں تھیں۔ خواجہ خورشید انور 1940ء میں فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے اور پہلی بار نشاط پروڈکشنز کے تحت بننے والی فلم 'کڑمائی' کی موسیقی ترتیب دی۔ فلم کے ہدایت کار جے کے نندہ تھے (رادھا رانی' واسطی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

1943ء میں ہدایت کار موصوف ہی کی ایک اور فلم 'اشارہ' کی موسیقی ترتیب دی (یہ فلم ڈی آر ڈی پروڈکشنز' نامی ادارے کے تحت بنی تھی) اشارہ میں سورن لتا' پرتھوی راج' ثریا' ستیش جگدیش سیٹھی' مسعود اور این سنگھ نے کام کیا تھا۔ ہدایت کار سہراب مودی نے سینٹرل اسٹوڈیوز کے لیے ایک فلم پرکھ ڈائریکٹ کی تھی جس میں مہتاب نے مرکزی کردار ادا کیا تھا دیگر اداکاروں میں شاہنواز' سوہنا سمرتھ' بلونت سنگھ' یعقوب اور صادق علی بھی شامل تھے۔ اس فلم کی موسیقی خاتون موسیقارہ سرسوتی دیوی اور خواجہ خورشید از نے مشترکہ طور پر مرتب کی تھی۔ (قارئین اسی کہانی کو یہاں پاکستان میں ہدایت کار حسن طارق نے 'شکوہ' نامی فلم کے نام سے پیش کیا تھا جس میں مہتاب والا مرکزی نوعیت کا رول مادام صبیحہ نے بڑی خوبصورتی اور انتہائی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ ادا کر کے داد و تحسین حاصل کی تھی اور پھر ریاض شاہد کے جاندار اور برجستہ مکالموں نے اس میں اور زیادہ حسن اور تاثر پیدا کر دیا تھا۔ حسن لطیف لک کی دھن پر ملکہ ترنم کا وہ نغمہ 'آج محفل سجانے کو آئی' لاجواب تھا۔

1946ء میں خواجہ صاحب نے دو فلموں 'نور عرب اور سلور کوئین (پنچولی فلمز) میں موسیقی دی جن کی ہدایات بالترتیب اے ایم خان اور راجہ یاگنک نے دی تھیں۔ 1947ء میں انہوں نے تین فلموں کی موسیقی دی چترا پروڈکشنز کی 'آج اور کل (ہدایت کار خواجہ احمد عباس)' پنچولی کی 'پگڈنڈی' (ہدایت کار رام نرائن دیو) اور جنیت پروڈکشنز کی 'پروانہ (ہدایت کار جے کے نندہ) سہگل اور ثریا کی اس فلم کے گیت بڑے مقبول ہوئے تھے۔

1949ء میں ہدایت کار موصوف (جے کے نندہ) ہی کی ایک فلم 'سنگھار' کی موسیقی ترتیب دی (یہ فلم ایچ نندہ پروڈکشنز نامی ادارے کے تحت بنی تھی) سنگھار میں بھی ان کی موسیقی عمدہ تھی۔ یہ فلم کراچی کے جوبلی سینما کی اسکرین پر دکھائی گئی تھی پچاس کی دہائی میں (غالباً 1952ء میں) چندر لیکھا فلمز نامی ادارے کی ایک فلم 'نیلم پری' نمائش پذیر ہوئی تھی جس کی موسیقی خورشید انور نے ہی ترتیب دی تھی۔ پچاس کی دہائی میں شاید ایک دو اور فلموں میں موسیقی دینے کے بعد 1955ء میں یہ لاہور چلے آئے۔ ہدایت کار وجاہت حسین چنگیزی کی 'نشانہ' اور ہدایت کار ضیا سرحدی کی فلم 'یتیم' کی موسیقی بھی خواجہ خورشید انور کی ترتیب دی ہوئی تھی۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد خواجہ خورشید انور سب سے پہلے ہدایت کار داؤد چاند کی فلم 'مرزا صاحباں (اردو) میں موسیقی دی۔ مرزا (سدھیر) کی بہن (یاسمین) پر فلمایا جانے والا نغمہ 'دیرن میرے داری میں تیرے...... بڑا مقبول ہوا تھا۔ 1956 میں سلیکٹ پکچرز کے تحت بننے والی مشہور و معروف نغمہ بار اور یادگار فلم 'انتظار' کی موسیقی دی۔ موسیقی ہی کی اہمیت اور افادیت کی بنیاد پر اس فلم کی کہانی بھی دراصل خود ان ہی کی تھی منظرنامے اور مکالمے مشہور ادیب اور ناول

نگار سید امتیاز علی تاج نے تحریر فرمائے تھے۔ ہدایت کار مسعود پرویز نے ہدایات دی تھیں بلاشبہ ملکہ ترنم نور جہاں (خصوصاً اندھی محبوبہ کے رول میں) سنتوش کمار (ڈبل رول میں) اور پھر سب سے بڑھ کر آشا پوسلے کی ویمپ کے کردار میں پرفارمنس اپنی اپنی جگہ لاجواب تھیں مگر 'انتظار' کی عظیم الشان کامیابی یقیناً اس کی دلکش اور سحر انگیز موسیقی ہی کی مرہون منت تھی تمام ہی گانے ہٹ بلکہ سپرہٹ تھے۔ جس دن سے پیا دل لے گئے 'او جانے والے ٹھہرو ذرا' آ بھی جا دیکھ آ کر ذرا' گھر آ گئے بالم پردیسی' چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار اور چھن چھن ناچوں کی گن گن گاؤں گی سبھی گیت ہمہ گیر شہرت و مقبولیت سے ہمکنار ہوئے اس کے بعد انہوں نے 'زہر عشق نامی فلم کا میوزک دیا وہ بھی عمدہ اور دلنواز تھا۔ رات چاندنی میں اکیلی اور پھر موہے پیا ملن کو جانے دے انتہائی عمدہ گیت تھے جو ناہید نیازی نے گائے تھے فلم کوئل میں ملکہ ترنم کی جادو بھری آواز اور خواجہ صاحب کے حسن کمال کا سنگم ہوا اور ان نغمات نے جنم لیا' دل کا دیا جلایا میں نے' ساگر روئے لہریں شور مچائیں' اور رم جھم رم جھم پڑے پھوار (نجمہ نیازی اور ملکہ ترنم کی آوازوں میں الگ الگ۔

فلم 'جھومر' میں خواجہ خورشید انور کا کمپوز کیا ہوا یہ نغمہ بھی بے حد مقبول ہوا جو فلم کی ہیروئن مسرت نذیر پر ناہید نیازی کی آواز میں فلم بند کیا گیا تھا اس کے بول تھے' چلی رے' چلی رے چلی رے میں تو دیس پیا کے چلی رے اپنی ہی تحریر کی ہوئی کہانی اور ڈائریکشن میں بننے والی فلم 'گھونگھٹ' مکمل طور پر ایک سپرہٹ میوزیکل فلم تھی اور اس کے حسین و دلنواز نغمے بھی خواجہ صاحب کے کمال فن اور ملکہ ترنم کی مسحور کن آواز کے اشتراک کا نتیجہ تھے۔ تنویر نقوی کے لکھے ہوئے تمام ہی گیتوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی تھی...... کبھی تم بھی ہم سے تھے آشنا ملکہ ترنم کا ایک اور نغمہ بے حد حسین اور دلکش تھا' کوئی نہ جانے کب آئے اس کے علاوہ مہدی حسن کی آواز میں اس فلم کا نغمہ 'مجھ کو آواز دو' بھی عمدہ ترین تھا...... خلیل قیصر کی فلم 'حویلی میں نسیم بیگم کے اس گیت نے تو دھوم مچا رکھی تھی۔ میرا بچھڑا بلم گھر آ گیا' میری پائل باجے چھنن چھنن' چنگاری اور ہمراز بھی ان کی اپنی ہی فلمیں تھیں جن کے مصنف و ہدایت کار وہ خود ہی تھے کہاں ہو تم سہیلیو (ملکہ ترنم کورس) اور مجھے ایسے پیا کا پیار ملا (مالا) ہمراز کے عمدہ ترین گیت تھے۔

1970ء میں ریلیز ہونے والی مسعود پرویز (فلم ساز اعجاز درانی) کی مشہور و معروف فلم 'ہیر رانجھا' میں ایک بار پھر خواجہ صاحب اور ملکہ ترنم کی فنی عظمتیں یکجا ہوئیں اور دلفریب یادگار اور انتہائی سحر انگیز نغمات تخلیق ہوئے ہیروئن یعنی فردوس پر فلمائے گئے تمام نغموں نے بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ چن ماہی آ تیری راہ پئی تک نی آں' ونجلی والڑیا' توں مولٹی اے ٹمیار' میں چھم چھم پیلاں پاواں (کورس اور پھر سب سے بڑھ کر) سن ونجھلی دی مٹھری تان وے میں تاں ہو ہو گئی قربان وے' مسعود رانا کی آواز میں رہا دیکھ لیا تیرا میں جہاں اور تیری خیر ہووے زلفاں دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں ڈھولنا کے علاوہ تو چور میں تیری چورنی بلو چا ہانیاں (سہتی یعنی زمرد پر فلمایا جانے والا نغمہ) بھی عمدہ گیت تھا۔

ہدایت کار لقمان کی ایک فلم 'ایاز' میں خواجہ صاحب کی (زبیدہ خانم اور دیگر ساتھیوں کی آواز

میں) کمپوز کی ہوئی صلو علیہ وآلہ کس قدر روح پرور نعت ہے اور ہماری محافل میلاد اور اس قسم کی

تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں) اور اپنے حلقہ احباب کی مناسبت سے خواجہ صاحب کا علمی

دیگر مذہبی تقریبات کی شان' عظمت اور تقدس کو دوبالا کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں دی گئی فلموں کے علاوہ خواجہ صاحب نے 'سرحد' پرائی آگ' سلام محبت' شیریں فرہاد' حیدر علی' گڈو اور مرزا جٹ (دوسری بار بننے والی مسعود پرویز کی) نامی فلموں میں بھی موسیقی ترتیب دی۔ جہاں تک ایوارڈ کا تعلق ہے (انہوں نے انتظار پر صدارتی ایوارڈ 1956ء میں بحیثیت بہترین موسیقار بھی حاصل کیا تھا) انہوں نے 1958ء میں 'زہر عشق' 1962ء میں گھونگھٹ اور 1970ء میں ہیر رانجھا پر بہترین موسیقار کے نگار ایوارڈز حاصل کیے۔ عطائی ہو کر یہ صاحب کمال موسیقار اس قدر حسین و دلکش نغموں کی سوغات دے کر 30 اکتوبر 1984ء میں اس جہان رنگ و بو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا پروردگار ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

اپنے دور کے مخصوص حالات (سیاسی' سماجی'

مطالعہ اور پھر مشاہدہ بہت وسیع تھا اور زمانہ طالب علمی میں انہیں فکر و فن سے بھی گہری دلچسپی رہی۔

☆☆......☆☆

بدیسی کہانی

دنیا کی مختلف زبانوں سے ترجمہ کی گئی کہانیاں

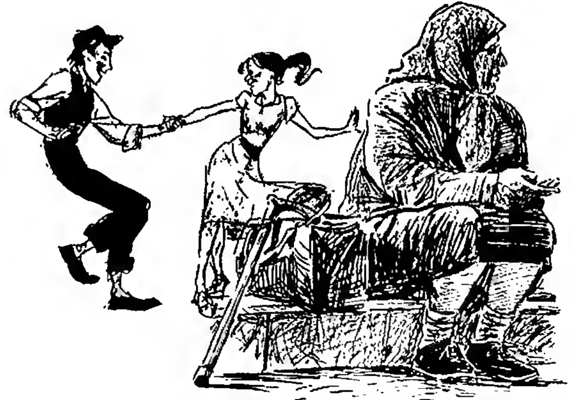
موم اور محبت

W SOMERSE MAUGHAM

انگریزی سے ترجمہ: سید ضمیر شاہ

ڈیوڑھی میں بحث وتکرار کی آوازیں سن کر دو تین آدمی اپنے کمروں سے باہر آ گئے۔

''نئی کرایہ دار اپنا سامان لانے والے قلی سے لڑ رہی ہے۔'' ایک عورت نے کہا۔



لامیکرنا کے عقبی بازار میں یہ دو منزلہ رہائشی بلڈنگ واقع تھی۔ اس علاقے کا شمار شہر سوائل کی سب سے زیادہ گندی بستیوں میں ہوتا تھا۔ مزدور، پولیس کانسٹیبل، پوسٹ مین، ٹرام ڈرائیور کی قسم کے لوگ جن سے اسپین بھرا پڑا ہے، یہاں کرائے داروں کی حیثیت سے مقیم تھے اور ان کے میلے کچیلے بچے تمام دن گلی میں شور مچاتے رہتے۔ بلڈنگ میں تقریباً بیس خاندان آباد تھے۔ یہ لوگ معمولی سی بات پر آپس میں لڑ پڑتے اور تھوڑے دنوں بعد پھر شیر و شکر ہو جاتے۔ فرصت کے اوقات میں ان کی گپوں سے فضا گونج اٹھتی۔ سادہ لوح لوگوں کی طرح یہ ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے، غرضیکہ ان کی زندگی مجموعی طور پر بہت سکون اور دل جمعی سے بسر ہو رہی تھی۔

بلڈنگ کا ایک کمرہ کچھ مدت سے خالی پڑا تھا لیکن آج صبح ایک عورت نے اس کو کرائے پر لے لیا تھا اور ایک گھنٹے بعد ہی وہ اپنے سامان سے لدی پھندی آ پہنچی۔ اس کے پیچھے ایک قلی بقیہ سامان اٹھائے آ رہا تھا۔

قلی اور عورت میں جھگڑا طول پکڑتا جا رہا تھا اور دونوں عورتیں جو پہلی منزل سے تکرار سن رہی تھیں، نسوانی فطرت کے مطابق اس جھگڑے کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے برآمدے پر جھک گئیں۔ نووارد اپنی تیز و تند آواز میں گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی اور قلی بھی گاہے گاہے اسے سخت سست کہہ رہا تھا۔ دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو کہنی ماری۔

''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گا جب تک تم میری پوری مزدوری نہ چکاؤ گی۔'' وہ متواتر کہے جا رہا تھا۔

''میں تو پوری مزدوری پہلے ہی دے چکی ہوں، تجھ سے تین یورو طے ہوئے تھے اور وہ میں نے دے دیے ہیں۔''

''بالکل جھوٹ، میں نے پانچ یورو طے کیے تھے۔''

وہ رقم کے تنازعہ پر بہت دیر سے لڑ رہے تھے۔

''پانچ یورو؟ اور ان چیزوں کو اٹھانے کے لیے، کیا تیرا دماغ پھر گیا ہے۔'' عورت نے اسے دھکا دے کر ہٹانے کی کوشش کی۔

''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گا جب تک میری پوری مزدوری نہ چکاؤ گی۔''

''میں زیادہ سے زیادہ تجھے چار یورو اور دے سکتی ہوں۔''

شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ عورت بری طرح چلا رہی تھی اور مغلظات سنا رہی تھی۔ بالآخر قلی ہی کو دبنا پڑا۔

''اچھا بابا! تم چار یورو ہی دو، میں تم جیسی ذلیل عورت سے بحث کر کے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

اس عورت نے قلی کو ایک پنس دے دیا اور وہ اس کا سامان پٹخ کر بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ عورت نے ایک فحش گالی بکی اور چیزیں گھسیٹ کر کمرے میں لے جانے کے لیے پیچھے مڑی، اس وقت دونوں عورتوں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا۔

''اُف خدایا! کتنا بھیانک چہرہ ہے؟ مجھے تو بالکل قاتل معلوم ہوتی ہے۔'' ایک لڑکی اسی وقت اوپر آئی اور اس کی ماں نے آواز دی۔

''روزالیا! کیا تم نے اُسے دیکھا؟''

''میں نے ابھی قلی سے پوچھا تھا کہ یہ عورت کہاں سے آ رہی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ اس

کا سامان 'ٹریانا' سے لارہا ہے۔ اس مکار عورت نے بے چارے سے چار روبل کا وعدہ کیا تھا لیکن صرف تین روبل دیے۔''

''قلی نے اس کا نام بتایا؟''

''اسے معلوم نہیں' لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ ٹریانا میں یہ لاکچیرا کے نام سے مشہور تھی۔''

دریں اثناء وہ اپنا منحوس چہرہ اٹھائے سامنے آئی۔ اس نے بالکونی میں کھڑی عورتوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور اپنا ایک بنڈل اُٹھا کر جو باہر بھول گئی تھی' خاموشی سے کمرے میں گھس گئی۔

''اُس کی شکل دیکھ کر مجھے کپکپی ہونے لگتی ہے۔'' روزالیا نے سہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لاکچیرا چالیس سال کے پیٹے میں ہوگی۔ وحشت زدہ صورت' بانس کی طرح سوکھا مریل جسم' استخوانی ہاتھ اور انگلیاں تو بالکل گدھ کے پنجوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور اس کا جھریوں بھرا زرد جسم دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو۔ جب وہ اپنے موٹے موٹے زرد ہونٹ کھول کر کسی سے بات کرتی تو اس کے نوکیلے دانت کسی خون خوار درندے کے دانتوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بال سیاہ اور کھردرے تھے جن کو وہ عجیب وضع سے باندھے رکھتی تھی۔ بالوں کی دو لٹیں اس کے کانوں پر لٹکی رہتی تھیں' بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جو بہت مضبوطی سے حلقوں میں جڑی معلوم ہوتی تھیں' ایک عجیب قسم کی ڈراؤنی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر اس غضب کی ہیبت نظر آتی کہ کسی کو اس سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس کی دنیا اپنی ذات تک محدود تھی۔

بلڈنگ کے کرایہ داروں کا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ انتہائی مفلوک الحال ہے' اس کے بوسیدہ کپڑے اس کی غمازی کرتے تھے۔ وہ روزانہ صبح چھ بجے باہر چلی جاتی اور رات گئے لوٹتی۔ اس کا ذریعہ معاش سب کے لیے ایک چیستاں بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بار پولیس کانسٹیبل سے جو اس مکان میں رہتا تھا' اس عجیب وغریب عورت کے متعلق تحقیقات کرنے کو کہا لیکن اس نے جواب دیا کہ جب تک وہ قانون کی حدود میں رہتی ہے اس وقت تک مجھے کسی قسم کی تحقیقات کرنے کا حق نہیں۔ لیکن سوائل میں افواہیں بہت تیزی سے گشت کرتی ہیں اور چند ہی روز میں ایک معمار نے جو مکان کے بالائی کمرے میں مقیم تھا' تمام گھر والوں کو بتایا کہ اس کا ایک دوست جو ٹریانا میں رہتا ہے' اس بوڑھی عورت کی گزشتہ زندگی سے واقف ہے' لاکچیرا صرف ایک ماہ قبل رہا ہوئی ہے' وہ سات سال تک جیل کی چار دیواری میں بند رہی تھی اور اس کا جرم تھا...... قتل......

رہائی کے بعد اس نے ٹریانا میں ایک مکان کرائے پر لے لیا لیکن اس کی زندگی کا بھیانک راز جلد ہی طشت از بام ہوگیا۔ اسے دیکھتے ہی شہر کے بچے آوازے کستے اور پتھر پھینکتے۔ وہ غصے میں لال پیلی ہو کر انہیں مارتی۔ یہ باتیں اتنی مدت تک متواتر جاری رہیں کہ تمام شہر میں اضطراب پھیل گیا اور مجبور ہو کر مالکِ مکان نے اسے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ لاکچیرا نے مالکِ مکان اور تمام لوگوں کو جنہوں نے اسے نکالا تھا' دل کھول کر گالیاں دیں اور ایک دن اچانک شہر سے غائب ہوگئی۔

''لیکن اس نے کس کا خون کیا تھا؟'' روزالیا نے پوچھا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ مقتول اس کا عاشق تھا۔'' معمار نے جواب دیا۔

''کوئی شخص اس سے محبت نہیں کرسکتا۔'' روزالیا نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

''توبہ......'' روزالیا کی ماں بولی۔

''میں نے تو پہلے دن دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کوئی قاتل معلوم ہوتی ہے' خدا ہم سب کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔''

روزالیا نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان کھینچا۔ اسی لمحے لاکچیرا اندر داخل ہوئی اور تمام حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک دوسرے کی طرف کھسکنے لگے اور ان کی متوحش نگاہیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ لاکچیرا ان کی اچانک خاموشی سے ٹھٹک گئی اور اس نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

پولیس کانسٹیبل نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے اسے سلام کیا۔ اس نے ترش روئی سے سلام کا جواب دیا اور جلدی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا۔

دروازے کے مقفل ہونے کی آواز فضا کے سکوت میں گونجی۔ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ ان منحوس تند و تیز آنکھوں نے سب پر عجیب سی کیفیت طاری کردی تھی اور وہ اس طرح سرگوشی میں بول رہے تھے جیسے کسی بدروح نے انہیں مسحور کردیا ہو۔

''اس کی آنکھوں میں شیطانیت رقص کرتی معلوم ہوتی ہے۔'' روزالیا نے کہا۔

''مینول! خدا کا شکر ہے کہ تم ہماری حفاظت کے لیے یہاں موجود ہو۔'' اس کی ماں نے پولیس کانسٹیبل سے کہا

لیکن لاکچیرا نے کسی شخص کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ الگ تھلگ رہتی اور کسی سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہتی اور اگر کسی شخص نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے سختی سے جھڑک دیتی۔ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے ہمسائے اس کا راز...... قتل کی واردات اور قید و بند کی طویل مدت کے متعلق سب کچھ جان گئے ہیں اور اس احساس کے ساتھ اس کے چہرے پر درشتی کے نقوش گہرے ہوتے گئے اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھتی گئی۔

رفتہ رفتہ شک و شبہ کا غبار جو اس کی خوفناک ہیبت اور دہشت ناک ماضی کی وجہ سے اس کی ہستی کے گرد چھایا ہوا تھا' چھٹتا گیا حتیٰ کہ روزالیا کی باتونی ماں نے بھی لاکچیرا کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔

''میرا خیال ہے جیل خانے کے ماحول نے اسے پاگل کردیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کا بھیانک ماحول اکثر انسان کا دماغ ماؤف کردیتا ہے۔'' اس نے کہا۔

دن گزرتے گئے اور اضطراب و استعجاب کی دھند آہستہ آہستہ صاف ہوتی گئی لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ چہ میگوئیاں از سرِ نو شروع ہوگئیں۔ روزالیا کی ماں ڈیوڑھی میں بیٹھی اسکرٹ سی رہی تھی کہ ایک نوجوان نے دروازے پر آکر کہا۔

''کیا انٹونیا سیچیز یہیں رہتی ہیں؟''

روزالیا کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو اس نام کی کوئی عورت نہیں رہتی۔''

''نہیں' وہ یہیں رہتی ہے۔'' نوجوان نے کہا

اور قدرے توقف کے بعد بولا۔

’’شاید وہ انہیں لاکیرا کے نام سے جانتے ہیں۔‘‘

’’ارے......‘‘ روزالیا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

’’وہ وہاں رہتی ہیں۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

روزالیا تیکھے خوب صورت نقوش کی دل فریب لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگ اور آنکھیں بے حد خوبصورت اور بے باک، بالوں میں لگے سرخ پھول سے اس کی زلفوں کی چمک دار سیاہ رنگت نکھر رہی تھی۔

’’خوش قسمت ہے وہ ماں جس نے تمہیں جنم دیا۔‘‘ نوجوان نے اسپینی زبان کا روز مرہ فقرہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

’’خدا تمہاری مدد کرے۔‘‘ روزالیا کی ماں نے دعا دی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا اور دروازے پر دستک دی۔ دونوں عورتیں متعجب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

’’یہ کون ہوسکتا ہے؟‘‘ روزالیا کی ماں نے کہا۔

’’آج تک تو کوئی شخص لاکیرا سے ملنے نہیں آیا۔‘‘

اس کی دستک پر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لاکیرا کی کرخت آواز گونجی۔

’’کون ہے؟‘‘

’’موم......!‘‘ وہ چلایا۔

’’موم......‘‘ اندر سے خوشی کی چیخ گونج اٹھی اور دروازہ زور سے کھل گیا۔

’’کریٹو......‘‘

بوڑھی عورت نے والہانہ انداز میں اپنے بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر دیے اور بے تحاشا پیار کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے سینے سے چمٹی دونوں ہاتھوں سے پیار بھرے انداز میں اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔ روزالیا اور اس کی ماں دونوں تصویرِ حیرت بنی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس مکروہ شکل عورت کا دل اتنا خوب صورت اور محبت کے نور سے معمور ہوسکتا ہے۔ اپنے بیٹے کو خوب پیار کرنے کے بعد وہ فرطِ مسرت سے ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتی اسے کمرے میں لے گئی۔

’’تو یہ اس کا لڑکا ہے۔‘‘ روزالیا نے حیرت سے کہا۔

’’بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ اتنا خوب صورت اور وجیہہ نوجوان اس کا بیٹا ہوسکتا ہے؟‘‘

کریٹو کے جسم پر اس کا حلیم چہرہ اور سفید موزوں دانت بہت نمایاں تھے۔ اس کے بال کنپٹیوں سے کٹے اور خالص ہسپانوی انداز میں سر پر جمے تھے۔ اس کی نوخیز داڑھی، گندمی جلد پر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ حقیقتاً وہ بہت وجیہہ آدمی تھا۔ ہر ہسپانوی کی طرح اسے بھی اچھے کپڑوں کا شوق تھا۔ اس کی چست پتلون، چھوٹا سا جیکٹ، جھالر دار قمیض اور چوڑے پٹکے کی ہیئت اس کے سڈول بدن پر جچ رہی تھی۔

آخر کار لاکیرا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ فرطِ محبت سے اپنے بیٹے کے بازو کا سہارا لیے باہر نکلی۔

’’تم اگلے اتوار کو پھر آؤ گے نا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’یقیناً بشرطیکہ کوئی دشواری پیش نہ آئی۔‘‘

اس نے روزالیا پر بھرپور نظر ڈالی اور اپنی ماں کو سلام کر کے روزالیا کی طرف بھی سر خم کیا۔ روزالیا نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ ریشمی پلکوں کی جھالر کے پیچھے، اس کی خوب صورت سیاہ آنکھیں مسرت سے ناچتی ہوئی اٹھیں اور اس نے کریٹو کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ لاکیرا نے ان نگاہوں کے پیغام کو پڑھ لیا۔ کرختگی کی لہریں جو اپنے بیٹے سے ملاقات کی وجہ سے عارضی طور پر دب گئی تھیں۔ ایک بار پھر ابھر آئیں۔ اس کے چہرے پر نفرت و حقارت کے آثار پیدا ہوگئے اور اس نے خوفناک نظروں سے روزالیا کو گھورا۔

’’کیا وہ تمہارا لڑکا تھا؟‘‘ روزالیا کی ماں نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔

’’ہاں وہ میرا لڑکا تھا۔‘‘ لاکیرا نے سختی سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔

دنیا کی کوئی چیز اس کے دل میں نرمی پیدا نہیں کرسکتی تھی اور اس مسرت انگیز لمحے میں بھی، جب اس کا پژمردہ دل اپنے کڑیل جوان بیٹے سے ملنے کی خوشی میں کھل اٹھا تھا اس نے دوستی کا ہاتھ درشتی سے جھٹک دیا۔

لاکیرا کو اپنے بیٹے سے دلی محبت تھی۔ دنیا میں وہی اس کے لیے سب کچھ تھا اور وہ اسے اس بے پناہ جذبے سے چاہتی تھی کہ اس کی محبت کا جواب اس شدت سے دینا انسان کے بس سے باہر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا بھی دنیا میں صرف اسی کو اپنا سب کچھ خیال کرے۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا لاکیرا اکثر سوچتی کہ اس سے دور رہ کر وہ کیا کرتا ہوگا؟ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ اس کا بیٹا کسی اور عورت کی طرف دیکھے اور صرف اس تصور سے ہی کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کر رہا ہوگا، اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ سوائل کے باشندوں کی سب سے دلچسپ تفریح یہ ہے کہ دوشیزائیں، آدھی آدھی رات تک کھڑکیوں یا دروازوں پر کھڑی اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہیں جو گلیوں میں گھومتے ہوئے ان کے کانوں میں اپنی مدھ بھری آواز کا رس گھولتے ہیں۔ لاکیرا نے ایک دو بار اپنے بیٹے سے اس کے رومانسوں کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے ہر بار قسم کھا کر کہا کہ وہ ان جھگڑوں میں پڑنا پسند نہیں کرتا، بلکہ شام کے وقت کام کاج میں مصروف رہتا ہے۔ لاکیرا جانتی تھی کہ وہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ اس جیسا وجیہہ نوجوان نہ جانے کتنی حسین لڑکیوں کے خوابوں میں بستا ہوگا لیکن اس کے باوجود یہ انکار سن کر وہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتی اور اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

جب اس نے روزالیا کی محبت پاش نگاہیں اور کریٹو کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھی تو اسے غصے سے اپنا سانس گھٹتا محسوس ہوا۔ اسے شروع سے اپنے ہمسائیوں سے نفرت تھی کیونکہ وقت نے ان کی قسمت میں کامرانیاں اور شادمانیاں، لیکن اس کی جھولی میں ناکامیاں، محرومیاں اور بدنصیبیاں ڈالی تھیں اور جب سے وہ اس کے خوف ناک راز سے واقف ہوگئے تھے، نفرت کی یہ خلیج وسیع تر ہوگئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں کوئی نقارے بجا بجا کر کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ اس کے اکلوتے بیٹے کو اس سے چھین لینے کی سازش کر رہے ہیں۔ اگلے اتوار کو سہ پہر کے وقت لاکیرا اپنے کمرے سے

باہر نکلی اور ڈیوڑھی سے نکل کر دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ بات اتنی خلافِ معمول تھی کہ دوسرے کرایہ دار اس پر تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔

''تمہیں معلوم ہے آج وہ دروازے پر کیوں کھڑی ہے؟'' روزالیا نے گھٹی ہوئی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کا بے مثال لختِ جگر آج اس مکان کو زینت بخش رہا ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ ہم اس کے دیدار سے مشرف ہوں۔''

''بے وقوف عورت! کیا اس کا خیال ہے کہ ہم اس کے لڑکے کو کھا جائیں گے؟'' کریٹو کے آتے ہی وہ اسے تیزی سے اپنے کمرے میں لے گئی۔

''بڑھیا اس کی حفاظت اس طرح کرتی ہے جیسے وہ اس کا عاشق ہی ہو۔'' روزالیا کی ماں نے کہا۔

روزالیا نے ہنستے ہوئے بند دروازے کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت کی پریاں ناچ اٹھیں۔

''اگر آج کریٹو کے ساتھ گفتگو ہو جائے تو کیسا رہے؟'' اس نے سوچا اور پھر لاکچیرا کے غصے کا تصور کر کے اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

وہ خاموشی سے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی تاکہ جب وہ دونوں باہر آئیں تو اس کے پاس سے ہو کر گزریں لیکن کمرے سے باہر نکلتے ہی جب لاکچیرا نے اسے وہاں کھڑے دیکھا تو اپنے بیٹے کے پہلو میں آ کر کھڑی ہوگئی تاکہ وہ روزالیا کو دیکھ بھی نہ سکے اور روزالیا کی اسکیم ناکام ہوگئی۔

''اچھا.....'' روزالیا نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا

''تم مجھے اتنی آسانی سے شکست نہ دے سکو گی۔''

اگلے اتوار جب لاکچیرا دروازے پر آ کر براجمان ہوگئی تو روزالیا باہر سڑک پر چلی گئی اور اسی سمت میں گھومتی ہوئی چل دی جس طرف سے کریٹو کے آنے کی توقع تھی۔ ذرا دیر بعد ہی وہ آتا دکھائی دیا لیکن وہ آگے چلتی رہی اور عمداً اسے نظر انداز کرتی رہی۔

''ہیلو.....'' اس نے رکتے ہوئے کہا۔

''اوہو آپ ہیں؟ میں نے سوچا کہ شاید آپ مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈریں گے۔''

''میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

''اپنی امی کے علاوہ؟'' اور یہ کہہ کر وہ آگے چل دی' جیسے وہ اس سے بات کرنا نہ چاہتی ہو لیکن ہر عورت کی طرح وہ مرد کی کمزوری سے واقف تھی۔ اسے بہ خوبی علم تھا کہ وہ ضرور اس کے پیچھے آئے گا۔

''ارے تم کہاں چل دیں؟''

روزالیا کی توقع پوری ہو رہی تھی۔

''آپ کو اس سے کیا؟ سعادت مند بیٹے! فوراً اپنی والدہ ماجدہ کے پاس چلے جائیے ورنہ وہ آپ کو ماریں گی۔ جب آپ ان کے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔''

''کیا اول فول بک رہی ہو؟''

''بس خدا حافظ مجھے ضروری کام ہے۔'' اور وہ آگے بڑھ گئی۔

کریٹو دبے دبے قدم رکھتا آگے چلا گیا اور روزالیا دل میں ہنستی سیدھی چلتی رہی۔

شام کو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ باہر نکلنے لگا

تو روزالیا پھر ڈیوڑھی میں موجود تھی اس بار ندامت مٹانے کے لیے اس نے جرأت کر کے روزالیا کو شب بخیر کہا۔ لاکچیرا کا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''کریٹو' جلدی آؤ۔'' وہ جھنجھناتی آواز میں چلائی۔

''تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟''

وہ چلا گیا۔ لاکچیرا ایک لمحے کے لیے روزالیا کے سامنے رُکی جیسے وہ کچھ کہنے والی ہو لیکن پھر اس نے اپنے پر قابو پالیا اور خاموشی سے اپنے سنسان تاریک کمرے میں چلی گئی۔

چند روز بعد سینٹ اسیڈور کا میلہ تھا اور اس خوشی میں معمار اور دو تین آدمیوں نے ڈیوڑھی میں چینی قندیلوں کا ایک فانوس لگایا۔ موسم سرما کی سہانی رات میں قندیلیں آب و تاب سے چمک رہی تھیں اور چمکتے نقرئی ستارے آسمان پر موتیوں کی طرح لگے معلوم ہوتے تھے۔ گھر کے لوگ' ڈیوڑھی کے وسط میں' کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ عورتیں چھوٹے چھوٹے کاغذی پنکھے جھلتے ہوئے آس پاس کی افواہوں پر تبصرے کر رہی تھیں' کبھی کبھی کسی بچے کی شرارت اس مسلسل گفتگو میں رخنہ ڈال دیتی اور اس کی ماں بے تحاشا صلواتیں سنانی شروع کر دیتی۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو چھاتیوں سے لگائے دودھ پلا رہی تھیں۔ دن بھر کی سخت گرمی اور حبس کے بعد خنک رات بے حد خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ جن لوگوں نے صبح سانڈوں کی لڑائی کا تماشا دیکھا تھا وہ فخریہ انداز میں دوسروں کو اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات بتا رہے تھے۔ ان کی خیال آرائیوں سے موضوعات کی دلچسپی' رنگینی' اور تنوع میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور رات بھاگتی جا رہی تھی۔

لاکچیرا کے علاوہ تمام لوگ موجود تھے لیکن اس کے سنسان آسیب زدہ کمرے میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔

''اور اس کا لڑکا کہاں ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''وہ اندر ہی ہے۔'' روزالیا کی ماں نے کہا۔

''میں نے ایک گھنٹے پہلے اسے جاتے دیکھا تھا۔''

''وہ بہت خوش ہو رہا ہوگا؟'' روزالیا نے ہنس کر کہا۔

''اچھا روزالیا' اب لاکچیرا کا قصہ دفع کرو۔'' ایک عورت نے کہا۔

''ہم سب تمہارے رقص کے منتظر ہیں۔''

''ہاں ہاں۔'' سب چلائے۔

''روزالیا اٹھو۔''

اسپین کے لوگوں کو رقص کرنے اور دیکھنے سے والہانہ اُنس ہے۔ بہت مدت ہوئی کسی نے کہا تھا کہ اسپین کی ہر عورت رقاصہ ہوتی ہے۔ لوگوں نے جلدی جلدی کرسیوں کو دائرے کی شکل میں رکھ لیا۔ معمار اور ٹرام کنڈیکٹر اپنے گٹار اٹھا لائے۔ روزالیا نے اپنے پاؤں میں پائل باندھی اور ایک لڑکی کو ساتھ لے کر رقص شروع کر دیا۔

موسیقی کی آواز سن کر کریٹو کے کان کھڑے ہوگئے۔

''لوگ رقص کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور اس کے روئیں روئیں میں باہر جا کر رقص کرنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اس نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ چینی قندیلوں کی ٹھنڈی روشنی میں لوگ کرسیاں ڈالے بیٹھے ہیں اور دو لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔

روزالیا اتوار کا خاص لباس پہنے ہوئے تھی

اوراس کے چہرے پر عام دستور کے مطابق خوب پاؤڈر لگا ہوا تھا۔ گلاب کا ایک پیارا سا سرخ پھول اس کے سر کے بالوں میں تاج کی طرح چمک رہا تھا۔ کریٹو کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اسپین میں محبت کے مشکل مدراج جلد طے ہوجاتے ہیں اور جس روز سے کریٹو نے خوب صورت چہرے اور گداز بدن والی اس نوجوان لڑکی سے گفتگو کی تھی' وہ اکثر اس کے تصور میں کھوجاتا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''تم کہاں جارہے ہو؟'' لاکچیرا نے کہا۔

''میں ان کا رقص دیکھنے جارہا ہوں...... کیا تم چاہتی ہو کہ میں دنیا کی کسی تفریح میں شریک نہ ہوں۔''

''تم رقص نہیں روزالیا کو دیکھنے جارہے ہو۔'' لاکچیرا نے اسے روکنے کی کوشش کی' لیکن کریٹو نے اسے پرے دھکیل دیا اور لوگوں میں بیٹھ کر رقص سے لطف اندوز ہونے لگا۔ لاکچیرا لڑکھڑاتی ہوئی ایک دو قدم چلی اور پھر ساکت و صامت کھڑی ہوگئی۔ اس کے وحشت ناک چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلارہے تھے اور اس کے دل کی گہرائیوں میں غصے کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

رات شباب پر تھی' رقص شباب پر تھا اور روزالیا کا زہد شکن شباب کریٹو کو مسحور کررہا تھا۔ روزالیا کی نگاہ اس پر پڑی۔

''کیا آپ کو میری طرف دیکھتے ہوئے ڈر نہیں لگ رہا؟'' اس نے ایک بار کریٹو کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

رقص نے اس کے دل و دماغ کو روئی کے گالے کی طرح ہلکا کردیا تھا اور اسے لاکچیرا کا رتی بھر خوف نہیں رہا تھا۔ رقص ختم ہوگیا اور روزالیا سیدھی کریٹو کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کا سر پیچھے کی طرف جھکا اور تنفس کی تیزی سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''آپ کو تو ناچنا نہیں آتا ہوگا؟'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں' میں جانتا ہوں۔''

''تو پھر آیئے۔'' اس نے دل فریب انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دعوت دی۔ کریٹو نے اٹھنا چاہا لیکن ہچکچا کر بیٹھ گیا۔ اس نے تاریکی میں غور سے گھورا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کی موم کا ہیولا ابھی تک تاریکی میں موجود ہے۔

روزالیا اس کا مفہوم سمجھ گئی۔

''کیا آپ کو ابھی تک ڈر لگ رہا ہے؟''

''مجھے کس سے ڈر لگے گا؟'' اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ رقص گاہ میں داخل ہوگیا۔

گٹار جھنجلا اٹھے۔ تماشائیوں نے موسیقی کی تان کے ساتھ تالیاں بجائیں اور ڈیوڑھی 'اولے اولے' کے پُرجوش نعروں سے گونج اٹھی۔ ایک لڑکی نے کریٹو کو گھنگھروؤں کا جوڑا دیا اور جوڑے نے ناچنا شروع کردیا۔ اچانک انہوں نے 'سی' کی ایک آواز سنی جیسے کوئی سانپ تاریکی میں پھنکاریں مار رہا ہو۔ روزالیا نے بے نیازی سے ہنس کر اس ہنستے ہوئے سفید چہرے کو دیکھا جو تاریکی کے سائے میں خبیث روح کی طرح جھلک رہا تھا۔ لاکچیرا اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ وہ رقص کرنے والوں کی حرکات و سکنات دیکھتی رہی۔ جسموں کی مدہوشی کے عالم میں جھولتے اور قدموں کو ایک خاص انداز سے اٹھتے دیکھتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ روزالیا ایک خاص ادا سے پیچھے ہٹتی اور مسکراتی آنکھوں سے کریٹو کو دیکھتی۔

لاکچیرا کی آنکھیں جلتے کوئلے کی طرح دہکنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آج وہ حلقوں میں جل کر بھسم ہوجائیں گی۔ اس کے دل میں غصہ و انتقام کی آگ سلگ رہی تھی لیکن کسی نے اس آگ کو' اس تپش کو نہ دیکھا۔ اس نے غصے میں آہ بھری۔ رقص ختم ہوگیا اور فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ روزالیا نے مسکراتے ہوئے کریٹو کو اس کے شان دار رقص پر مبارکباد دی اور اس کی مدھ بھری آنکھوں میں ایک خاص چمک کوند گئی۔

رقص ختم ہوتے ہی لاکچیرا اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ جب کریٹو نے دروازے پر دستک دی تو وہ خاموش پڑی رہی اور اس کی متواتر درخواستوں پر بھی دروازہ نہ کھولا۔

''اچھا پھر میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

درد اور یاس کی شدت سے لاکچیرا کا سر پھٹا جارہا تھا۔ اس کے دماغ میں لاوا سا ابل رہا تھا اس کے غم زدہ بدنصیب دل میں ہوک اٹھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دروازہ کھول دے لیکن وہ خاموش پڑی رہی۔ اس وسیع و عریض دنیا میں کریٹو ہی اس کا واحد اثاثہ تھا' دنیا میں صرف وہی ایک ہستی تھی جسے دیکھ کر اس کے پژمردہ سخت دل میں محبت اور ماتا کے لطیف جذبات بیدار ہوجاتے تھے لیکن اس کے باوجود اب اسے اپنے بیٹے سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتی اور نیم دیوانگی کے عالم میں سوچتی رہی کہ یہ سب لوگ مل کر کیوں اس کے بیٹے کو چھین لینے کی سازش کررہے ہیں۔ صبح وہ کام پر نہیں گئی بلکہ روزالیا کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ کافی دیر بعد روزالیا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس کے کپڑے مسلے ہوئے تھے اور رات کے رقص کا خمار اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے بن کر ناچ رہا تھا۔ لاکچیرا اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔

''تم میرے بیٹے سے کیا چاہتی ہو؟'' اس کی غیر متوقع آمد اور گفتگو سے روزالیا چند لمحوں کے لیے ششدر ہوگئی لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور چہرے پر حیرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟''

لاکچیرا کے جسم میں غصے کی شدید لہر دوڑ گئی اور اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ کاٹ کھایا۔

''تم اچھی طرح میرا مطلب سمجھتی ہو تم میرے بیٹے کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہو۔''

''اوہو' تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو اپنانا چاہتی ہوں۔ تم اسے مجھ سے دور رکھا کرو۔ اگر وہ بھاگ کر ہر جگہ میرے پاس پہنچے تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

''یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔''

''یہ تم اس سے پوچھو۔'' اور اب روزالیا کی آواز میں نفرت و حقارت کا اتنا زہر بھرا تھا کہ لاکچیرا بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔

''وہ ایک ایک گھنٹے بازار میں میرا انتظار کرتا ہے۔ تم اسے اپنے کلیجے سے چمٹا کر کیوں نہیں رکھتیں۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو' تم جھوٹ بولتی ہو' تم جھوٹ بولتی ہو تم خود جان جان کر اس کے سامنے آتی ہو۔''

''اگر مجھے کسی عاشق کی ضرورت ہوتی تو مجھے بغیر کہے بیسیوں مل جاتے...... کم از کم میں ایک قاتل عورت کے لڑکے کو اپنا عاشق بنانا نہیں

چاہوں گی۔''

ان آخری الفاظ نے لاچیرا کے ضبط کا آخری بند بھی توڑ دیا۔ اسے ہر چیز گردش کرتی معلوم ہوئی۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے بجنے لگے۔ وہ بھیڑیے کی طرح روزالیا پر جھپٹ پڑی اور اس کے بال نوچ ڈالے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ روزالیا چلائی اور اس نے اپنا بچاؤ کرنا چاہا لیکن فوراً ہی ایک راہ گیر نے انہیں چھڑا دیا۔

''اگر تم نے اب بھی کریٹو کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے ڈر گئی اگر ہمت ہے تو اسے مجھ سے دور رکھو۔ بیوقوف بڑھیا' کیا تم نہیں دیکھتیں کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔''

''اچھا اب آپ لوگ یہاں سے چلی جائیے۔'' راہ گیر نے کہا۔

''روزالیا اسے جواب مت دو۔''

لاچیرا غیظ وغضب کے عالم میں غرائی جیسے کوئی درندہ اپنا شکار نکل جانے پر غراتا ہے اور مکان کی طرف چل دی۔

رقص کے بعد روزالیا اور کریٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے۔ روزالیا ایک حسین خواب کی طرح کریٹو کے دل ودماغ پر چھا گئی اور اگلے روز وہ تمام دن اس کے سرخ ہونٹوں کے تصور میں کھویا رہا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کی دل فریب چمک کریٹو کے دل کی گہرائیوں میں فروزاں رہی اور وہ مسحور سا ہوگیا۔ بار بار اس کے دل میں خواہش اٹھتی کہ وہ روزالیا کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنالے۔ رات کی خاموش سہانی گھڑیوں میں وہ بے قرار ہوکر اس کے مکان کی طرف چل دیا اور پورچ میں ایک تاریک سے مقام پر کھڑا ہوکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ دوسری طرف لاچیرا کے کمرے کی بتی کسی مقبرے کے چراغ کی طرح جل رہی تھی۔

''روزالیا......'' اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ چونک کر پیچھے مڑی اور حیرت سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو۔'' اس نے کریٹو کی طرف جاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

''میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔''

''کیوں؟'' اس نے اپنے دل فریب انداز میں مسکرا کر کہا۔

''کیوں؟ کیوں کہ میں اپنے دل' اپنی روح کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔''

''شاید تمہیں علم نہیں کہ آج تمہاری ماں نے مجھے جان سے مار ڈالا ہوتا۔''

اور پھر اسپینی عورتوں کے روایتی انداز میں حاشیے لگا لگا کر اس نے تمام واقعہ سنایا لیکن وہ آخری فقرہ نظر انداز کرگئی جس کی چوٹ سے بے قابو ہوکر لاچیرا آپے سے باہر ہوگئی تھی۔

''اس کی بدمزاجی کی کوئی انتہا نہیں۔'' کریٹو نے سخت لہجے میں کہا۔

''آج میں اسے بتادوں گا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''یہ سن کر تو وہ خوشی سے باغ باغ ہوجائے گی؟'' روزالیا نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

''کل تم 'رجا' میں ضرور آنا۔''

''اچھا دیکھو۔'' اس نے جواب دیا۔

کریٹو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا کیونکہ روزالیا کا لہجہ غمازی کر رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ جب وہ

گھر واپس جا رہا تھا تو اس کا سینہ خوشی سے پھول رہا تھا اور وہ خلاف معمول سینہ تان کر بازار میں جا رہا تھا۔

اگلے دن جب وہ رات کو روزالیا کے مکان پر پہنچا تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سوائل کے دستور کے مطابق وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ جب اس نے روزالیا سے پوچھا کہ کیا وہ بھی اس سے اسی شدت سے محبت کرتی ہے تو اس نے جذبات میں ڈوبی ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ستاروں کی چھاؤں میں' وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محبت کی جلتی قندیلیں دیکھتے رہے اور پھر وہ ہر رات وہاں جانے لگا۔ اگلے اتوار کو اسے اپنی ماں سے ملنے جانا تھا لیکن وہ اس ڈر سے نہ گیا کہ لاچیرا کو اس کے روزانہ آنے کے متعلق معلوم نہ ہوگیا ہو۔ حرماں نصیب عورت تمام دن بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ اس کا دل درد سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر کر اس سے معافی مانگنے کو تیار تھی۔ کریٹو اس کا بیٹا تھا۔ اس دنیا میں اس کا واحد اثاثہ تھا اس کی امیدوں کا مرکز تھا' بار بار وہ دروازہ کھول کر دیکھتی لیکن اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں مایوس ہوکر لوٹ آتیں۔ ہر آہٹ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا لیکن اس کے دروازے پر کسی نے دستک نہ دی۔ غم زدہ بڑھیا تنہائی میں اکیلی پڑی گھڑیاں گنتی رہی اور پھر جب تمام دن گزر گیا اور وہ نہ آیا تو اس کے دل میں کریٹو کے لیے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ اس کی لاش اپنے قدموں میں تڑپتی ہوئی دیکھنا چاہتی تھی۔ جب اس نے یہ تصور کیا کہ اسے اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے ایک ہفتہ اور گزارنا پڑے گا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور وہ نہ آیا۔ اب وہ اس جدائی کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا پورا وجود مجسم کرب بن گیا۔ اس کو کریٹو سے اتنی شدید محبت تھی کہ دنیا کی کوئی محبوبہ اس شدت سے محبت نہیں کرسکتی اور اب بھی اگرچہ کریٹو نے اسے ٹھکرا دیا تھا لیکن اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ یہ اس کا قصور نہیں بلکہ صرف روزالیا کی چال بازیوں کا نتیجہ ہے اور جیسے جیسے اس نے اس بات کو سوچا اس کے دل میں غیظ وغضب کا طوفان بڑھتا گیا۔

آخرکار اگلے اتوار کو کریٹو ہمت کر کے اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا لیکن اس نے بہت دیر تک انتظار کرایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب لاچیرا کی محبت کا سوتا ہمیشہ کے لیے خشک ہوگیا ہے۔ جب کریٹو نے اسے پیار کرنا چاہا تو لاچیرا نے سے پرے دھکیل دیا۔

''تم پہلے کیوں نہیں آئے؟''

''تم نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا تھا' میں نے سوچا کہ تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔''

''کیا اس کی وجہ صرف یہی ہے؟ کیا کوئی اور وجہ نہیں ہے؟''

''میں بہت معروف تھا۔'' اس نے نیچی نظریں کیے ہوئے کہا۔

''معروف' تم جیسا سست اور بدمعاش شخص معروف رہے گا؟ مجھ سے ملنے کے لیے تم بہت معروف ہو لیکن اگر میری بجائے روزالیا سے ملنا ہوتا تو تمہاری معروفیات حارج نہیں ہوتی۔''

''تم نے اسے مارا کیوں تھا؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اسے مارا تھا؟ کیا تم اس سے ملے تھے؟'' لاچیرا غصے سے کھڑی ہوکر اس کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں وحشیانہ طور پر چمک رہی تھیں۔

’’میں نے اسے مارا کیوں کہ اس نے مجھے قاتل کہا تھا۔‘‘

’’تو پھر کیا ہوگیا؟‘‘

’’تو پھر کیا ہوگیا؟‘‘ وہ اتنے سے زور سے چلائی کہ ڈیوڑھی میں بھی اس کی آواز گونج اٹھی۔

’’اگر میں قاتل کہلائی تو صرف تمہاری وجہ سے...... ہاں میں نے پیسے سانتی کو قتل کیا تھا لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ تمہیں مار رہا تھا۔ تمہاری خاطر میں سات سال جیل کی کوٹھڑی میں سڑتی رہی۔ سات سال تک‘ بے وقوف! تمہارا خیال ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ ہر رات گھنٹوں ڈیوڑھی میں کسی کے ساتھ رہتی ہے؟‘‘

’’مجھے معلوم ہے۔‘‘ کریٹو کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

لا کچیرا کو لگا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے بے ساختہ چونک کر دیکھا اور دیر تک کریٹو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہی اور پھر وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ غصے اور کرب کی شدت سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے‘ اپنا دل پکڑ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے وہ کسی لمحہ پھٹ جائے گا۔

’’اس کا مطلب ہے کہ تم ہر روز ’رجا‘ میں آتے رہے لیکن تم کبھی ایک منٹ کے لیے بھی میرے پاس نہیں آئے۔ افسوس اے شقی القلب! میں نے دنیا کی ہر چیز تجھ پر نثار کر دی؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں پیسے سانتی سے محبت کرتی تھی۔ میں نے اس کی لاتیں صرف اس لیے کھائیں کہ تجھے بھوکا نہ مرنے دوں‘ لیکن جب اس نے تجھے مارا تو میں نے اسے قتل کر دیا۔ اگر تجھ سے ملنے کی امید میرے دل کو بے چین نہ کیے ہوتی تو میں جیل خانے کی تکلیفیں اٹھانے کی بجائے زہر کھا لیتی۔‘‘

’’اچھا ماں ذرا عقل سے کام لو‘ میں اب بیس سال کا ہو گیا ہوں‘ تم مجھ سے کیا امید رکھتی ہو؟ اگر روزالیا نہ سہی‘ تو کوئی اور سہی۔‘‘

’’ذلیل کمینے۔‘‘ وہ بے ساختہ چلائی۔

’’میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں‘ باہر نکل جا۔‘‘

’’مطمئن رہو‘ میں بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔‘‘

وہ اطمینان سے ڈیوڑھی سے گزرا اور آہنی دروازہ زور سے بند کر کے باہر نکل گیا۔ لا کچیرا اپنے چھوٹے سے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھرتی رہی۔ گھڑیاں آہستہ آہستہ رینگتی رہیں۔ کافی دیر وہ کھڑکی میں کھڑی رہی اور اس خوفناک طریقے سے ٹکٹکی باندھے باہر دیکھتی رہی جیسے کوئی درندہ جست لگانے والا ہو۔ وہ ساکت و صامت کھڑی تھی اور دل میں ابلتے جوش کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

’رجا‘ میں دستک کی صدا بلند ہوئی جیسے کوئی شخص باہر کھڑا ہو۔ وہ ہانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی خوفناک آنکھیں حلقوں میں اوپر چڑھی تھیں...... لیکن یہ تو معمار تھا۔

وہ پھر انتظار کرنے لگی اور پھر روزالیا کی ماں سیڑھیوں پر چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ لا کچیرا نے اپنے گلے کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا تا کہ وہ سانس کے بے پناہ دباؤ کم کر سکے۔ کچھ وقفے کے بعد اس کے تمام جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

آخر کار...... دروازے پر دستک ہوئی اور ایک آواز آئی۔

’’کون؟‘‘

’’میں‘‘ لا کچیرا نے روزالیا کی آواز کو پہچان لیا۔ اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ دروازہ اوپر سے کھولا گیا اور روزالیا لچکیلی چال میں آہستہ آہستہ ڈیوڑھی پار کر رہی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت میں زندگی کی تڑپ اور مسرت نمایاں تھی۔ اس نے ڈیوڑھی پار کر لی اور زینے پر قدم رکھنے ہی والی تھی کہ لا کچیرا تیزی سے آگے آئی اور اپنے استخوانی ہاتھوں سے روزالیا کا بازو اتنی سختی سے پکڑ لیا کہ وہ جنبش نہ کر سکی۔

’’تم کیا چاہتی ہو؟‘‘ روزالیا نے کہا۔

’’مجھے جانے دو۔‘‘

’’تم میرے لڑکے سے روز کیوں ملتی ہو؟‘‘

’’مجھے جانے دو ورنہ میں چلانے لگوں گی۔‘‘

’’کیا یہ صحیح ہے کہ تم ہر رات اسے ’رجا‘ میں ملتی ہو؟‘‘

’’ای! انتونیو! دوڑو۔‘‘ روزالیا تیز آواز میں چلائی۔

’’مجھے جواب دو۔‘‘

’’اچھا! اگر تم یہی باتیں سننا چاہتی ہو تو سنو۔ وہ مجھ سے شادی کرنے والا ہے۔ وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور میں...... میں بھی اپنے دل کی گہرائیوں سے اس سے محبت کرتی ہوں۔‘‘ وہ لا کچیرا کی طرف مڑی اور اس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

’’کیا تم سمجھتی ہو کہ اپنے ان منحوس ہاتھوں سے تم ہماری خوشیوں کا گلا گھونٹ سکتی ہو؟ کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ تم سے خوف زدہ ہے؟ اس نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ تم کبھی جیل سے رہا نہ ہوتیں۔‘‘

’’اس نے تم سے یہ کہا ہے؟‘‘ لا کچیرا حیرت کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔ روزالیا نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''ہاں اس نے مجھ سے یہ کہا ہے اور اس نے تو مجھ سے اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے پیپے سانتی کو قتل کیا تھا اور تم سات سال تک جیل خانہ میں بند رہی تھیں اور وہ چاہتا ہے کہ کاش تم مر جاتیں۔''

روزالیا نے یہ الفاظ نفرت کے عالم میں چبا چبا کر کہے۔

لاکچیرا اس طرح پیچھے ہٹ گئی جیسے کسی نے اس پر شدید ضربیں لگائی ہوں۔اس کی یہ حالت دیکھ کر روزالیا زور سے ہنسی۔

''اور تمہیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ میں نے ایک قاتل عورت کے لڑکے کی بیوی بننے سے انکار نہیں کیا۔''

یہ کہہ کر اس نے لاکچیرا کو پرے دھکیل دیا اور سیڑھیوں کی طرف لپکی' لیکن اس حرکت نے لاکچیرا کے مفلوج جسم میں جان ڈال دی۔تیر کی طرح چبھتے ہوئے طعنوں نے اسے زندگی کی عظیم ترین اذیت پہنچائی تھی۔غصے میں اس نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور روزالیا پر جھپٹ کر اسے شانوں سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا۔روزالیا پیچھے مڑی اور لاکچیرا کے منہ پر تھپڑ مارا۔لاکچیرا نے قمیض کے نیچے سے ایک چاقو نکالا اور غلیظ گالی بکتے ہوئے پورا چاقو روزالیا کی گردن میں پیوست کر دیا۔

''ماں......اس نے مجھے مار ڈالا۔''

وہ زینے سے نیچے گر گئی اور گٹھڑی سی بنی پتھروں پر جا پڑی۔جوانی کے ابلتے ہوئے گرم خون نے زمین پر ایک چھوٹا سا سرخ گڑھا بنا دیا۔دل دوز چیخ رات کی تاریکی اور خاموشی میں ہر طرف گونج اٹھی اور چھ سات دروازے ایک ساتھ کھل گئے۔لوگ لاکچیرا کو پکڑنے دوڑے لیکن وہ دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑی تھی۔اس کے چہرے پر غیض وغضب کے اتنے خوف ناک تاثرات چھا گئے تھے کہ کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔اسی اثناء میں روزالیا کی ماں بالکونی سے چیخیں مارتی دوڑی اور ایک لمحے کے لیے توجہ دوسری طرف مرکوز ہو گئی۔لاکچیرا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ مقفل کر دیا۔

آناً فاناً پورا دالان لوگوں سے بھر گیا۔روزالیا کی ماں بین کرتی اپنی بیٹی سے لپٹ گئی۔حاضرین میں سے کوئی ڈاکٹر کو بلانے بھاگا تو کسی نے پولیس کو خبر دی۔لوگ سڑک سے بھاگ بھاگ کر دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔تھوڑی ہی دیر میں ادھر ڈاکٹر اپنا سیاہ بیگ لیے موقع واردات پر پہنچ گیا۔ادھر پولیس آن پہنچی۔چھ سات آدمیوں نے ایک ساتھ سانحے کے متعلق تفصیلات بتانی شروع کر دیں۔انہوں نے پولیس کو لاکچیرا کے کمرے پر پہنچا دیا اور دروازے کو توڑ دیا گیا۔

کچھ دیر کی کشمکش کے بعد پولیس لاکچیرا کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر باہر لے آئی۔لوگ جوش کے عالم میں آگے بڑھے لیکن پولیس نے ملزمہ کے گرد گھیرا ڈال دیا اور سنگینوں سے لوگوں کو پرے ہٹا دیا۔عوام دور سے اسے گالیاں دیتے اور مکے دکھاتے رہے لیکن لاکچیرا کی آنکھیں ہر چیز سے بے نیاز فتح کے نشے سے چمک رہی تھیں۔پولیس اسے ڈیوڑھی سے نکال کر باہر لے آئی جہاں ڈاکٹر ایک سرد لاش کے پاس کھڑا تھا۔

''کیا یہ مر گئی ہے؟''لاکچیرا نے پوچھا۔

''ہاں۔''ڈاکٹر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''یا خدا! تیرا شکر ہے۔''لاکچیرا نے کہا۔

☆☆......☆☆